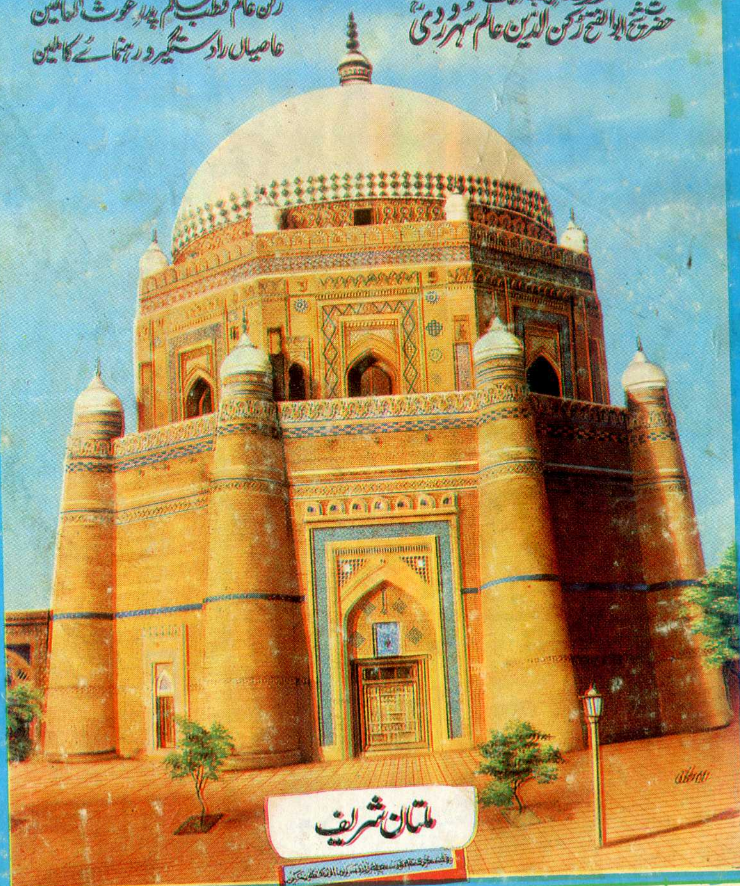
اُمرا بر درِ فقرا

الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ

روضہ مبارک
حضرت شیخ ابوالفتح رکن الدین عالم سہروردیؒ

رکن عالم قطب عالم پیر غوث العالمین
عاصیاں را دستگیر و رہنمائے کاملین



بِسمِ اللّٰہِ الرَّحمٰنِ الرَّحِیمِ

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں



کاوش: جناب محمد انور قمر شرقپوری

ترتیب:

محمد یٰسین قصوری نقشبندی

ناشر

ادارہ علم و ادب ۞ والٹن روڈ، لاہور

نام کتاب ____ اُمراء (بر) درِ فقراء

کاوش ____ جناب محمد انور قمر شرقپوری

ترتیب ____ محمد یٰسین قصوری نقشبندی

اشاعت (اول) ____ مارچ ۱۹۹۸ء

تعداد ____ گیارہ سو

ناشر ____ ادارہ علم و ادب، والٹن روڈ، لاہور

کمپوزنگ : المالک کمپوزر سرور مارکیٹ اردو بازار لاہور

قیمت ____ 90/-

رابطہ بذریعہ ڈاک ____ مکان نمبر E31/TORI میجر طارق شریف شہید سٹریٹ
النور ٹاؤن ورکشاپ سٹاپ، والٹن روڈ لاہور کینٹ

فون: 5813070

کتاب ملنے کے پتے

۱۔ مکتبہ شیر ربانی، کاشانۂ شیر ربانی نزد داتا دربار، لاہور

۲۔ ضیاء القرآن پبلیکیشنز، گنج بخش روڈ، لاہور

۳۔ کرم پبلی کیشنز، سرور مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

۴۔ مکتبہ قادریہ، داتا دربار روڈ۔ لاہور

۵۔ مکتبہ فاروقیہ رضویہ، گوجر پورہ، باغبان پورہ، لاہور

۶۔ مکتبہ اشرفیہ، مریدکے، ضلع شیخوپورہ

۷۔ مکتبہ نوریہ، قصور

فہرست

الانتساب

بانی تحریک یوم مجدد الف ثانی فخر المشائخ

حضرت

صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرقپوری

سجادہ نشین

آستانہ عالیہ شیر ربانی رحمۃ اللہ علیہ

کے نام

گر قبول افتد زہے عز و شرف

(محمد یٰسین قصوری نقشبندی)

نقش اول

پاکستان بھر کے آستانوں کا جائزہ اگر اس اعتبار سے لیا جائے کہ تبلیغ بذریعہ اشاعت زیادہ کہاں ہو رہی ہے تو آستانہ عالیہ شرق پور شریف کا نام سرفہرست ہوگا۔ اور اس نشرواشاعت کے کام میں حضرت قبلہ فخر المشائخ صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرق پوری، و سجادہ نشین آستانہ عالیہ اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپور شریف، کی شخصیت زیادہ فعال دکھائی دے گی۔ علاوہ دوسرے اشاعتی کام کے آپ جو ماہانہ خوبصورت مجلّہ "نور اسلام" باقاعدگی سے نکال رہے ہیں، اسے قریباً قریباً نصف صدی تک نہایت مستقل مزاجی کے ساتھ جاری رکھنا ان کے اس جذبہ اور لگاؤ کا اظہار کرتا ہے، جو آپ کی دینی اور اسلامی ادب کے ساتھ ہے۔ اس رسالہ کی کارگزاری آج تک کم و بیش چالیس ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔

دینی صحافت کے آسمان پر بڑے بڑے رسالے تابناک ستارے بن کر چمکے مگر جلدی معدوم ہوگئے۔ نور اسلام اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ گزشتہ بیالیس سال سے اب تک اپنی نوری کرنیں بکھیر رہا ہے۔

1990ء میں نور اسلام نے ہمیں ایک نیا سلسلہ مضامین دیا یعنی "امراء بردر فقراء"۔ قارئین نور اسلام نے اس سلسلہ کو بے حد پسند کیا۔ یہاں تک کہ بے شمار خطوط نور اسلام کو موصول ہوئے کہ ان مضامین کو کتابی شکل میں یکجا کیا جائے۔

رسالہ نور اسلام کا یہ سلسلہ مضامین میری نظر میں برابر رہا اور گاہے گاہے یہ خواہش چٹکیاں لیتی رہی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہمت دے تو میں ان کو کتابی شکل میں پیش کرسکوں۔

جب میں اپنی کتاب "چشمہ فیض شیر ربانی" ترتیب دے رہا تھا اور وہ آخری مراحل میں تھی۔ تو مجھے "امراء بردر فقراء" کے عنوان سے لکھنے والے مضمون نگار جناب علامہ محمد انور قمر صاحب شرقپوری سے ملنے کا اتفاق ہوا انہیں مل کر جی خوش ہوگیا۔ اور میں حیران بھی ہوا کہ اتنا سادہ انسان اس قدر جاندار تحریر کا مالک ہے اور میں نے محسوس کیا کہ ان کے حال پر ان کے مرشد خاص حضرت صاحبزادہ میاں جمیل احمد صاحب شرقپوری کی خصوصی نظر ہے کہ وہ اپنے قلم کو بزرگان دین کی محبت میں استعمال کر رہے ہیں۔

یہ میری پہلی ملاقات تھی جو دسمبر 1996 میں ان سے ہوئی اس پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے مجھے آنکھوں پر بٹھالیا اور دل میں جگہ دی، اس کے بعد ان کے ہاں آنے جانے میں ایک تسلسل قائم ہوگیا۔ ایک دن دوران گفتگو میں نے ان سے عرض کیا کہ آپ کیوں نہیں اپنے مضامین کو کتابی شکل دے دیتے ؟

کہنے لگے "کرم پبلیکیشنز سرور مارکیٹ لاہور" والے اس کتاب کی اشاعت کا کام کر رہے ہیں بلکہ خاصہ کام وہ کر بھی چکے ہیں۔ یعنی کتابت اور پروف ریڈنگ کے مرحلہ سے کتاب نکل چکی ہے۔ چونکہ حضرت علامہ عبدالحق صاحب ظفر چشتی (مالک کرم پبلیکیشنز لاہور) بچوں کی شادیاں کرنے کے باعث مالی اعتبار سے کچھ متاثر ہو چکے ہیں لہٰذا کتاب کا بقیہ کام التواء میں پڑا ہوا ہے۔

میں نے عرض کیا اگر آپ مجھے اجازت دیدیں تو اس کتاب کو میں چھپوا دوں --- کہنے لگے یہ مناسب نہیں ہے۔ چونکہ انہوں نے (کرم پبلیکیشنز لاہور) خود بڑی محبت سے شائع کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا

اگر اب کوئی کاروباری نشیب آگیا ہے تو ان سے یہ خواہش چھین لینا گھٹیا پن کے زمرے میں آئے گا۔

پھر میں نے عرض کیا، اگر آپ ان کے منتخبہ مضامین کے علاوہ بطور حصہ دوم چھاپنے کی اجازت دیدیں تو میرے لئے یہ سعادت ہوگی۔

آپ نے پھر انکار کر دیا کہنے لگے یہ بھی انہی کی مرضی پر منحصر ہے اور پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حصہ اول کے چھپنے سے پہلے حصہ دوم چھپ جائے میرے ان (عبدالحق ظفر چشتی صاحب) سے اچھے مراسم ہیں میں ان میں کوئی کمی نہیں دیکھنا چاہتا۔

آخر میں نے عرض کیا مجھے کچھ چھاپنے کی اجازت دیں۔ کہنے لگے اگر تم ضرور اس بات میں مصر ہو تو حضرت صاحب (صاحبزادہ میاں جمیل احمد شرقپوری) کی خواہش کے مطابق ان مضامین کو کتابی شکل میں لے آؤ جو امراء بردر فقراء کے تحت آستانہ عالیہ شرق پور شریف سے متعلق ہیں۔

چنانچہ ۱۹۲ صفحات کی کتاب "ضیاء الفقراء" کے نام سے دینی حلقوں میں متعارف کرانے کا موقع مجھے نصیب ہوا۔ ضیاء الفقراء کو کرم پبلیکیشنز والوں نے دیکھا تو خوش ہوئے فرمانے لگے آپ کی ہمت قابل ستائش ہے اور پھر خوشی خوشی مجھے اجازت دیدی کہ امراء بردر فقراء (کتاب) کی طباعت اور اشاعت کا اہتمام بھی میں سرانجام دوں۔

3 دسمبر 1997ء کو حضرت قبلہ ثانی صاحب کے عرس مبارک کے موقع پر (جو حضرت صاحبزادہ میاں محمد ابوبکر صاحب سجادہ نشین آستانہ عالیہ شرقپور شریف کے زیر اہتمام منعقد ہوا) میں نے حضرت علامہ محمد انور قمر صاحب شرقپوری کو یہ خبر سنانے میں خوشی محسوس کی کہ امراء بردر فقراء کی طباعت و

اشاعت کی ذمہ داری حضرت علامہ عبدالحق ظفر چشتی صاحب نے مجھے سونپ دی ہے۔ اس خبر نے آپ کو بے حد مسرور کر دیا۔ کہنے لگے اللہ تعالیٰ آپ کے ارادوں میں استقامت فرمائے۔

آج میرے لئے یہ ایک بڑی سعادت کا مقام ہے کہ امراء بردر فقراء کو کتابی شکل میں قارئین کی خواہش اور تمنا کے احترام میں پیش کر رہا ہوں کتاب میں منتخبہ مضامین کو رسالہ نور اسلام کی تحریر کے مطابق ہی پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ کہیں بھی کسی قسم کی تبدیلی یا ردو بدل نہیں کیا گیا۔ اگر کہیں کوئی سہو دکھائی دے تو ہمیں ضرور لکھئے تاکہ دوسرا ایڈیشن زیادہ صحت مند بن سکے۔

حضرت صاحبزادہ میاں جمیل احمد صاحب شرقپوری کا میں بے حد ممنون احسان ہوں کہ آپ نے میری سعی کو پسند فرمایا ہے۔

طالب دعا
محمد یٰسین قصوری نقشبندی
ادارہ علم و ادب، والٹن روڈ، لاہور

حرفِ آغاز

عام طور پر ہم امیر اسے کہتے ہیں جس کے پاس دنیا کا مال و زر اور دولت زیادہ ہو اور غریب اسے جس کے پاس مال و دولت اس کی ضروریات سے کم ہو، یا بالکل نہ ہو لیکن غور کریں تو کوئی شخص علم کی دولت سے مالا مال ہو سکتا ہے، کسی کے پاس طاقت و قوت کے وافر خزانے ہیں، کوئی حسن اور خوبصورتی کا شہنشاہ بنا ہوا ہے اور کوئی روحانی خزانوں کا مالک ہے۔

اس طرح اس بات کا فیصلہ کرنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے کہ حقیقت میں امیر کون ہے؟ اگر ہم کلیاتی طور پر امیر اور غریب کی تعریف کریں گے تو کہہ سکتے ہیں کہ جن مرئی اور غیر مرئی قوتوں پر کسی کا امر چلتا ہے وہ انہیں قوتوں کے اعتبار سے امیر ہے۔ اور جو ایسی قوتوں سے دور ہے وہ انہیں قوتوں کے اعتبار سے غریب ہے۔ اس امارت اور غربت میں اللہ تعالیٰ نے ایک راز پنہاں رکھا ہے کہ ہر شخص ایک دوسرے کے کام آئے۔ اس راز کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو شخص بھی جس معاملے میں دوسرے کا محتاج ہو گا وہی اپنی ذات کے اعتبار سے غریب ہے۔ اور جس نے اس کی احتیاج کو پورا کیا ہے وہ اپنی ذات میں امیر ہے۔

اللہ والے دنیا کی دولت سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ اور روحانیت کے

جہان کے شہنشاہ ہوتے ہیں۔ قدرت نے بے پناہ قوتیں ان کے تصرف میں دے رکھی ہیں، اس لئے دنیا والے ان کے دروازوں پر ایک ہجوم بے کراں کی مانند حاضر رہتے ہیں۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ان اللہ والوں کے دروازوں پر بڑے بڑے امیر لوگ اور وقت کے شہنشاہ بھی سر کو جھکائے ہوئے آئے ہیں۔

یہ امیر لوگ ان فقراء کی چوکھٹ پر کیسے اور کس انداز سے حاضر ہوتے ہیں؟ دنیا والوں کے لئے ایک عجیب سماں پیش کرتے ہیں۔ جس سے ہمارے بزرگان دین کی شان عظمت و رفعت نمایاں ہوتی ہے۔ ان واقعات سے بزرگان دین کے تصرفات کے بعض پہلو بڑے واضح ہو کے سامنے آتے ہیں۔

یہ واقعات کتابوں میں محفوظ ہیں آپ ان سے واقف ہیں۔ ان واقعات کو آپ نے بارہا پڑھا ہے مگر ہم نے ان واقعات کو صرف ایک نیا انداز فکر دیا ہے، کرامتیں وہی ہیں جو ان بزرگوں کی زندگیوں سے وابستہ ہیں مگر ہم نے انہیں ایک نئے اسلوب سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ عقیدت و محبت کی مئے وہی ہے مگر ساقی کا انداز پیش کش جداگانہ ہے۔

ایڈیٹر نور اسلام شرقپور شریف سے جب میں نے اس انداز فکر کی بات کی تو انہوں نے پسند فرمایا۔ کہا اس انداز کے چار مضامین لکھو گے تب ان کی اشاعت کا آغاز ہو گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پہلے مضمون کا چھپنا تھا کہ قارئین کو پسند آگیا۔ ادارہ نور اسلام کو تعریفی خطوط آنے لگے کچھ خطوط میرے نام بھی آئے، جو اس بات کے غماز تھے کہ یہ سلسلہ خاصا مقبول ہونے والا ہے۔

حضور قبلہ ثانی صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے سالانہ ختم مبارک پر آنے

والے زائرین و متوسلین سے تبادلہ خیال ہوا تو بھی میرے حوصلے کو استحکام ملا۔ بلکہ ان حضرات نے انکشاف کیا کہ ان کے اکثر احباب ان سے رسالہ نور اسلام مانگ کر اس مضمون کو خاص کر پڑھتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا کہ بعض غیر مقلدین نوجوانوں نے ان مضامین کو بڑے اشتیاق سے پڑھا اور اس سلسلے کو بے حد پسند کیا ہے۔

نور اسلام کی بعض اشاعتوں میں قارئین کی رائے معلوم کرنے کے لئے یہ اعلان بھی کیا گیا کہ اگر "امراء بر در فقراء" کے عنوان سے چھپنے والے مضامین کو یکجا کر کے کتابی شکل دے دی جائے تو کیسی رہے گی۔؟

اس کے جواب میں جو خطوط اور آراء موصول ہوئیں انہوں نے ہمارے حوصلے میں ایک نئی امنگ پیدا کی۔ اور ہم نے مصمم ارادہ کر لیا کہ انہیں کتابی شکل میں پیش کیا جائے۔ اور پھر مزید یہ کہ نئی دہلی (انڈیا) سے شائع ہونے والا کثیر الاشاعت ماہنامہ "ھدیٰ اسلامی ڈائجسٹ" نے بھی ان مضامین کو چھاپنا شروع کر دیا۔ نہ جانے وہ اب تک کتنے مضامین چھاپ چکے ہیں یا چھاپتے رہیں گے۔ ہمیں فی الحال چھ مضامین کی مسلسل اشاعت کا پتہ چل سکا ہے۔ اور اب تو اسے مستقل عنوانات میں شامل کر لیا گیا ہے۔

"ادارہ علم و ادب، والٹن لاہور" کے مہتمم اعلیٰ جناب حضرت علامہ محمد لیسین قصوری نقشبندی صاحب جن کے ہاتھوں میں اللہ تعالیٰ نے ایک محتاط قلم دے رکھا ہے۔ اور وہ اس کی تقدیس کا ہمہ وقت خیال رکھتے ہیں۔ انہیں بزرگان دین سے وابستگی بھی ہے اور عقیدت و محبت کی دولت سے مالا مال بھی ہیں، وہ اپنے مطالعہ کے کمرہ میں ان مضامین کو برابر پڑھتے رہے۔ اور جب مجھ سے ملاقات ہوتی تو اس سلسلہ مضامین پر اپنی پسند کی مثبت رائے کا گلدستہ بھی

پیش کرتے اور یہ خواہش ان کے لب شیریں پر محو رقص رہی ہے کہ اگر ادارہ نور اسلام کی طرف سے ان مضامین کو کتابی صورت میں پیش کرنے کی اجازت مل جائے تو یہ ادارہ علم وادب کی سعادت ہو گی۔

یہ سعادت ادارہ علم وادب لاہور کے مقدر میں تھی اسے مل گئی۔ جو "امراء بر درِ فقراء" کے **مضامین** اشاعت کے معیار کے بہترین تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے پیش کر رہا ہے۔

ہم نے اس سلسلہ مضامین کو اس جذبے کے ساتھ پیش کرنے کا عزم کیا ہے۔

۱۔ مردان کاملین اللہ کے دوست ہوتے ہیں۔ اللہ کے دوستوں کا ذکر ایمان میں تازگی اور پختگی پیدا کرتا ہے۔ عشق الٰہی کے سمندر میں ڈوب جانے کی راہ دکھاتا ہے۔

حضرت یحییٰ عمار رحمتہ اللہ علیہ کا انتقال ہوا تو بعض لوگوں نے انہیں خواب میں دیکھا کہ وہ ایک بہار آفرین چمن میں سیر فرما رہے ہیں دیکھنے والوں نے پوچھا کہ یحیٰ! یہ مقام آپ کو کیسے نصیب ہوا؟ آپ نے فرمایا جب انہیں اللہ کے حضور پیش کیا گیا تو رب عالم نے فرمایا یحییٰ! میں تمہاری بڑی سخت جواب دہی کرتا مگر جب تم ایک محفل میں تقریر کرتے ہوئے اسرار و رموز پر سے پردے اٹھا رہے تھے، تو میرا ایک دوست اس محفل میں بیٹھا بڑا خوش ہو رہا تھا، تو تو نے میرے دوست کو خوش کیا میں نے اس کے صلہ میں تیری بخشش کر دی۔

۲۔ ایسے ہی حضرت بو علی وناق سے پوچھا گیا کہ اگر کوئی شخص اولیاء کرام کے حالات سننے کے بعد ان پر عمل پیرا نہ ہو تو کیا صرف حالات سن لینے سے اس

کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ آپ نے فرمایا۔

اس میں بھی دو فائدے ہیں۔ اول تو کسی بندے میں اگر حقیقی طلب ہو گی تو اس کی طلب و ہمت میں مزید اضافہ ہو گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ مغرور بندے کے غرور میں کمی پیدا ہو گی۔ اور اگر وہ بد باطن نہیں تو بذات خود اولیاء کرام کے حالات و واقعات کا مطالعہ کرے گا۔ پھر یہ شخص مردان خدا کی طرح خود کو بنانے کی کوشش کرے گا۔

۳۔ ایک بار حضرت جنید بغدادی رحمتہ اللہ علیہ سے پوچھا گیا کہ مریدین کو مرشدین کے ذکر سے کیا فائدہ حاصل ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا مردان خدا کا ذکر خدا کے لشکروں میں سے ایک لشکر ہے، جس کے ذریعہ سے مریدین کو اعانت اور شکستہ قلوب کو استحکام حاصل ہوتا ہے۔ جیسا کہ باری تعالیٰ نے فرمایا۔

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ہم گزشتہ رسولوں کے واقعات اس لئے آپ کے سامنے بیان کرتے ہیں کہ آپ کے قلب کو سکون حاصل ہو اور آپ کا قلب مضبوط ہو جائے؟

گویا کہ ایک رسول کا ذکر دوسرے رسول کے قلب کو سکون اور استحکام بخشتا ہے۔ اسی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بزرگان دین کے تذکرے، پڑھنے والوں کے دلوں کو سکون کی دولت بخشتے ہیں۔

۴۔ اللہ کے نیک بندے زندگی بھر رب العالمین کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے تذکرے لوگوں کی زبان پر جاری رکھتا ہے۔

۵۔ چونکہ اولیاء کرام کا کلام قرآن و حدیث کے بعد تمام لوگوں کے کلام سے زیادہ افضل اور عظمت والا ہوتا ہے یہ کلام ظاہری تصنع سے پاک ہوتا ہے۔ اس لئے یہ کلام دل سے دنیا کی محبت نکال دیتا ہے ان کے کلام کی برکت سے

خدا کی دوستی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے،بزرگان دین کی باتیں سننے سے آخرت کا سامان جمع کرنے کا عزم پیدا ہوتا ہے۔

٦۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ جب آپ کسی کے بارے میں غلط بات کریں گے تو وہ شخص بذات خود بھی اور اس کے تعلق والے بھی درپے آزار ہو جائیں گے گویا کہ غلط بات یہ تاثر دکھائے گی تو یہ کس طرح ناممکن ہے کہ اچھی اور درست بات کرنے سے وہ لوگ اثر قبول نہ کریں گے۔

٧۔ حضرت امام ابویوسف رحمتہ اللہ علیہ سے ایک محفل میں سوال کیا گیا کہ جس وقت دنیا میں اولیاء کرام کا وجود نہ رہے گا تو اس وقت ہمیں کیا کرنا چاہئے تاکہ ہم لغو اور خرافات سے دور رہیں ، آپ نے فرمایا کہ اولیاء کرام کے حالات کا کم از کم ایک جزو ضرور پڑھ لیا کرو۔

یہی بزرگان دین فقیر اور اہل فقر اور روحانی دنیا کے شہنشاہ ہیں، جو اظہار انکسار کے ساتھ اپنے آپ کو فقیر کہتے ہیں۔ فقیر اہل فقر کو کہتے ہیں فقر کے لغوی معنی افلاس اور تنگدستی کے ہیں مگر باطنی اور روحانی دنیا میں فقیر دونوں جہانوں کی بادشاہی کا نام ہے۔

حضرت داتا گنج بخش علی ہجویری رحمتہ اللہ علیہ اپنی معروف زمانہ کتاب کشف المحجوب میں فرماتے ہیں کہ فقیر وہ ہے کہ نہ اسباب دنیوی کی موجودگی سے غنی ہو اور نہ اسباب کے نہ ہونے سے محتاج ہو اور پھر دنیوی اسباب کا ہونا نہ ہونا اس کے فقر میں یکساں ہو۔

اور حقیقت بھی یہ ہے کہ فقیر کے نزدیک دونوں جہاں مچھر کے پر کے برابر بھی وزن نہیں رکھتے۔ فقیر کے دل میں دنیا کی کوئی چیز راحت نہیں لاتی۔ بلکہ اللہ کی یاد، اللہ کا ذکر اور اللہ کا تصور بے پناہ راحت پیدا کرتا ہے۔ اور

یہ بھی یاد رہے کہ فقیر صاحب امر ہوتا ہے کہ اگر وہ کسی چیز کو کہے کہ ہو جا تو پس وہ ہو جائے۔

حضور غوث پاک رحمتہ اللہ علیہ سے فقیر کے معنے پوچھے گئے تو آپ نے فرمایا فقیر میں چار حرف ہیں۔ ف۔ ق۔ ی۔ ر۔جن کے اپنے اپنے اثرات ہیں۔

ف: سے فنا فی اللہ ہو کر اپنی ذات و صفات سے بیکار ہو جانا۔

ق: اپنے دل کو یاد الہٰی سے قوت دینا۔

ی: سے مراد سرجو یعنی امید رحمت الہٰی کی اور اس کا خوف اور قیوم یعنی قائم رہنا تقویٰ پر جیسا کہ حق ہے۔

ر: سے رقت قلب اور اس کی صفائی ہے اور رجوع الی اللہ ہے۔ اپنی خواہشات سے منہ موڑ کر فقیر کو ذکر و فکر سے آراستہ کرنا چاہئے۔

جھگڑے ، تو عمدہ طریق سے اور حق معلوم ہو جائے تو فوراً" حق کی طرف رجوع کرے۔ جھگڑا چھوڑ دے راستی اور راست بازی کو اپنا شیوہ بنائے ، سینہ سب سے کشادہ رکھے ، اپنے نفس کو سب سے حقیر جانے،غافل کو نصیحت کرے اور جاہل کو علم سکھائے۔ کسی سے ایذا پہنچے تو بھی ایذا نہ پہنچائے۔

فضول باتوں میں نہ پڑے اور نہ ان پر غور و فکر کرے ، ممنوعات سے بچے اور مشتبہات میں توقف کرے، غریب کا مددگار رہے،چہرے پر خوشی کا اظہار کرے اور دل میں فکر و غم رکھے۔ اس کی یاد میں غمگین اور اپنے فقر میں خوش رہے۔ افشاء راز نہ کرے ، کسی کی پردہ دری کر کے اس کی ہتک نہ کرے۔ مشاہدے میں حلاوت پائے، ہر ایک کو فائدہ پہنچائے، اخلاق ، حلم

صبر، شکر والا بنے، کوئی جہالت سے پیش آئے تو اس کے ساتھ علم و بردباری سے کام لے۔ اگر اسے کوئی اذیت پہنچائے تو اس پر صبر کرے مگر ناحق پر خاموش ہو کر حق کا خون بھی نہ کرے۔ کسی سے بغض نہ رکھے، بڑوں کی تعظیم اور چھوٹوں پر شفقت کرے، امانت کو محفوظ رکھے اور کبھی اس میں خیانت نہ کرے، کسی کو برا نہ کہے، اور نہ کسی کی غیبت کرے۔ کم سخن ہو، نمازیں زیادہ پڑھے روزے بہت رکھے، غرباء کو اپنی مجلس میں جگہ دے، جہاں تک ہو سکے مساکین کو کھانا کھلائے۔ ہمسایوں کو راحت پہنچائے اور ان کو اپنی جانب سے کوئی اذیت نہ پہنچنے دے، کسی کو عیب نہ لگائے اور نہ کسی کو برا کہے اور نہ کسی کی مذمت کرے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **اَلْفَقْرُ فَخْرِی وَ الْفَقْرُ مِنِّی** یعنی فقر میرا فخر ہے اور فقر مجھ سے ہے۔ امراء بر در فقراء میں آپ ایسے ہی بزرگوں کی نمایاں باتیں دیکھ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ناشر کو خیر کی دولت سے سرفراز کرے۔

محمد انور قمر شرقپوری
شرقپور شریف، شیخوپورہ

احترام علم

★ نگاہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حضرت امام مالک کا مقام

★ حضرت امام مالک کے نزدیک احترام مدینہ۔

★ علم ایک بیش قیمت شئے ہے شائقین کو خود اس کے پاس آنا چاہئے۔

★ جابر حکام کا فرض ہے کہ وہ علم کی سرپرستی کریں۔

★ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق کہنے کی سچی تصویر۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث (جسے حضرت امام ترمذی نے بھی نقل کیا ہے) یوں لوگوں تک پہنچی کہ "ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ لوگ دور دور سفر کریں گے لیکن عالم مدینہ سے بڑھ کر انہیں کہیں عالم میسر نہیں آئے گا۔"

اس عالم مدینہ کی جستجو میں جب لوگوں نے مدینہ کی طرف رجوع کیا تو مدینہ پاک میں ایک خواب کا تذکرہ یوں سنا گیا کہ ایک رات آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد لوگ جمع ہیں اور کچھ مانگ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اس منبر کے نیچے بہت بڑا خزانہ دفن ہے اور میں نے اس کی تقسیم کا کام مالک کے سپرد کر دیا ہے۔ اور پھر لوگوں کا یقین پختہ ہو گیا کہ موجودہ دور کے عالم مدینہ سے مراد حضرت امام مالک رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔

عالم مدینہ کی جستجو کرنے والوں نے کئی بار دیکھا کہ ایک بوڑھا پیدل چل رہا ہے، کسی نے سواری پیش کی تو اس بوڑھے نے کہا یہ کیسے ہو سکتا ہے، جس شہر کی گلیوں کی خاک نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کو چوما ہو مالک ان نقوش پا کو اپنی سواری سے روندے!

اس بوڑھے کی پوری زندگی لوگوں کی نگاہ کے سامنے تھی کہ وہ رفع حاجت کے لئے تب سے اب تک ہمیشہ مدینہ سے باہر گیا ہے، شہر میں رفع حاجت بھی نہیں کی۔

حضرت امام مالک جب پڑھا کرتے تھے تو ان کے شریک سبق اور شریک صحبت ایک شہزادہ بھی تھا۔ یہ المنصور تھا جو عمر کے اعتبار سے ان سے دو سال چھوٹا تھا۔ جب یہ شہزادہ تحصیل علم سے فارغ ہوا تو اس وقت وہ ایک عالم فاضل، حافظ قاری اور فقیہ بن چکا تھا۔

حضرت امام مالک اس وقت اپنے گلستان حیات کی تینتیسویں (۳۳) بہار دیکھ رہے تھے کہ یہی شہزادہ خاندان عباسیہ کا دوسرا خلیفہ بنا۔ جب مخالفتوں کے بادل چھٹ گئے تو ۱۴۰ھ میں المنصور خلافت کے بعد پہلا حج کرنے کے لئے آیا جب کہ اس سے قبل وہ تین حج کر چکا تھا، شہر کے شرفاء اور علماء اس کے استقبال کے لئے نکلے۔ ہر شخص کے آنے کا مقصد جداگانہ تھا۔

کوئی منظور نظر بننے کے لئے آیا، تو کوئی وفاداروں کی فہرست میں محض نام لکھوانے کی غرض سے، کوئی حاشیہ نشینوں میں بیٹھنے کے لئے اور کوئی نئے حاکم وقت کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے۔ حضرت سلیمان خواص اپنے ہمراہ حضرت امام سفیان ثوری کو لے کر حضرت امام مالک کے ہاں آئے کہ آؤ ہم بھی اس شہزادہ کو دیکھ آئیں، جو ایک مدت تک ہمارے ساتھ چٹائیوں پر بیٹھتا

رہا ہے۔

"مگر کیوں؟ کس حیثیت سے اس کے استقبال کو جائیں۔ کیا تمہارے علم کی کوئی شق اجازت دیتی ہے کہ صاحب دولت کے دروازے پر کوئی فقیر چل کر جائے؟" امام مالک نے ناراض ہو کر فرمایا۔

"ہم کسی لالچ کا دامن پکڑ کر نہیں جا رہے وہ ہمارا دوست ہے، ہمارے ساتھ پڑھتا رہا ہے، ہمارے ساتھ ہم نوالہ و ہم پیالہ رہا ہے۔"

"تو کیا اب تم اس کے ہاں مراعات حاصل کرنے جاؤ گے۔"

"نہیں۔ ہم نے اس سے کیا مراعات حاصل کرنی ہیں۔ ہمیں یہ تو دیکھنے کا حق حاصل ہے کہ اسے دیکھیں کہ تخت خلافت نے اس کے دل میں رعونت پیدا کی ہے یا عاجزی۔"

حضرت امام مالک مان گئے۔ پھر تینوں دوست خلیفہ المنصور کی صحبت میں تشریف لے گئے اس سلسلہ میں جو مجلس قائم کی گئی تھی اس کا نام دربار حجاز رکھا گیا۔ حجاز کے تمام علماء و فقہاء موجود تھے اور سر جھکائے بیٹھے تھے۔ منصور نے جونہی امام صاحب کو دیکھا فوراً کھڑا ہو گیا۔ اپنے پہلو میں جگہ دی۔ کہنے لگا۔

"اے ابو عبداللہ (امام مالک کی کنیت) میں اختلاف فقہی سے گھبرا گیا ہوں۔ عراق میں کچھ نہیں۔ شام والے جہاد کو عزیز رکھتے ہیں، حجاز والوں کو علم سے لگاؤ ہے، حجاز کے سارے علماء کے سرخیل آپ ہیں۔ آپ لوگوں کے لئے ایک ایسی کتاب تصنیف کر دیجئے جس پر عمل کرنے کے لئے میں لوگوں کو آمادہ کروں، اسے میں خانہ کعبہ میں آویزاں کر دوں کہ لوگ اس کی طرف رجوع کریں اس تصنیف کی نقلیں کروا کے مملکت کے تمام

اطراف میں روانہ کروں۔"

حضرت امام مالک بار بار عذر پیش کرتے رہے مگر خلیفہ نے باصرار شدید آپ کو اس کام کے لئے آمادہ کر لیا اور آپ نے موطا کی تدوین شروع کر دی۔ لیکن اس کی تکمیل سے پہلے منصور کا انتقال ہو گیا۔ اور اس کے بیٹے محمد مہدی کے ابتدائی دور خلافت میں اس کتاب کی تکمیل ہوئی۔

امام صاحب نے اس کتاب کے لئے ایک لاکھ احادیث اکٹھی کیں۔ ان میں دس ہزار احادیث کا انتخاب کیا پھر مزید غور و فکر کیا تو موجودہ تعداد جو ۱۷۲۰ کے قریب بنتی ہے، کو کتابی شکل دی۔ پھر اس کتاب کو مدینہ کے ستر جید علماء اور فقہاء پر پیش کیا، جنہوں نے بڑی انظار دقیقہ سے انہیں دیکھا۔

چنانچہ مہدی جب اپنے صاحبزادوں موسیٰ و ہارون کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

امام صاحب نے اس سے فرمایا "مہدی! جانتے ہو مدینہ میں قحط کے دن ہیں۔ آنحضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے انصار و مہاجرین کی اولادیں آباد ہیں۔ وہ سب روضہ نبوی کے ہمسائے ہیں اور فاقوں سے دو چار ہیں۔ ان کی ضرور خدمت کرتے جانا۔"

مہدی نے ۲۵ لاکھ درہم امام صاحب کی خدمت میں پیش کئے کہ تقسیم کر دیئے جائیں۔ امام صاحب نے معتمد تلامذہ سے فرمایا کہ اس رقم کو مستحقین میں بانٹ دینا۔ پھر مزید ۳ ہزار دینار مہدی نے امام صاحب کی خدمت میں پیش کئے، کہ انہیں اپنی ضرورت پر صرف کر لیں اور اس کے ساتھ ہی عرض کرنے لگا کہ آپ میرے ساتھ بغداد چلیں گے۔

امام صاحب کا رنگ سرخ ہو گیا قاصد سے فرمایا ابھی تک ساری

تھیلیاں سربستہ پڑی ہیں وہ خلیفہ مہدی کو واپس کر دی جائیں۔ مالک مدینہ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا **اَلْمَدِيْنَةُ خَيْرٌ لَّهُمْ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ** خلیفہ بڑا شرمندہ ہوا۔ اب اس نے اپنے بیٹوں موسیٰ و ہارون سے کہا کہ وہ امام صاحب سے موطا کی سماعت کریں۔ مگر صاحب زادوں نے جانے کی بجائے امام صاحب کو گھر میں بلا بھیجا۔

امام صاحب نے فرمایا علم بیش قیمت شئے ہے شائقین کو خود اس کے پاس آنا چاہئے۔ چنانچہ دونوں شہزادے خود مجلس درس میں حاضر ہوتے، ان کا اتالیق بھی ساتھ تھا۔ وہ امام صاحب سے عرض کرنے لگا۔ امام صاحب! شہزادے آ گئے ہیں احادیث پڑھ کر سنایئے۔ امام صاحب نے فرمایا ہمارے علماء کا دستور یہ ہے کہ طلبہ پڑھیں شیوخ سنیں۔ اس بات کی خبر مہدی کو دی گئی، مہدی نے کہلا بھیجا جیسے امام صاحب فرماتے ہیں شہزادوں کو ویسے ہی کرنا چاہئے۔ انہیں علماء کی اقتداء میں خود پڑھنا چاہئے۔ چنانچہ شہزادوں نے خود پڑھا اور امام صاحب نے سماعت کی۔

اور پھر ایسا ہی واقعہ ہارون الرشید کے ساتھ بھی ہوا۔ ہارون الرشید جب خلیفہ بنا تو حضرت امام مالک کی عمر ۹۷ سال کے لگ بھگ تھی۔ بالکل بوڑھے ہو چکے تھے۔ ---- ہارون نے سنا کہ حضرت امام مالک ابھی تک موطا کا درس دیتے ہیں۔ تو وہ مدینہ طیبہ میں حاضر ہوا اور اپنے وزیر جعفر برمکی کو آپ کی خدمت میں اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ وہ سلام کے بعد عرض کرے کہ امام صاحب مجھے موطا سنائیں۔ برمکی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا امام صاحب اس وقت درس حدیث دے رہے تھے، سینکڑوں طلبہ حلقہ درس میں بیٹھے تھے۔ برمکی چاہتا تھا کہ امام صاحب اس کی طرف جلد

متوجہ ہوں گے۔ مگر جس کے لبوں پر قال اللہ قال الرسول ہو اس کی نگاہ میں برمکی کی کیا حیثیت ہے۔ یہ تو وہ امام وقت ہیں جن کے درس حدیث کے دوران میں دس بار بچھو اپنا ڈنگ مارتا رہا مگر تعظیم حدیث کے تقدس کے پیش نظر آواز تک میں نقاہت کا احساس نہیں ہونے دیتے۔

جعفر برمکی عام سامعین کی حیثیت سے حلقہ درس میں بیٹھ گیا۔ جب آپ درس سے فارغ ہوئے تو برمکی آگے بڑھا۔ آداب بجا لایا، ہارون کا سلام پیش کیا اور عرض گزار ہوا کہ امیر المومنین آپ سے موطا کی سماعت چاہتے ہیں۔

امام صاحب نے جواب میں فرمایا۔ ان سے میرا سلام کہنا اور کہہ دینا کہ علم خود کسی کے پاس نہیں جایا کرتا، لوگ اس کے پاس آیا کرتے ہیں، علم حاصل کرنے میں جب غریبوں کو عار نہیں ہے تو امیر کیوں گھبراتے ہیں؟

جعفر واپس آیا اور امام مالک کا فرمان عرض کر دیا اتنے میں امام مالک بھی خود تشریف لے گئے۔ ہارون الرشید کھڑا ہو گیا، ہاتھ باندھ لئے اور سر کو جھکا دیا۔ عرض کیا اس قدر پیرانہ سالی میں آپ پیدل تشریف لائے ہیں؟ آپ نے فرمایا مدینہ کی گلیوں میں میرا سوار ہو کر آنا جانا نقوش پائے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بے ادبی ہے۔ ہارون نے پھر عرض کیا آپ کی تصنیفات ہم تک پہنچی ہیں مگر کیا وجہ ہے کہ ان میں ابن عباس اور ابن ابی طالب کی روایتیں نہیں ہیں۔ امام صاحب نے فرمایا امیر المومنین یہ دونوں بزرگ ہمارے شہر میں نہیں تھے۔ ہارون اس جواب سے چپ ہو گیا۔ پھر عرض کیا میں نے آپ کے پاس ایک پیغام بھیجا تھا آپ نے میرا حکم نہیں مانا۔

امام مالک نے سند کے ساتھ وہ روایت سنائی جس میں حضرت زید رضی

اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ نزول وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا زانو مبارک میرے زانو پر تھا ابھی صرف کلمہ غیر اولی الضرر نازل ہوا تھا کہ اس کے وزن سے میرا زانو چور چور ہونے لگا۔ اس کے بعد فرمایا کہ جس قرآن کا ایک حرف جبرائیل علیہ السلام پچاس ہزار سال کی مسافت سے لے کر آتے ہوں کیا میرے لئے زیبا نہیں کہ میں بھی اس کی عزت و احترام کروں؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عزت و بادشاہت سے نوازا ہے اگر سب سے پہلے آپ ہی اس علم کی مٹی خراب کر دیں گے تو خطرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کہیں آپ کی عزت برباد نہ کر دے۔

یہ سن کر ہارون کھڑا ہو گیا۔ عرض کی میں آپ کی معیت میں جانے کو تیار ہوں تاکہ آپ کے حلقہ درس میں بیٹھ کر موطا کی سماعت کروں۔ امام صاحب آگے آگے جا رہے تھے اور ہارون ہاتھ باندھے غلاموں کی طرح پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ امام صاحب چونکہ بوڑھے تھے ان کے جسم میں ضعف تھا۔ ان کی رفتار بہت سست تھی۔ مگر ہارون اس بات سے گھبرایا نہیں وہ برابر آپ کے پیچھے پیچھے چلتا آیا اور آخر اس انداز سے آپ اپنی رہائش گاہ پر پہنچ گئے۔ امام صاحب نے ہارون کو اپنے پہلو میں مسند پر بٹھایا۔

جب موطا پڑھنے کا ارادہ کیا تو ہارون کہنے لگا۔ آپ ہی مجھے پڑھ کر سنائیں امام صاحب نے فرمایا "عرصہ ہوا میں خود پڑھ کر سنانا چھوڑ چکا ہوں۔ کہ اگر خاص لوگوں کی رعائت سے عام لوگوں کو اس سے محروم کر دیا جائے تو پھر خواص کو بھی اس سے نفع نہیں ہوگا۔" اس کے بعد معین بن عیسیٰ (ایک ہونہار شاگرد) کو حکم دیا کہ وہ قرأت شروع کریں۔ جب انہوں نے قرائت شروع کی تو امام صاحب نے ہاروں سے فرمایا کہ اے امیر المومنین اس

شہر میں اہل علم کا دستور ہے کہ وہ علم کے لئے تواضع کرتے ہیں اور یہ تواضع انہیں بے حد پسند ہے۔ ہارون یہ سن کر مسند سے اتر آیا اور سامنے آ بیٹھا اور موطا سننے لگا۔

ہارون الرشید نے کہا کہ موطا کو میرے بچوں امین اور مامون کے لئے املا کر کے دو۔ آپ نے فرمایا ہارون الرشید علم تیرے گھر سے نکلا ہے خواہ اس کو ذلیل کر خواہ عزت دے۔ ہارون الرشید متاثر ہوا اور اپنے بیٹوں امین الرشید اور مامون الرشید کو ساتھ لے کر مجلس میں حاضر ہوا، وہاں طلباء کا ہجوم تھا۔ ہارون الرشید نے کہا "اس بھیڑ کو الگ کر دیجئے" امام صاحب نے فرمایا "شخصی فائدہ کے لئے عام افادہ کا خون نہیں کیا جا سکتا۔" اب دوسری منزل قرأت و سماعت کی تھی۔ ہارون نے کہا "آپ قرأت کیجئے۔" امام صاحب نے فرمایا "یہ بات میرے لئے خلاف عادت ہے۔"

حضرت امام مالک سچے عاشق رسول تھے۔ حق کہنے میں تکلیفیں اٹھائیں مگر حق سے منحرف نہیں ہوئے۔ جابر سلطان کے آگے کلمہ حق کہنے کی آپ سچی تصویر تھے۔ چنانچہ ایک بار آپ نے فتوی دیا کہ خلافت نفس زکیہ کا حق ہے، بیعت جبر درست نہیں ہے۔ کیونکہ جس طرح طلاق جبر واقع نہیں ہو گی، اسی طرح بیعت جبر پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ جعفر برمکی نے مدینہ میں آکر حضرت امام مالک کو کہلا بھیجا کہ طلاق جبری کے عدم اعتبار کا فتوٰی نہ دیں کیونکہ اس سے لوگوں میں بیعت جبری کی بے اعتباری اور عدم صحت کی سند ملتی ہے مگر امام صاحب سے ترک حق کی توقع کس طرح ہو سکتی تھی۔ امام صاحب بدستور معاملہ جبری کے عدم صحت کا فتوی دیتے رہے۔ سلیمان گورنر مدینہ نے غضبناک ہو کر حکم دیا کہ امام صاحب کو ۷۰ کوڑے مارے جائیں

چنانچہ امام صاحب کو مجرموں کی طرح لایا گیا جسم سے کپڑے اتار کر امامت شاہانہ پر دست امارت سے ۷۰ کوڑے پورے کئے۔ تمام پیٹھ خون آلود ہو گئی اس پر بھی تسلی نہ ہوئی تو حکم دیا کہ اونٹ پر بٹھا کر شہر میں تشہیر کی جائے۔

امام صاحب بایں حال زار بازاروں اور گلیوں سے گذر رہے تھے۔ اور زبان صداقت با آواز بلند کہہ رہی تھی کہ "جو مجھ کو جانتا ہے وہ جانتا ہے جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں۔ فتوٰی دیتا ہوں کہ طلاق جبری درست نہیں۔" اس کے بعد اس طرح خون آلود کپڑوں کے ساتھ مسجد نبوی میں تشریف لائے۔ پشت مبارک سے خون صاف کیا اور دو رکعت نماز پڑھی اور لوگوں سے فرمایا کہ سعید بن مسیب کو کوڑے مارے گئے تھے تو انہوں نے بھی مسجد میں آکر نماز پڑھی تھی۔ یہ تقریر تحقیر کے لئے تھی مگر اس نے امام کی عزت و وقار کے پایہ کو بلند کر دیا۔

حوالہ کے لئے

سیرت آئمہ اربعہ از رئیس احمد جعفری

ترجمان السنہ از مولانا محمد بدر عالم میرٹھی

دیباچہ موطا امام مالک از حضرت امام مالک

امدادی کتب

تاریخ الخلفاء از علامہ جلال الدین سیوطی

اردو انسائیکلوپیڈیا فیروز سنز لاہور

جامع اللغات از خواجہ عبدالمجید بی اے۔

نور اسلام مارچ ۱۹۹۳ء

روضہ رسول پر حاضری کی شرط

★ نبی کی امت کا مجرم نبی کا مجرم ہے۔
★ قاضئ وقت کے گھوڑے کی لگام خود قاضی کے ہاتھ میں ہونی چاہئے۔
★ اگر قاضئ وقت دیانت دار ہو تو ملک انتشار سے محفوظ رہتا ہے۔
★ سکون میں رہنے والے عوام اپنے حاکم کی خیر خواہی کی دعا مانگتے ہیں۔

مدینہ منورہ کا قاضی محمد بن عمران طلحیؒ اپنے کمرہ میں بیٹھا ایک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور قاضی صاحب کا ایک کاتب مخیرمدنی قریب بیٹھا کوئی مکتوب لکھ رہا تھا۔ وہ بار بار قاضی صاحب کو دیکھتا اور حیران رہ جاتا کہ آج کیا بات ہے کہ قاضی صاحب اس قدر خاموش اور استغراق کے عالم میں ہیں۔ آخر اس سے نہ رہا گیا۔ عرض کی۔

”حضور! یہ مکتوب لکھا جا چکا ہے۔ اس پر ذرا نظرثانی فرما دیں تاکہ مکتوب الیہ کو بھیج دیا جائے۔“

”قاضی صاحب عالم ہوش میں آئے۔ مکتوب کو دیکھا۔“ اپنے دستخط کئے اور فرمایا۔

”ہاں! اسے بھیج دو۔“

مگر دوسرے ہی لمحے کاتب نے عرض کیا۔

”حضور آج کیا بات ہے۔ اس گہری سوچ میں ڈوبنے کا باعث کیا اثرات ہیں؟ مجھے بھی آگاہ فرمائیں۔ شاید میری کوئی تجویز آپ کے کام آ سکے۔“

”مخیر میاں! کچھ بھی نہیں تو۔ بس ملکی سیاست پر میری نظر پڑی اور اخذِ نتائج میں کھو گیا۔ سوچتا ہوں کہ ملت اسلامیہ کا کیا بنے گا، اس کا یہ ابتلائی دور کب ختم ہو گا؟ جو بھی خلیفہ آتا ہے وہ خون کی پیاسی تلوار ہاتھ میں پکڑے آتا ہے۔ ابھی سفاح (پہلا عباسی خلیفہ) کی خون آشامیاں لوگ نہیں بھولے تھے کہ اس کا بھائی المنصور (دوسرا عباسی خلیفہ) اس سے بھی زیادہ خون بہانے کا عزم لے کر آیا ہے۔ بے جا خون بہانے پر مقتولین کے وارث قاضی کے ہاں آئیں گے۔ جن پر زیادتیاں ہوں گی وہ بھی فریادی بن کر قاضی کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔ ان حالات میں قضا کا عہدہ سنبھالنا بڑا مشکل ہو جائے گا۔ قاضی کی انصاف پسندی کو دھچکا لگے گا۔ قاضی اپنے عہدے کی حفاظت کرے گا تو انصاف کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ انصاف کا دامن مضبوطی سے پکڑے گا تو عہدہ سے برطرف ہونا یقینی ہے۔ ظلم و جور کی راہ میں ہر شخص رکاوٹ بننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ اس لئے اگر کسی قاضی نے بھی کمزوری دکھائی تو امراء اور حکام کو من مانی کرنے سے کوئی طاقت روک نہیں سکے گی۔ اب دیکھو شتربانوں کا واقعہ خلیفہ المنصور کے خاص آدمی ان کا مال لوٹ کر لے گئے ہیں۔ ان کی شکایت آئی پڑی ہے مگر خلیفہ حالات سے آگاہ ہونے کے باوجود ٹس سے مس نہیں ہوا۔“

”شاید آپ کو علم ہو گا کہ خلیفہ المنصور رات کو مدینہ طیبہ میں تشریف لائے ہیں۔“ مخیر مدنی نے کہا۔

"ہاں میں جانتا ہوں۔ خلیفہ کا حاجب مجھے اطلاع دینے کو آیا تھا مگر میں جان بوجھ کر اس کے استقبال میں نہیں گیا۔"

آخر کیوں۔؟

قاضی نے جواباً کہا۔ "وہ میری نظروں میں مجرم ہے۔ مجرم کا استقبال کرنا قاضیٔ وقت کے لئے اس وقت تک مناسب نہیں جب تک وہ اسے اس کے جرم کے مطابق سزا نہ دے لے۔"

"مخیرمدنی! تم ابھی اسے خط لکھو۔ وہ روضہ رسول پر حاضری دینے سے پہلے میرے ہاں آئے۔ شتربانوں والے واقعہ سے اپنی برات ثابت کرے یا ان کا حق ادا کرے۔ اس کے بغیر اس کا کوئی حق نہیں کہ وہ مسجد نبوی میں جا کر نماز پڑھے یا نبی مکرم کے در اقدس پر حاضری دے۔ روضہ رسول پر حاضری دینے کے لئے اس کا حق ہی کیا بنتا ہے جبکہ وہ آپ کی امت کے شتربانوں کا مجرم ہے۔ مخیرمدنی! جلدی سے اسے طلبی کا خط نہیں طلبی کا فرمان لکھو تاکہ شتربانوں کی موجودگی میں انصاف کیا جائے۔"

کاتب مخیرمدنی نے ہچکچاتے اور کانپتے ہوئے عرض کیا۔

"حضور دیکھ لیں کوئی افتاد نہ آ جائے۔ اس کی تلوار کی باڑ سچے جھوٹے میں کوئی امتیاز نہیں کرتی۔"

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں۔ وہ ایسا ہی ہے اگر وہ ایسا نہ ہوتا تو یہ واقعہ ہی کیوں پیش آتا۔ مگر قاضی محمد بن عمران طلحیؒ اس کے ہاتھ کا کھلونا تو نہیں ہے۔ وہ مردہ بدست غسال تو نہیں ہے۔ اس کی زندگی کے گھوڑے کی لگام منصور کے ہاتھ میں تو نہیں ہے۔ وہ ایک قاضی ہے۔ وہ عہدہ قضائی کی اقدار کا [illegible] ہے۔ اسے ان اقدار کا احساس بھی ہے اور ان اقدار کی حفاظت کے

لئے اس میں ہمت اور جرات بھی ہے۔"

آخر کار مخیرمدنی نے ضابطہ کے مطابق یہ فرمان جاری کر دیا اور اس پر قاضی صاحب کی مہر لگا دی اور انتظار کرنے لگا کہ قاصد آئے تو یہ فرمان خلیفہ تک پہنچائے مگر قاضی صاحب نے فرمایا۔ "مخیرمدنی! دیر نہ کرو۔ یہ فرمان لے کر تم خود جاؤ، جب تک میں یہ انصاف نہیں کر لیتا مجھے ایک پل آرام نہیں آئے گا۔ کھانے کا ایک لقمہ میرے حلق سے نیچے نہیں اترے گا اور شاید پانی کا ایک گھونٹ بھی میرے پیٹ میں جانے سے اٹک جائے۔"

چنانچہ مخیرمدنی خود یہ فرمان لے کر منصور کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ منصور کا حاجب ربیع، منصور کی پاسبانی کر رہا تھا۔ مخیرمدنی نے سر جھکایا سلام عرض کیا اور قاضی کا فرمان ربیع کے ہاتھ میں دیتے ہوئے عرض کیا کہ جتنی جلدی ہو سکے اسے خلیفہ کے پاس پہنچا دے۔

"مگر وہ تو اس وقت آرام فرما رہے ہیں۔ ان کے ہاں جانے میں کسے جرات ہو سکتی ہے۔" حاجب ربیع نے کہا۔

"دیکھ لیں یہ فرمان بھی فوری طلبی کا ہے۔ اور بغیر اس کا جواب لئے میں واپس نہیں جاؤں گا۔" مخیرمدنی نے کہا۔

"اچھا تم رکو۔ میں پتہ کرتا ہوں۔" ربیع اندر گیا اور اس واقعہ اور قضیہ کی اطلاع دی۔ خلیفہ پریشان ہو گیا۔ ربیع سے کہا۔

"باہر جا کر اعلان کر دو کہ خلیفہ کو قاضیٔ مدینہ نے طلب کیا ہے۔ تم میں سے کوئی شخص اس کے ساتھ نہیں جائے گا اور قاصد مخیرمدنی سے عرض کرو کہ وہ جائے میں آنے میں کوئی دیر نہیں کروں گا۔"

مخیرمدنی چلا گیا۔ مگر خلیفہ کے درباریوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔

منہ سے منہ جڑنے لگے۔ ہر شخص حیران تھا کہ خلیفہ کو مدینہ میں آتے ہی قاضی نے کیوں طلب کر لیا ہے۔ شاید عیسٰی بن موسٰی کی ولی عہدی سے معزولیت ہو، جس کو سفاح نے منصور کے بعد ولی عہد مقرر کیا تھا۔ مگر منصور نے اسے معزول کر کے اپنے بیٹے مہدی کو ولی عہد نامزد کر دیا ہے۔ یقیناً" عیسٰی بن موسٰی نے اپنا حق طلب کرنے کے لئے قاضی کے پاس درخواست گزاری ہو گی۔ یا شائد ابو مسلم خراسانی کے قتل کے سلسلہ میں طلب کئے گئے ہیں، جس نے دعوت عباسیہ میں بڑی سعی کی تھی، جسے لوگوں نے سلطنت عباسیہ کا بانی کہا اور حامی بھی۔ اور یا شاید اس کے دور میں وضع حدیث کے جو کارخانے کھل گئے ہیں اس کے بارے میں بات کرنا ہو گی۔ یہ لوگ اپنی اپنی عقل کے گھوڑے دوڑاتے رہے۔ شکوک و شبہات کی وادیوں میں بھٹکتے رہے مگر حقیقت حال سے کوئی بھی آگاہ نہ ہو سکا۔ کہ اچانک خلیفہ المنصور اپنی شان و شوکت کے ساتھ باہر نکلا۔ ربیع حاجب کو ساتھ لیا۔ دونوں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور قاضی کی عدالت کی طرف چل دیئے۔ رستے کے جس شخص نے بھی دیکھا حیران تھا کہ خلیفہ وقت یوں اکیلے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کا رخ بھی قاضی کی عدالت کی طرف کیوں ہے۔؟ یقیناً قاضی سے کچھ غلطیاں ہوئی ہوں گی، جن کی باز پرس کے لئے آپ جلدی میں جا رہے ہیں۔

خلیفہ نے جب قاضی کو اپنی آمد کی اطلاع دی تو قاضی ان کے استقبال کے لئے ہر گز باہر نہیں آیا۔ ایک عام آدمی کی حیثیت سے اندر طلب کر لیا۔ خلیفہ جب قاضی کے روبرو پیش ہوا تو کھڑے ہو کر قاضی نے اس کا احترام بھی نہ کیا کاتب مخیر مدنی کھڑے ہونے لگے مگر قاضی نے اس کے بازو کو کھینچ

کر نیچے بٹھا دیا۔

خلیفہ المنصور کو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کیا گیا۔ ابھی تک شتربانوں کی نالش کی بات خلیفہ سے نہیں کی گئی تھی کہ خلیفہ کی چادر کندھوں سے ڈھلک کر نیچے گر پڑی۔ کسی دوسرے شخص کو جرات نہ ہوئی کہ چادر کو اٹھا کر خلیفہ کے کندھوں پر ڈال دے۔ خلیفہ خود ہی جھکا' پاؤں میں گری پڑی چادر کو اٹھایا اور جھاڑے بغیر کندھوں پر ڈال لیا۔

اب مقدمہ کی سماعت شروع ہوئی۔ شتربانوں کے دلائل خلیفہ کے دلائل سے قوی ثابت ہوئے اور قاضی محمد بن عمران طلحیؒ نے مقدمہ کا فیصلہ خلیفہ کے خلاف دے دیا۔ خلیفہ نے شتربانوں کے نقصان کا معاوضہ بھی دیا اور ان سے معافی کا خواستگار بھی ہوا۔ قاضی نے اب مخیر مدنی سے کہہ کر پانی منگوایا چند گھونٹ پئے اور پیالہ ایک طرف رکھدیا۔ پھر کھڑا ہو گیا اور خلیفہ کو اپنے پہلو میں بٹھایا اور بعض ملکی معاملات پر گفتگو کرنے لگا۔

خلیفہ قاضی کی اس انصاف پسندی اور عدل پرستی پر اس قدر خوش ہوا کہ دس ہزار دینار کی ایک تھیلی بطور عطیہ قاضی صاحب کی خدمت میں پیش کی اور فرمایا آپ واقعتاً" عہدہ قضاء کے حق دار ہیں۔ جب آپ نے میرے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں کی تو یقیناً" دوسروں (امراء) کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرو گے۔ یہ روایت بہتر انصاف کی آئینہ دار ہے۔

اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ اگر قاضی دیانتدار ہو، رشوت نہ لے، سفارش کی پرواہ نہ کرے، امراء کے ساتھ رعایت نہ برتے تو ملک میں انتشار نہیں پھیلے گا۔ عوام خوشحال رہیں گے۔ وہ حاکم وقت کے لئے دعا کریں گے۔ گویا کہ قاضی کی انصاف پسندی خلیفہ کو نامور بنا دے گی۔ اگر کسی خلیفہ کو

ایسے نیک خو قاضی مل جائیں تو اسے چاہئے کہ انہیں ہر طرح کا تحفظ دے۔ یہ تحفظ یقیناً" اسلامی اقدار کی حفاظت کرے گا۔

حوالہ کے لئے:

تاریخ الخلفاء از جلال الدین سیوطی
نورِ اسلام، شرقپور شریف اپریل ۱۹۹۳ء

دامان فیض عام

- ولی کامل کی بات تقدیر بدل کے رکھ دیتی ہے۔
- سرکاری افسروں کی یاریاں جرائم کی رفتار میں اضافہ کرتی ہیں۔
- ہرنیاں (فتق) کی بیماری کے اسباب میں زنا ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔
- زنا بے پناہ جرائم کو جنم دیتا ہے۔
- بزرگان دین کے ہاں حاضری اخلاق کی تعمیر کرتی ہے اور ان کے دستر خوان کے ٹکڑے جسم کی بیماریوں کا علاج ہیں۔

اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد شرق پوری رحمتہ اللہ علیہ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد ان کا ۲۳ واں عرس مبارک بڑی دھوم دھام سے منایا جانے والا تھا۔ بغیر کسی اشتہار اور اعلان کے عرس کی تقریبات شروع ہونے سے قبل ہی لوگ شرق پور شریف میں آنا شروع ہو جاتے گلیاں اور بازار پر رونق بن جاتے تھے۔

زمینِ شرق پور کی خاک کے ذروں میں ایک روحانی کشش تھی کہ زائرین دور دور سے پیدل چل کر یہاں آتے رہتے تھے اور ہر ایک ذکر و فکر

میں مشغول رہتا۔ ان زائرین میں ایک بوڑھا بابا محمد ابراہیم جس کا تعلق قلعہ گوجر سنگھ لاہور سے تھا، اس عرس کی تقریبات میں شمولیت کی غرض سے حاضر ہوا۔ کوئی ۶ فٹ لمبا قد ہوگا۔ سفید داڑھی، موٹی موٹی آنکھیں مگر اندر دھنسی ہوئی۔ پر وجاہت چہرہ۔ سفید دھلے ہوئے کپڑے۔ سر پر گٹھڑی نما پگڑی باندھے ہاتھ میں لاٹھی لئے درمیانی چال سے چلتے ہوئے بولیاں والے کھوہ (کنواں) کی طرف بڑھتے ہوئے آئے۔

بولیاں والا کھوہ شرق پور شریف کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ اب اس کھوہ کا تقریباً سارا رقبہ آبادی میں تبدیل ہو چکا ہے کھوہ کی حویلیاں اب بھی موجود ہیں مالکان کی اولادیں بڑھاپے کی حدوں میں داخل ہو چکی ہیں۔ انہیں مالکان میں سے ایک بابا حاجی غلام حسین بولا اب بھی موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کی زندگی میں مزید برکت دے۔ یہ وہ حاجی غلام حسین ہے۔ جس پر اعلیٰ حضرت میاں صاحب کی خاص نظر کرم تھی۔ عمر کی (۸۵) ویں بہار دیکھ رہا ہے۔ اس کی یادداشت خاصی مضبوط ہے۔ اور میاں صاحب کے واقعات بڑی روانی کے ساتھ بیان کر جاتا ہے۔ ان کے بیان کے مطابق جب حضرت قاری محمد ابراہیم (امام مسجد) نے غلام حسین کو حفظ قرآن کی خاطر میاں صاحبؒ سے اجازت مانگی تو اعلیٰ حضرت صاحبؒ نے فرمایا بس اسے نمازی بنائیں ۔۔۔ نمازی بنانے کی بات ایک ولی کامل کی زبان سے نکلی اور واقعتاً اسے نمازی بنا گئی۔ وہ بڑی خوشی سے اس بات کو بیان کرتے ہیں کہ اب تک میری صرف ایک نماز (نماز عصر) قضا ہوئی ہے اور پوری زندگی میں تین جمعے نہیں پڑھ سکا۔

یہ غلام حسین کھوہ پر ڈھور ڈنگروں کو چارہ ڈالنے میں مشغول تھا کہ اس

نے اس بابا جی کو دیکھا بابا جی یوں رواں قدموں کے ساتھ آ رہے تھے جیسے اس کھوہ کے سارے بندے ان سے واقف ہیں۔

رہٹ چل رہا تھا۔ سفید رنگ کے بیلوں کی جوڑی بڑے استقلال کے ساتھ پانی کھینچ رہی تھی۔ ان کے گلے کی گھنٹیوں اور گھنگروں کی آواز کانوں میں رس گھول رہی تھی۔ بابا جی آگے بڑھے۔ انہوں نے اپنے کپڑے اتارے ایک لنگوٹی زیب تن کی اور کپڑوں کو دھونا شروع کیا کپڑے دھوئے اور سوکھنے کے لئے دھوپ میں پھیلا دیئے۔ پھر خود نہاتے رہے۔ کنویں کے ٹھنڈے پانی میں نہاتے ہوئے انہیں ایک خاص لطف آ رہا تھا بار بار کلیاں کرتے منہ دھوتے اور پھر پورے جسم کو پانی میں ڈبو دیتے۔ کلمہ پڑھتے ہوئے اپنے سر کے لمبے بالوں کو جو چہرے پر ڈھلک رہے تھے، اپنے دونوں ہاتھوں سے سر پر بکھیر دیتے۔ بابا جی یہ عمل بار بار دہراتے رہے۔ اس دوران میں ان کے کپڑے کافی حد تک خشک ہو چکے تھے۔ انہوں نے کپڑے پہنے اور کھوہ کی چھوٹی سی کچی مسجد میں ظہر کی نماز ادا کی۔

نوجوان غلام حسین آگے بڑھا اور پوچھا۔ بابا جی آپ کے کپڑے تو پہلے ہی دھلے ہوئے اور صاف ہیں اور ظاہر ہے کپڑے پہنتے وقت آپ نہائے بھی ضرور ہوں گے۔ مگر کپڑوں کو دوبارہ دھونا اور یوں پاکیزگی کی شرطوں کے ساتھ نہانے میں کیا مصلحت ہے۔

بابا جی بولے! بیٹا ہم بڑے گناہگار ہیں جو چیز بھی ہم سے لگ جاتی ہے ناپاک ہو جاتی ہے۔ حضور میاں صاحب کے عرس میں شرکت کرنی ہے۔ اس لئے ناپاک کپڑوں اور ناپاک جسم کے ساتھ کیوں جائیں۔

بابا جی کی ان باتوں میں بڑی مٹھاس تھی۔ میاں صاحب کے نام لینے میں

بڑی عقیدت اور محبت ٹپکتی تھی اور نوجوان غلام لسین بھی اعلیٰ حضرت سے خاص عقیدت رکھتا تھا۔ عرض کرنے لگا۔ بابا جی مجھے کوئی خدمت کا موقعہ آپ دے سکتے ہیں حقہ تمباکو یا کوئی لسی پانی جس چیز کی طلب ہو فرمائیں۔ میں پیش کرنے کو تیار ہوں۔

بابا جی آگے بڑھے انہوں نے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا اور فرمایا تم شرق پور شریف میں رہ کر حقے تمباکو کا نام لیتے ہو۔ تمہیں میاں صاحب کا کوئی ڈر خوف نہیں ہے۔ تم لوگ تو بڑی قسمت والے ہو شرق پور شریف جیسی بستی میں رہتے ہو اور پھر میاں صاحب کی ہمسائیگی تمہیں حاصل ہے۔

نوجوان بابا جی کی ان باتوں سے بھینپ سا گیا۔ مگر دوسرے ہی لمحے بابا جی نے فرمایا جاؤ لسی ہو تو لے آؤ۔ لسی میں نمک ڈال کے لانا ---- نوجوان نے بابا جی کی خواہش کے مطابق یہ مشروب تیار کیا اور چھناں بھر کے دیا۔ بابا جی لسی پیتے رہے اور دعائیں دیتے رہے فراغت کے بعد نوجوان نے بابا جی سے عرض کیا۔ آپ عرس پر بڑی محبت اور عقیدت سے تشریف لاتے ہیں اس کے پس منظر میں اگر کوئی واقعہ ہو تو میں اسے سننا چاہتا ہوں۔

بابا جی نے فرمایا نوجوان تم بڑے بھلے آدمی لگتے ہو۔ جو بزرگوں کے واقعات اس محبت سے سننا چاہتے ہو۔ میری زندگی کے واقعات بڑے گھناؤنے ہیں۔ ماضی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو رونگٹا رونگٹا کانپنے لگتا ہے۔ مگر انہیں واقعات میں ایک واقعہ ایسا بھی ہے جس نے میری زندگی میں ایک انقلاب پیدا کر دیا ہے وہ انقلاب محض اعلیٰ حضرت صاحبؒ کی نظر عنایت سے آیا ہے۔

بیٹا تم بھی جوان ہو، نیک بخت ہو، ہم پر بھی جوانی آئی۔ مگر بڑی

خرمستیاں لے کر آئی۔ غلیظ شرارتوں سے لبریز ہو کر آئی، ساتوں عیبوں سے مزین ہو کر آئی، امتیاز کرنا مشکل ہو گیا کہ ہم عیبوں کے لئے پیدا ہوئے یا عیب صرف ہمارے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ اپنی زندگی کو جوا' شراب' زنا' چوری' قتل' اغوا اور ڈکیتی کو شباب سے ہمکنار کرنے والے ہم ہی لوگ تھے۔ قانون ہمارے ہاتھوں میں تھا۔ ہم جیسے چاہتے ویسے ہی اس سے کام لیتے۔

نوجوان! ہم تین آدمی تھے۔ ایک لاہور کا ڈی سی' ایک فوج کا کرنل اور ایک میں، میں چار مربعوں کا مالک تھا۔ حد نگاہ تک میری زمین ہی زمین تھی فصلیں پکتیں تو گودام غلے سے بھر جاتے اللہ تعالیٰ کی ان کرم بخشیوں کا مجھ سے شکر ادا نہ کیا جا سکا۔ رعونت آ گئی۔ ڈی سی صاحب اور کرنل صاحب سے یاری لگ گئی میں ان کا مہرہ بن گیا میرے جرائم پر پردہ ڈالنے میں وہ بڑے مفید ثابت ہوتے۔ لوگ تو کہتے ہیں چوہدریوں کے باعث جرائم کی رفتار بڑھتی ہے مگر میں کہتا ہوں سرکاری افسروں کی یاریاں جرائم میں اضافہ کرتی ہیں۔

ہمارے سارے جرائم صرف ایک جرم یعنی زنا کی خاطر تھے۔ جو لڑکی ہمیں پسند آ گئی اس کو حاصل کرنا ہمارا فرض بن جاتا اور اس کے حصول میں ہمیں جو بھی قیمت ادا کرنا پڑتی ہم اس سے گریز نہ کرتے جو ہماری راہ میں آتا زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہماری اپنی ایک دنیا تھی اور ہم اس دنیا کے حاکم و مختار تھے۔ مگر یہ زیادتی اور ظلم جن لوگوں کے ساتھ ہوتا رہا ان کے خدا نے ہماری رسی بڑی ڈھیلی چھوڑے رکھی۔ ہم آگے ہی آگے بڑھتے گئے حقیقت میں ہم گرفت کے پھندے کے قریب جا رہے تھے۔ آخر وقت آ گیا کرنل

صاحب اور ڈی سی صاحب کی نوکری سے چھٹی ہو گئی۔ مجھ پر مقدمے بن
گئے۔ جمع پونجی ہم سے روٹھ گئی۔ ناراض رہنے لگی۔ پولیس اور وکیلوں کے
گھر کی جانب رخ کر لیا۔ جرمانوں کی سزائیں ہوئیں مگر قید کی سلاخوں کے
پیچھے جانے سے بچ گئے۔ میری چاروں مربعے زمین گروی رکھی گئی۔ اور مجھے
ہرنیاں (فتق) ہو گئیں یہ تکلیف میری قوت برداشت سے باہر ہو گئی۔ لاہور
کے حکیموں ' ڈاکٹروں نے اپنے سارے نسخے آزما دیکھے مگر آرام بالکل نہ آیا
آخر پچاس ہزار روپے کی رقم لے کر دہلی میں علاج معالجے کی غرض سے گیا۔
رقم ختم ہو گئی مگر تکلیف کی گھڑیاں ختم نہ ہوئیں۔ سارا روپیہ برباد کر کے
واپس آ گیا۔

میرے دوستوں کرنل صاحب اور ڈی سی صاحب کو پتہ چلا تو میری خبر
گیری کو آئے مجھے سخت تکلیف تھی۔ میں کراہ رہا تھا ، دوستوں کو دیکھا تو
بے ساختہ آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے ان سے ملا تو دھاڑیں مار مار کر رویا
دہلی کے قیام کی باتیں ہوئیں۔ میں نے کہا ہم دنیا والے سارے چور ہیں کوئی
قوت بازو کے ذریعے لوگوں کو لوٹ رہا ہے اور کوئی عقل و فراست کی قوت
سے لوٹ رہا ہے۔ ہم نے دوسرے لوگوں کو لوٹا پولیس وکیل اور ڈاکٹر حکیم
ہمیں لوٹ رہے ہیں۔ پچاس ہزار کی رقم ان ڈاکٹروں نے میری تجوری کی
چابیاں مانگے بغیر مجھ سے لوٹ لی جب پیسے ختم ہو گئے تو گھر بھیج دیا کہ جاؤ اور
پیسے لاؤ جناب بھلا میں پیسے کہاں سے لاؤں۔

ایک لمحہ کے لئے خاموشی ہو گئی۔ تینوں دوست گہری سوچ میں ڈوب
گئے کہ اچانک ڈی سی صاحب نے اس سکوت کو توڑا وہ کہنے لگے سنا ہے شرق
پور شریف میں ایک ولی اللہ اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب ہیں ان کی نگاہ

اور زبان میں شفا ہے۔ چلو ان کے ہاں چلتے ہیں۔ ویسے بھی آج جمعہ ہے
ملاقات کا زیادہ امکان ہے۔ جمعہ شریف بھی ان کی اقتدا میں پڑھیں گے اور
عرض حال بھی بیان کریں گے۔ کرنل صاحب نے کہا بھئی ایسو! آپ کو علم ہے
کہ میں کریلے اور قیمہ بڑے شوق سے کھاتا ہوں ہم نے آج یہ ڈش بڑے
اہتمام سے گھر میں تیار کی ہے۔ چلو میرے گھر میں پہلے کھانا کھائیں ازاں بعد
شرق پور شریف جائیں گے۔

اگر کھانا کھانے بیٹھ گئے تو دیر ہو جائے گی جمعہ بھی نہ پڑھ سکیں گے۔ بابا
جی نے بتایا۔ چنانچہ ہم تینوں دوست شرق پور شریف میں اعلیٰ حضرت میاں
صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ بمشکل پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ
کھانا آ گیا فرمایا یہ کھانا کرنل صاحب کے لئے ہے اور آپ تھوڑی دیر تک
انتظار کریں کرنل صاحب نے کھانا دیکھا تو کریلے اور قیمہ پکا ہوا تھا۔ وہ حیران
رہ گئے میاں صاحب نے فرمایا یہ آپ کا پسندیدہ کھانا ہے ناشوق سے کھائیں
تھوڑی دیر کے بعد ہمارے لئے دال اور کدو کے ساتھ کھانا آیا۔ ہم نے
بڑے شوق سے کھایا اتنے میں جمعہ کا وقت ہو گیا۔ حضرت صاحب نے فرمایا
مسجد میں جائیں جمعہ کے بعد آپ سے باتیں ہوں گی جمعہ پڑھنے کے بعد پھر
میاں صاحب سے شرف دیدار حاصل ہوا۔

میاں صاحب نے مجھ سے پوچھا آپ کا نام کیا ہے۔

محمد ابراہیم' میں نے عرض کیا۔

آپ نے بڑے حیران ہو کر فرمایا دو پیغمبروں سے آپ کی نسبت ہے۔ مگر
آپ نے کسی پیغمبر کی نسبت کا خیال نہ رکھا۔ رہی آپ کی ہرنیاں (فتق) کی
تکلیف تو وہ کام ہی کیوں کرتے ہو جس سے ہرنیاں ہو جائیں۔ غالباً" آپ کا

یہ اشارہ اس طرف تھا کہ زنا سے ہرنیاں ہو جاتی ہیں۔

مزید فرمایا گاہے گاہے ہماری دال چپاتی کھانے کو آ جایا کرو۔ اللہ خیر کرے گا اور ہاں سنو تین شادیاں اور کر لینا زنا سے بچے رہو گے۔

اجازت ملنے پر ہم واپس چلے آئے۔ چند ہی دنوں کے بعد مجھے ہرنیاں سے نجات مل گئی۔ میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔ سارے برے کاموں سے ہاتھ کھینچ لیا نماز روزے سے لگاؤ ہو گیا۔ میری تو زندگی ہی بدل گئی۔ حضرت صاحب کے فرمان کے مطابق تین اور شادیاں بھی کیں ان تینوں بیویوں سے دو دو بچیاں پیدا ہوئیں میری پہلی شادی سے دو بچیاں اور تین لڑکے تھے۔

چونکہ میری ساری زمین گروی رکھی ہوئی تھی کثرت اولاد سے میں کچھ پریشان رہتا تھا ایک دن حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور زمین کے واگذار کروانے کے لئے عرض کیا فرمایا گھبرائیے نہیں اللہ تعالیٰ کوئی بہتر سبیل پیدا کر دے گا۔ پھر ایک دن کیا ہوا میں مال روڈ کے پر رونق کنارے کنارے جا رہا تھا کہ سڑک کے عین بیچ میں ایک پرس پڑا ہوا دیکھا یہ پرس کس کا تھا؟ اس میں کیا تھا؟ کسی کو کچھ معلوم نہ تھا میرے منہ میں پانی بھر آیا مگر اسے اٹھانے میں ڈرتا تھا۔ کہ کہیں دھر نہ لیا جاؤں۔ میں ایک طرف ہو کے کھڑا ہو گیا اور پرس کو دیکھتا رہا۔ بڑے لوگ آتے رہے اور گزرتے رہے بلکہ میں نے یہ تک محسوس کیا کہ پرس پر کئی لوگوں کے قدم بھی آئے۔ مگر پرس کو کسی نے نہ اٹھایا گویا پرس کسی کو دکھائی ہی نہ دے رہا تھا۔ اور صرف مجھے نظر آ رہا تھا۔ پورا ایک گھنٹہ گذر گیا کسی نے پرس نہ اٹھایا اب میں پرس اٹھانا چاہتا تھا مگر ہمت نہ ہوتی تھی میں اپنی اس بے ہمتی پر حیران تھا کہ پرس اٹھانے کی جرات مجھے کیوں نہیں ہو رہی ہے۔ میں تو ایسے پرس لوگوں

کے ہاتھوں سے چھین لیا کرتا تھا۔ آج مجھے کیا ہو گیا ہے آخر میں نے دل مضبوط کیا رواں قدموں کے ساتھ آگے بڑھا اور یوں پرس اٹھا لیا جیسے وہ میرا ہی ہو۔ میں جلدی سے سڑک کے کنارے پر آ گیا زپ کھول کر ایک اچٹتی نگاہ ڈالی تو اندر نوٹ ہی نوٹ تھے۔ دل دھک دھک کرنے لگا ایک خوف سا طاری ہونے لگا دل نے چاہا اس پرس کو پھینک دوں مگر کیوں پھینکوں؟ مجھے تو خود کو روپوں کی ضرورت ہے۔ میں کثیر العیال ہوں میری آمدنی سے اخراجات زیادہ ہیں۔ یہ تو میرا خدا میری مدد کر رہا ہے۔ میں اسے نہیں پھینکوں گا معاً" خیال آیا اس قدر رقم کا مالک چین سے کب بیٹھے گا وہ تو بیچارہ مر ہی جائے گا۔ یقیناً" تھوڑی دیر کے بعد وہ روتا پیٹتا یہیں آئے گا۔ اگر اسے یہ رقم نہ ملی تو بیچارہ پاگل ہو جائے گا۔ میں جبکہ اس رقم کا مالک نہیں ہوں تو اسے کیوں پاگل ہونے دوں اسے کیوں مرنے دوں۔ میں وہیں ٹہلنے لگا پرس کو چھپایا نہیں تاکہ ہر دیکھنے والے کو پرس دکھائی دیتا رہے ایک گھنٹہ دو گھنٹے تین گھنٹے گذر گئے شام ہونے کو آ گئی ان روپوں کا مالک واپس نہ آیا آخر میں یہ پرس لے کر واپس گھر آ گیا۔

اپنے کمرے میں جا کر ان نوٹوں کو گنا تو پوری ایک لاکھ روپے کی رقم تھی میں نے اسے صندوق میں بند کر دیا اور تالہ لگا دیا رات کو کھانا بھی نہ کھایا سو گیا۔ مگر نیند نہیں آتی تھی بس کروٹیں بدل بدل کر رات گذاری صبح ہوئی نماز پڑھی اور تیار ہو کر شرق پور شریف میں حضرت میاں صاحبؒ کی خدمت میں حاضر ہوا چاہتا تھا کہ ان روپوں کا ذکر کروں تنہائی چاہتا تھا مگر تنہائی نہ مل سکی لوگ آتے رہے اور رونق ہوتی رہی میری ہمت جواب دے گئی میری جرات مفلوج ہو گئی نہ پوچھ سکا کہ اثنائے گفتگو حضرت صاحب نے

فرمایا بعض اوقات کافر کا گرا ہوا مال ضرورت مند پر حلال ہو جاتا ہے۔ ہاں
ہاں اسے اپنے مصرف میں لے آنا چاہئے کوئی مضائقہ نہیں اللہ تعالیٰ بعض
اوقات اپنے بندوں کی مدد فرما دیتا ہے۔

میں روپوں کا ذکر کئے بغیر اجازت ملنے پر واپس آ گیا ساہوکار کو یہ رقم
دی اور اپنا ایک مربع زمین واگذار کروالی قبضہ لے لیا اور کاشت کرنے لگا
فصل گھر میں آنے لگی گھر کی حالت سدھرنے لگی۔ حالات بہتر سے بہتر ہونے
لگے باقی تین مربعے تین لاکھ میں سکھوں کے پاس رہن تھے تین لاکھ نہ جمع
ہوئے نہ زمین واپس لی۔

ایک دن حضرت صاحب کی خدمت میں بیٹھا ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا
ابراہیم تم اپنی زمین کو بیچ نہ دینا اور نہ ہی انتقال سکھوں کے نام کروانا اللہ تعالیٰ
کوئی بہتر سبب پیدا فرما دے گا۔

زمین سکھوں کے پاس رہی اور میرے اخراجات ایک مربع کی کاشت
کاری سے پورے ہوتے رہے آخر ایک دن ایسا آیا کہ ہم حضرت صاحب
کے سایہ سے محروم ہو گئے۔ حضور کا وصال ہو گیا شرق پور شریف کے درو
دیوار رونے لگے کوئی کسی کو چپ کروانے والا نہ تھا ایک دنیا دھاڑیں مارتی
ہوئی شرق پور شریف کی طرف بڑھ رہی تھی آخر کیا ہوا حضور کا جسد خاکی
ہم نے اپنے ہی ہاتھوں سے زمین کے حوالے کر دیا آپ کی محبتیں اور
شفقتیں ساری زمین کے نیچے دفن کر دیں۔

میرے حالات میں نشیب و فراز آتے رہے بچوں اور بچیوں کی شادیوں
کے باعث کئی بار زیر بار ہوا زمین بیچنے کی نوبت آ جاتی مگر حضور کا ارشاد یاد آ
جاتا کہ زمین کو بیچنا نہیں۔

آخر ۱۹۴۷ء کے ہنگامے شروع ہو گئے پاکستان بن گیا ہندو اور سکھ
ہندوستان میں جانے لگے میرے پاس اس وقت ۳۰ ہزار کی رقم تھی میں یہ
رقم لے کر سکھوں کے پاس گیا عرض کیا سردار جی آپ تو جا رہے ہیں زمین
تم یہیں چھوڑ جاؤ گے بہتر ہے میں آپ کو دس ہزار روپے فی مربع کے
حساب سے دیدوں اور آپ میری زمین کے کاغذات واپس کر دیں۔

سردار جی نے کہا واہ تین لاکھ کے بدلے میں صرف تیس ہزار لوں۔
اچھا یوں کرو بیس ہزار کے حساب سے رقم دے دو کل ساٹھ ہزار روپے بنتے
ہیں میں نے کہا نہیں سردار جی میرے پاس تو بس یہی تیس ہزار ہیں میں نے
رقم ان کے آگے ڈھیر کر دی۔

سردار جی نے سوچا چلو ٹھیک ہے یہی لے لیتے ہیں ورنہ یہ بھی ضائع ہو
جائیں گے انہوں نے یہ رقم جھولی میں ڈال لی اور میری زمین کے کاغذات
مجھے واپس کر دیئے۔

میں خوشی خوشی گھر واپس آ گیا میں اپنے چاروں مربع زمین کا مالک
دوبارہ بن گیا تھا قلعہ گوجر سنگھ کا رئیس بن چکا تھا اس دن حضرت صاحب
کے ارشادات کا مطلب مجھ پر واضح ہو گیا جو آپ نے تیس اکتیس سال قبل
فرمایا تھا کہ زمین کو نہ بیچنا نہ انتقال کر کے دینا۔

آستانہ شرق پور شریف پر آ کر میری کایا پلٹی میری زندگی میں انقلاب
آیا میں برا تھا، نیک بن گیا بدحال تھا، خوشحال بن گیا بیمار تھا، صحت یاب ہو گیا،
زمین کا مالک نہ تھا، مالک دوبارہ بن گیا۔

جو بات ظہر کی نماز کے بعد شروع ہوئی تھی وہ عصر کی نماز کے وقت کی
حدوں میں داخل ہو گئی اور بابا دربار اقدس کی جانب چل دیا۔

حسب روایت حاجی غلام حسین بولا، شرقپور شریف
نورِ اسلام، شرق پور شریف جون ۱۹۹۳ء

ولی شب زنده دار

☆ اللہ والے محنت مزدوری کی روزی کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔

☆ ولی کامل اپنے مقام ولایت کو چھپا کر رکھتا ہے۔
☆ مردِ حق نے اپنے اللہ سے جو مانگا اللہ نے اسے دیدیا۔
☆ ان لوگوں کے بارے میں محتاط رہیں جن میں آپ رہ رہے ہیں کیا خبر ان میں کوئی صاحب ولایت ہو۔

پانی پت کے جنوب میں شہداء کے چند مزارات ہیں جو شہدائے بلندی کے نام سے موسوم ہیں۔ وہاں ایک ولی کامل تشریف فرما تھے۔ کہ ایک خادم نے ان کی خدمت میں دودھ سے لبا لب بھرا ایک پیالہ پیش کیا، آپ مسکرائے اور ایک گلاب کا پھول اس میں رکھ دیا۔ اور فرمایا کہ میرا سلام پیالہ بھیجنے والے کی خدمت میں پہنچاؤ اور یہ پیالہ بھی انہیں اسی حالت میں دے دو۔ یہ پیالہ جب بھیجنے والے کے پاس پہنچا تو وہ متبسم ہوئے۔ حاضرین نے تبسم کی وجہ دریافت کی تو فرمایا میں نے یہ پیالہ حضرت شیخ شرف الدین بو علی قلندر کے پاس اس لئے بھیجا تھا کہ اب میں پانی پت کی ولایت پر متعین کیا گیا ہوں اور یہ شہر میری ولائت سے اسی طرح لبریز ہے جس طرح یہ دودھ کا پیالہ لبریز ہے۔ اس لئے یہاں کسی اور کی گنجائش نہیں ہے۔ آپ یہاں سے

چلے جائیں۔ مگر آپ نے اس کے جواب میں گلاب کا پھول رکھ کے مجھے بتا
ہے کہ جس طرح دودھ سے لبریز پیالے میں گلاب کا پھول آگیا ہے، اس
طرح میں بھی آپ کی ولائت میں رہوں گا۔ مگر آپ کی ولائت سے مجھے کوئی
واسطہ نہ رہے گا۔

یہ بزرگ تھے صاحب ولائت و خورشید سپہرِ ہدایت، خزانہ علم و گنجینہ علم
خداوند عزو تمکن و زبدہ آل **طٰہٰ و یٰسین**، مخدوم العالمین بندہ نواز حضرت
خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی۔ قدس سرہ العزیز۔ آپ تمام اوصاف فقر و
درویشی سے متصف اور صاحب ریاضت و مجاہدہ بزرگ تھے۔ آپ نے
حضرت مخدوم خواجہ علاؤ الدین علی احمد صابر و حضرت قطب الموحدین خواجہ
فرید الدین شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ ہر دو حضرات سے خلافت حاصل فرمائی۔ اور
خرقہ فقر حضرت خواجہ علاؤ الدین سے پہنا۔ آپ ترکستان کے صحیح النسب
سادات میں سے تھے۔

آپ حضرت خواجہ علاؤ الدین علی احمد صابر کے ہاں کلیر شریف میں
گیارہ سال تک رہے۔ سخت ترین مجاہدات میں مشغول اور فقر و فاقہ کے
ساتھ بسر فرماتے رہے۔ حتیٰ کہ منصب خلافت و تعلیم اسم اعظم سے سرفراز
ہوئے۔

منصب خلافت پر فائز ہونے کے بعد پیر و مرشد نے پانی پت بھیجنے کا
ارادہ فرمایا۔ مگر آپ نے عرض کی کہ ہنوز اپنے کو اس اہم منصب کے قابل
نہیں پاتا۔ اگر حکم ہو تو چند دنوں تک مزدوری کروں۔ چنانچہ آپ کی استدعا
منظور ہوئی اور آپ نے سلطان محمود غیاث الدین بلبن کی نوکری کرلی۔

ایک بار سلطان غیاث الدین بلبن کوہ پایہ کی مہم میں مصروف تھا۔ وہاں

کے مفسدوں، باغیوں، شرپسندوں اور سرکشوں نے حکومت کے خلاف ایک
بڑی خطرناک مہم چلا رکھی تھی۔ عام آدمی کی زندگی سے سکون چھینا جا رہا تھا۔
ایسی بے سکونی کو ختم کرنے اور شرپسندوں کی شورشوں کو خاموش کرنے کے
لئے بلبن نے تلوار سنبھال رکھی تھی۔ وہ بدایوں، سنبل، امروہہ کنپل، پٹیالی
اور بھوج کی شورشوں کو ختم کر کے دہلی میں آیا تھا کہ کوہ پایہ کی شورشوں کا
علم ہوا۔ وہ چند روز دہلی میں رکا اور پھر کوہ پایہ کا سفر اختیار کیا۔

کوہ پایہ کا قلعہ بڑا مضبوط قلعہ تھا۔ اس کی تسخیر بلبن کے لئے ایک چیلنج
بن گئی۔ وہ جتنی جلدی اس مہم سے فارغ ہونا چاہتا تھا اتنا ہی وہ اس میں
الجھتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ دو سال کے طویل عرصہ تک وہ یہاں رکا رہا۔ وہ
یہاں قلعہ کے باہر خیمے لگائے بیٹھا تھا۔ اچانک ایک رات آندھی اور بارش
کا اس قدر تیز طوفان آیا کہ خیموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں۔ اور خیمے اکھڑ اکھڑ
کر گر پڑے۔ فوج کے افسروں نے خود اٹھ اٹھ کر بانسوں کو سنبھالا دیا۔ ٹوٹی
ہوئی رسیوں کو گانٹھیں دے دے کر جوڑا۔ اور اکھڑے ہوئے کیلوں کو
ٹھونکا۔ افسروں کو ایک مزدور اور چھوٹے سپاہی کی مشقت، محنت اور سخت
کوشش کا احساس ہونے لگا۔ بادشاہ کا خیمہ تو نہ گرا مگر ہوا کی گزر گاہ ضرور بنا
رہا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ سارے خیموں کی شمعیں گل ہو گئیں۔ ہر جانب
تاریکی ہی تاریکی تھی۔ زندگی تاریکی کے بے شمار دبیز پردوں میں دبک گئی
تھی۔ زندگی کی ہر سانس اور ہر حرکت پر تاریکی کی جابر حکومت نے قبضہ کر
رکھا تھا۔

ادھر بادشاہ کے نوافل پڑھنے کا وقت تھا۔ اسے گرم پانی تو کجا ٹھنڈا پانی
بھی ملنا دشوار تھا۔ کہ وضو کرے اور نماز پڑھے۔ وہ نوافل بہر حال پڑھنا چاہتا

تھا۔ اور ادھر آبدار خانہ شاہی کا بہشتی سرگرداں تھا کہ اسے کہیں سے آگ
ملے تو وہ بادشاہ کے وضو کے لئے پانی گرم کرے ...... وہ بھاگا تو پھرتا تھا مگر
اندھیرے اور تاریکی کی وجہ سے اس کی اس حرکت میں تیزی نہیں آ سکتی
تھی۔ اور نہ ہی آئی۔ وہ ایک خیمے سے دوسرے خیمے تک جاتا' معاً" اسے
بادشاہ کے نماز پڑھنے کا خیال آ جاتا۔ پھر اچانک اسے ایک خیمے میں جلتے
ہوئے چراغ کی روشنی دکھائی دی۔ اس کے دل میں خوشی نے ایک انگڑائی
لی۔ وہ جلدی جلدی روشنی کی جانب لپکنے لگا۔ یہ روشنی ایک خیمہ میں سے
چھن چھن کر آ رہی تھی۔ وہ قریب گیا اور دیکھا کہ ایک باخدا درویش کلام
مجید کی تلاوت میں محو ہیں۔ نور و عرفان کی بارشیں ہو رہی ہیں۔ گویا ایک
روحانی رعب و جلال کا ہالہ قائم تھا۔ اس کو آگے قدم بڑھانے کی جرات نہ
ہوئی۔ وہ ایک خیمے کے ساتھ لگ کے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس
درویش خدا مست نے سر کو اٹھا کر اس بہشتی کو دیکھا۔

فرمایا ' بھائی اندر آ جاؤ۔ آندھی اور طوفان بادوباراں میں کیوں اپنی جان
کو ہلکان کر رہے ہو؟ کہئے میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں؟

میں بادشاہ غیاث الدین بلبن کے آبدار خانہ شاہی کا بہشتی ہوں۔ بادشاہ
نے نوافل ادا کرنے ہیں مگر وضو کے لئے پانی گرم کرنا ہے اور آگ نہیں
مل رہی ہے۔ کیونکہ خیموں کے اتنے بڑے شہر میں کہیں بھی آگ دور دور
تک دکھائی نہیں دیتی۔ آپ کے خیمے میں چراغ کی روشنی دیکھی تو چلا آیا
ہوں۔

تو کیا ہوا بھائی۔ قریب آؤ اور آگ لے جاؤ۔

بہشتی نے لکڑی کے ایک ٹکڑے کو چراغ کے شعلے سے روشن کیا اور

آبدار خانہ شاہی میں پہنچا۔ پانی گرم کیا اور بادشاہ کو وضو کی خاطر پیش کیا۔ گویا
بادشاہ کے معمولات میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ آنے دیا۔

یہ واقعہ بڑا عجیب تھا۔ اتنے بڑے طوفان بادوباراں میں خیمہ کے اندر
چراغ کا جلتے رہنا، اسے حیران کر رہا تھا۔ اور پھر اس بے چارگی اور بے بسی
کے وقت اس خیمہ میں رہنے والے سپاہی کا تلاوت قرآن میں محو ہونا اسے
کسی بات کے سوچنے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ اسے کسی امر اتفاقی پر محمول نہیں
کرنا چاہتا تھا۔ بلکہ اس کا یقین اسے اس طرف لے جا رہا تھا کہ یہ سپاہی کوئی
عام سپاہی نہیں ہے، کوئی اللہ والا ہے۔ مگر یہ فیصلہ کرنے سے پہلے وہ اور بھی
بہت کچھ دیکھنے کا متمنی تھا۔

وہ صبح ہوتے ہی مشکیزہ کو کندھے پر ڈالے اس خیمہ کی جانب چل دیا۔
وہ جوں جوں رواں قدموں کے ساتھ خیمہ کی جانب بڑھتا تھا، اس کا
اضطراب اور بے قراری بڑھ رہی تھی۔ وہ صاحب خیمہ کے بارے میں جلدی
سب کچھ جان لینا چاہتا تھا۔

جب وہ خیمہ کے قریب پہنچا تو اسے وہ شخص نہ مل سکا۔ وہ یہاں موجود
ہی نہیں تھا اس نے ایڑیاں اٹھا اٹھا کر ارد گرد دیکھا مگر ہر بار مایوسی کے سوا
اسے کچھ حاصل نہ ہوا۔ آخر وہ قریب کے تالاب میں پانی لینے کے لئے چل
دیا کہ وہ خالی ہاتھ کیوں واپس جائے۔

جونہی وہ تالاب پر پہنچا اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ وہ جس
شخص کی تلاش میں تھا وہ اسی تالاب کے ایک کنارے پر وضو کرنے میں
مصروف ہے اس نے مکرر دیکھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ یہ وہی شخص
ہے اس کے ظاہری اور باطنی حواس نے اسے مکمل یقین دلا دیا کہ وہ کوئی

دھوکہ نہیں کھا رہا ہے۔ اسے گوہر مقصود حاصل ہونے میں خوشی تو بے حد ہوئی مگر اس سے کہیں زیادہ اس کی حیرانیوں میں اضافہ ہوا کہ اتنے ٹھنڈے اور یخ پانی میں یہ شخص کس اطمینان کے ساتھ وضو کر رہا ہے۔ وہ ایک کنارے پر چھپ کر بیٹھ گیا اور وضو کرنے والے کو دیکھنے لگا' اس نے وضو کیا۔ تالاب کے ایک گوشے میں نماز فجر ادا کی اور خیمہ کی جانب چل دیا۔

اس کے چلے جانے کے بعد بہشتی نے مشک میں پانی بھرنے کے لئے اسی جگہ کا انتخاب کیا جہاں سے اس شخص نے وضو کیا تھا۔ جونہی بہشتی کا ہاتھ پانی کو لگا تو اس کے دل و دماغ میں حیرانیوں کا ایک اور جہاں آباد ہو گیا۔ کہ سارا پانی تو برف کی طرح ٹھنڈا ہے مگر جہاں سے وضو کیا گیا وہ پانی اس قدر گرم تھا جیسے آگ پر گرم کیا گیا ہو۔ وہ ایک وقت تک سوچ اور فکر کے عالم میں ڈوبا رہا۔ وہ چاہتا تھا کہ دوسرے لوگوں کو اس کے بارے میں کچھ بتا دے مگر اس نے اس بات کو راز بنا لیا۔ بہرحال پھر بھی اس شخص کے بارے میں وہ کچھ جاننا ضرور چاہتا تھا۔ اس کے دل میں اشتیاق کی ایک اور کروٹ پیدا ہو گئی

اگلی شب وہ صبح ہونے سے پہلے ہی تالاب پر پہنچ گیا۔ اس نے تالاب کے پانی کو جگہ جگہ سے دیکھا۔ ہر جگہ اسے پانی منجمد ملا۔ پھر وہ ایک درخت کے نیچے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اچانک وہ شخص آیا، وضو کرنے کے لئے وہ تالاب کے جس کنارے کی طرف بڑھتا اس کنارے پر پانی ابلنے لگتا۔ آخر اس نے ایک جگہ پر وضو کیا۔ اور نماز ادا کر کے واپس خیمہ میں چلا گیا۔ بہشتی تالاب کے کنارے پر آیا، جہاں پر بیٹھ کر اس نے وضو کیا تھا۔ دیکھا تو پانی نہایت گرم تھا۔ اس نے گرم پانی کی مشک بھری اور آبدار خانہ شاہی میں چلا

آیا۔ اس بار اس نے ارادہ کر لیا کہ اس شخص کے مقام سے بادشاہ کو بتایا جائے تاکہ بادشاہ سے کسی شاہی ترنگ میں کوئی گستاخی نہ ہو جائے۔

ایک دن سلطان دربار عام میں جلوہ افروز ہوئے۔ تو وہ بھی پہنچا اور فریاد کرنے لگا۔ سلطان نے استفسار کیا تو عرض کی کہ اگر حضور خلوت میں میرے حالات سنیں تو عرض کر سکتا ہوں۔

بادشاہ نے اسی وقت تخلیہ کا حکم دیا جب تخلیہ ہو گیا اور تمام درباری الگ ہو گئے، تو اس نے تمام واقعات من و عن بیان کئے۔

سلطان تمام ماجرا سن کر سخت متحیر ہوا۔ اس نے بہشتی کو تو وہیں ٹھہرنے کا حکم دیا۔ اور خود اپنی قیام گاہ میں چلا گیا۔ رات کو بادشاہ نے بہشتی کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ اسے پچھلے پہر بیدار کر دے۔ بہشتی ساری رات نہ سویا اور پچھلے پہر کا انتظار کرتا رہا۔ آخر بادشاہ کو بیدار کرنے کا وقت قریب آیا، بہشتی نے بڑے احترام کے ساتھ بادشاہ کو بیدار کیا۔ بادشاہ اسی وقت بیدار ہو کر مسلح ہوا اور بہشتی کو ساتھ لے کر تالاب کی جانب روانہ ہوا۔ اور تالاب پر پہنچ کر بہشتی کی ایک ایک بات کی خود تصدیق کی۔ اور سب واقعات بچشم خود دیکھے۔ چنانچہ جب وہ شخص نماز پڑھ کر اپنے خیمہ میں چلا گیا، تو بادشاہ اور بہشتی دونوں اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ جب وہ خیمہ کے پاس پہنچے تو اس شخص کو قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول پایا۔

بادشاہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہ شخص خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی ہے۔ جو اس کی ملازمت میں ہے۔

اف! میں ان کے مقام کو نہ جان سکا۔ نہ جانے کتنی ہی گستاخیاں مجھ سے سرزد ہو گئی ہوں۔ بادشاہ اپنی رعایا سے اور اپنے لشکر سے کتنے بے خبر

ہوتے ہیں۔ وہ ہر شخص کو ایک عام آدمی سمجھتے ہیں۔ وہ خذف پاروں کے ڈھیر میں سے کیوں صدف پارے تلاش نہیں کر سکتے۔

بادشاہ انہیں خیالات میں مگن رہا۔ اور دیر تک دست بستہ کھڑا رہا۔

جب آپ تلاوت سے فارغ ہوئے، تو بادشاہ کی تعظیم اس انداز سے کی کہ وہ پہچان نہ سکے کہ ان کا روحانی دنیا میں بھی کوئی مقام ہے۔ اور بڑے تعجب سے پوچھا کہ۔

آپ جہاں پناہ! میرے دروازے پر! آپ حکم فرمایئے میں خود چلا آتا۔

نہیں حضرت جی شرمندہ نہ کریں۔ مجھے آپ کے روحانی مقام کا پتہ نہیں تھا۔ کیا خبر مجھ سے کیا کیا بھول ہوئی ہو گی۔ کبھی کسی گرم سرد لہجے میں بات نکل گئی ہو گی۔ کبھی آپ کے رتبے سے کم تر کوئی کام لے لیا ہو گا۔ ان ساری فروگزاشتوں کی معافی آپ سے چاہتا ہوں اور زہے نصیب کہ آپ جیسا ولی کامل میرے لشکر میں موجود ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ابھی تک قلعہ فتح نہیں ہوا۔

حضرت نے ہر چند اسے سمجھایا اور راز کو چھپانے کی کوشش کی لیکن واقعات ظاہر ہو چکے تھے، اس لئے سلطان برابر دعا کے لئے اصرار کرتا رہا۔ آخر کار مجبور ہو کر حضرت نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھایا۔ گڑگڑا کر دعا مانگی پھر تھوڑی دیر تک مراقبہ فرمایا اور سلطان سے کہا اگر تم قلعہ فتح کرنا چاہتے ہو تو جاؤ اسی وقت حملہ کر دو۔ فتح آپ کے مقدر میں لکھی جا چکی ہے۔

بادشاہ کی خوشی کی انتہا نہ رہی --- وہ واپس آیا۔ فوجوں کو ہتھیار بند کیا اور حملہ کر دیا۔

دشمن جو دو سال سے مدافعانہ جنگ کر رہا تھا اور شکست یا صلح پر رضا

مند نہیں ہوتا تھا اب مرنے مارنے پر تیار تھا۔ اتنے طویل محاصرہ کو وہ خود بھی توڑنا چاہتا تھا۔

سلطان غیاث الدین بلبن نے حملہ کیا تو دشمن کو بالکل بے خبر نہ پایا۔ اس نے بڑی زبردست مزاحمت کی۔ غیاث الدین بلبن کے سپاہی اگرچہ جانیں توڑ کر لڑ رہے تھے مگر قلعہ والے بھی غیاث الدین کی فوجوں کو بے بس کرنے پر تلے ہوئے تھے، وہ انہیں بھگا دینا چاہتے تھے۔

تیسرے پہر تک بڑا گھمسان کا رن پڑا کہ اچانک غیاث الدین بلبن کی فوج کے چند نوجوان فصیل تک پہنچے اور اسے توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے دشمن کو خبر ہونے سے پہلے جو سب سے پہلا کام کیا وہ قلعہ کے دروازہ کو کھولنا تھا۔

ادھر جونہی دروازہ کھلا دشمن کے حوصلے پست ہو گئے۔ سلطان کی فوجیں قلعہ کے اندر داخل ہو چکی تھیں۔ ان کی تلواریں اہل قلعہ کے ایک ایک فرد کا گلا کاٹنے لگیں، مردوں نے شور مچایا، بچوں کی چیخیں بلند ہوئیں، عورتوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ یہ ایک احتجاج تھا قلعہ والوں سے کہ ہتھیار ڈال کر صلح کر لی جائے اور ناحق اتنی جانوں کو تلف ہونے سے بچایا جائے۔ یہ احتجاج اس قدر شدت اختیار کر گیا کہ قلعہ والوں کی فوجیں بالکل بے دل ہو گئیں۔ آخر شکست تسلیم کر لی گئی۔ اور غیاث الدین بلبن جو دو سال سے قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، اس کا یہ ایک دن کا حملہ اس قدر کامیاب ہوا کہ وہ فتح سے ہمکنار ہوا۔

اس کامیابی میں مال و زر، کنیزوں اور اسلحہ کے علاوہ عمدہ نسل کے گھوڑوں کی ایک کثیر تعداد ہاتھ لگی۔

سلطان غیاث الدین بلبن کو اس کامیابی میں بے پناہ مسرت ہوئی۔ اور اس نے ارادہ کیا کہ وہ برہنہ پا اور برہنہ سر حضرت کی خدمت بابرکت میں حاضر ہو کر قلعہ سے حاصل ہونے والے مال و متاع کا ایک وافر حصہ ان کی خدمت میں پیش کرے۔

مگر ادھر حضرت خواجہ شمس الدین ترک پانی پتی کو کشف کے ذریعے بادشاہ کے اس ارادے کا علم ہوگیا۔ آپ نے اپنا سارا مال و متاع اسباب اور اثاثہ زندگی غرباءؔ اور فقراء میں تقسیم فرمایا اور خود کمبل اوڑھ کر لشکر سے چل کھڑے ہوئے اور اپنے پیر کی قدم بوسی حاصل کی وہاں چند دن قیام فرمایا اور پیرو مرشد کے حکم کے مطابق پانی پت میں تشریف لے آئے اور اس سرزمین کے ایک ایک ذرے کو نور ولائت سے معمور فرمانے لگے۔

حوالہ کے لئے:

تذکرہ خاصان خدا — از مصطفائی بیگم

تاریخ فرشتہ — از محمد قاسم فرشتہ

ماہ نامہ نورِ اسلام

شرق پور شریف، اگست ۱۹۹۰ء

جنت کا مکان

★ مجذوبیت کے روپ میں ولایت الٰہیہ

★ لوگوں کے تمسخر کا نشانہ بننے والا صاحبِ کرامت ولی

★ مجذوب لوگوں کے کاموں پر تنقید نہیں کرنی چاہیے۔

★ حضرت بہلول دانا کا مقام

حضرت بہلول رحمتہ اللہ علیہ ایک نہایت سادہ لوح اور مجذوب انسان تھے۔ آپ کوفہ میں پیدا ہوئے۔ وہیں جوان ہوئے اور ہارون الرشید کے عہد میں بغداد میں آئے۔ ان کی مجذوبیت کی بنا پر انہیں مجذوبوں کا سلطان بھی کہتے ہیں۔ راستہ چلنے والے سوقیانہ قسم کے لوگ ان کا تمسخر اڑایا کرتے تھے۔ مگر وہ بذات خود کسی کے تمسخر کا برا نہیں مناتے تھے۔ بہلول کی یہ مجذوبیت اپنی جگہ مسلم مگر ان کی باتیں حکمت سے پر ہوتی تھیں۔ اسی وجہ سے انہیں بہلول دانا کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔

بہلول دانا نے خلیفہ بغداد ہارون الرشید کا عہد پایا اور وہی ان کو کوفہ سے بغداد لایا۔ بغداد میں انہوں نے وفات پائی اور یہیں مدفون ہوئے۔

ہارون کو اپنی بیوی زبیدہ خاتون سے بے پناہ محبت تھی۔ وہ اس کی ہر بات مان لیتا تھا۔ یہاں تک کہ نہر زبیدہ کے کروڑوں کے اخراجات زبیدہ کی خواہش پر پورے کئے گئے مگر اف تک نہ کی۔ یہی وجہ تھی کہ زبیدہ خود بھی

بعض اوقات خرچ کر لینے میں ہارون الرشید سے پوچھنا ضروری خیال نہ کرتی تھی۔

ایک دن صبح صبح، موسم بڑا سہانا تھا۔ بغداد کی فضا میں بادل گھرے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ زبیدہ خاتون کوٹھے کی چھت پر کھڑی دور تک دیکھ رہی تھی اور خوش ہو رہی تھی اچانک ہارون الرشید گھر میں داخل ہوا۔ آج کے سہانے موسم نے اس کی امنگوں میں حسین رنگ بھر دیئے تھے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر زبیدہ نظر نہ آئی۔ اس نے زور سے آواز دی۔

"زبیدہ۔ اری زبیدہ تو کہاں گئی۔" زبیدہ نے چھت سے آواز دی "میں کوٹھے پر ہوں۔ آ جاؤ اور موسم کی فضاؤں کا نظارہ کرو۔" ہارون بھی اوپر کوٹھے پر چلا گیا۔ دونوں نے چاروں طرف دیکھا حد نگاہ تک سارے درخت جھومتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے فضا میں تیرتے ہوئے بادل بھی دیکھے۔

"ہارون! جی چاہتا ہے ان دور کے بادلوں تک سیر کو نکل جائیں۔ دجلہ کے کنارے پر ذرا گھومیں۔ وہاں کشتی کی سیر بھی کریں گے۔" زبیدہ نے کہا۔

ہارون نے کبھی زبیدہ کی کوئی بات رد نہیں کی تھی۔ بھلا یہ معمولی سی خواہش وہ کیسے ٹھکرا سکتا تھا۔ ہارون الرشید اسی وقت زبیدہ کے ساتھ سیر کو جانے کے لئے تیار ہو گیا۔

خادم کو حکم دیا گیا کہ دو گھوڑوں پر زین کس کر تیار کر دے۔

تھوڑی دیر کے بعد خادم نے اطلاع دی کہ سفید رنگ کے دو گھوڑے بالکل تیار ہیں۔ اس اثناء میں ہارون الرشید اور زبیدہ دونوں سیر کے لئے تیار ہو چکے تھے۔

گھوڑوں پر دونوں سوار ہوئے۔ کہ خادم نے آگے بڑھ کر سر کو جھکا دیا۔

"ہارون نے پوچھا کیا بات ہے-؟

"تلوار، تیر، کمان اور ترکش کو آپ بھولے جا رہے ہیں۔"

"نہیں! ہم شکار کے لئے نہیں جا رہے ہیں۔ محض تھوڑی دیر کے لئے سیر کو جائیں گے۔ ان ہتھیاروں کی ضرورت نہیں ہے-"

تاہم خادم نے آگے بڑھ کر تلوار پھر بھی پیش کر دی اور عرض کی "تلوار تو مرد کا زیور ہے۔ اسے ساتھ لے جانا نہ بھولئے۔"

ہارون الرشید نے خادم کی بات مان لی اور تلوار ساتھ لے لی۔ پھر دونوں میاں بیوی بغداد کی باہر دنیا کی سیر کو نکلے ــــ نوکر چاکر ساتھ تھے۔ نگران کو ہدایت تھی کہ بہت پیچھے پیچھے آئیں اور جہاں ہم رک جائیں وہاں تم نے بھی رک جانا ہے آگے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دونوں کے گھوڑے برابر ہو کے چل رہے تھے۔ زبیدہ اتنی ہشاش بشاش اور خوش تھی کہ ہارون اسے بار بار دیکھتا۔ جونہی وہ دجلہ کے کنارے پر پہنچے۔ وہ رکے، گھوڑوں سے نیچے اترے۔ انہیں گھاس چرنے کے لئے چھوڑ دیا اور خود پیدل دریا کے کنارے اوپر کی طرف چلنا شروع کیا۔

اچانک ان کے کان میں آواز پڑی کہ ــــ "جنت کے مکان لے لو۔ جنت کے مکان لے لو۔" زبیدہ نے اپنے کان کھڑے کئے اور آواز غور سے سننے لگی۔

"ہارون یہ آواز تم بھی سن رہے ہو؟" زبیدہ نے ہارون سے کہا۔ "آؤ چلیں جنت کے مکانوں کی منڈی کو دیکھیں۔"

اب دونوں میاں بیوی نے ادھر چلنا شروع کر دیا جدھر سے جنت کے

مکانوں کے لئے آوازیں آ رہی تھیں ---- جوں جوں یہ آواز کے قریب ہوتے گئے، آواز مدھم ہوتی گئی۔ آخر آواز تو بند ہو گئی مگر ایک سایہ حرکت کرتا ہوا انہیں دکھائی دینے لگا۔

قریب پہنچے اور دیکھا کہ حضرت بہلول بچوں کا کھیل کھیل رہے ہیں اور ریت کے گھروندے بنا رہے ہیں ---- مناسب فاصلوں پر ریت کے کتنے ہی گھروندے بنے ہوئے تھے۔ درمیان میں گلیوں اور بازاروں کے لئے جگہ چھوڑی گئی تھی۔

"لو بھئی! یہ وہ مکان جو جنت میں مسلمانوں کو ملیں گے۔ واہ بہلول تم تو سچ مچ کے مجذوب ہو۔ اللہ کی جنت کا مذاق اڑا رہے ہو۔" ہارون نے کہا۔

مگر بہلول نے اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ برابر ہر تین چار منٹ میں ایک ایک گھروندا بناتے چلے گئے۔

زبیدہ آگے بڑھی۔ پوچھا۔

"میاں بہلول! یہ کیا کر رہے ہو؟"

"اری پگلی! یہ جنت کے مکان ہیں لینا چاہو گی؟"

ہاں! کتنے میں ایک مکان ملے گا۔"

لاؤ ایک لاکھ دینار دے دو۔ ایک لاکھ دینار میں یہ مکان تمہیں مہنگا نہیں پڑے گا۔ سستا ہے بالکل سستا ہے۔ نہ لوگی تو پچھتاتی رہو گی۔"

زبیدہ نے پوچھا "کونے کے مکان میں اور بیچ کے مکان کی قیمت میں کوئی فرق تو نہیں ہے؟"

بالکل کوئی فرق نہیں ہے۔ جلدی کرو اور مکان اپنے نام کروا لو۔"

زبیدہ نے ہارون کی طرف دیکھا۔ ہارون چلے جانے کا اشارہ کر رہا تھا مگر

زبیدہ مکان لینے کا تقاضا کرنے لگی۔

"زبیدہ تم بھی اس پگلے کی طرح پگلی ہوئی جا رہی ہو۔ بھلا جنت میں مکان ایسے ہوں گے ۔ آؤ چلیں اور اس سہانے موسم کی سیر کا لطف اٹھائیں۔"

مگر زبیدہ نہ مانی ---- اس نے ایک لاکھ دینار بہلول دانا کے آگے ڈھیر کر دیئے اور عرض کیا " یہ لو بہلولجنت کے مکان کی قیمت اور ایک مکان میرے نام کر دو۔"

"آپ نے جونسا مکان لینا ہے اس پر پاؤں رکھ کر گرا دو۔ وہی آپ کا مکان ہو گیا۔"

زبیدہ نے ان مکانوں کی رووں میں سے تیسری رو کا پہلا مکان پسند کیا اور اس پر پاؤں رکھ کر گرا دیا۔

بہلول ہنسا۔ "واہ واہ زبیدہ! کتنا اچھا مکان آپ نے پسند کیا ہے۔ جاؤ جنت میں اسی رو کا پہلا مکان ہی آپ کے نام ہو گیا۔"

زبیدہ نے ہارون سے کہا " آؤ واپس چلیں بڑی دیر ہو گئی ہے" مگر ہارون تو روٹھ گیا تھا۔ وہ ناراض تھا کہ ریت کے گھروندے کی خاطر خواہ مخواہ اس نے ایک لاکھ دینار اس مجذوب کو دے دیئے ہیں۔

"ہارون تمہیں یہ سودا پسند نہیں تھا تم نے نہیں خریدا ---- مجھے پسند تھا میں نے خرید لیا ---- اس میں ناراض ہونے کی کون سی بات ہے ---- میرے جذبے کی قدر کریں۔ میں چاہتی ہوں کہ میرا جنت میں گھر ہو۔ اگر وہاں ریت کا ایسا گھروندا ہی مجھے مل گیا تو زہے نصیب۔"

"اللہ کی بندی! خدا تیری عقل کو قائم رکھے۔ لاکھ دینار ضائع کر کے پھر

بھی اپنے فیصلے پر اڑتی ہو۔ بھلا یہ ریت کے گھروندے جنت کے مکان کیسے
بن گئے۔؟ اور پھر بہلول جیسا مجذوب شخص اتنی رقم کو کیا کرے گا؟ ضائع ہی
تو کر دے گا۔ تو نے بے قدرے شخص کو ایک لاکھ دینار دے دیا --- وہ بے
قدرے لوگوں میں بانٹ دے گا۔"

"ہارون! مجھے ایسی باتوں سے تنگ نہ کرو۔ اگر تمہیں اس رقم کا بہت
ہی غم ہے تو جب تک آپ کا لاکھ دینار پورا نہیں ہوتا اس وقت تک میرا
روزینہ بند کر دو۔"

ہارون نے زبیدہ کی طرف دیکھا تو مسکرا اٹھا --- "اچھا بابا معاف کر
دو۔ کیوں ناراض ہوتی ہو۔ اللہ کرے آپ کو جنت میں محل مل جائے۔"

دونوں بڑے خوش گوار مزاج کے ساتھ سیر کو گئے تھے۔ مگر جب گھر میں
واپس آئے تو زبیدہ کا دل ہارون کی باتوں سے دکھی تھا۔ اور ہارون بذات خود
طبیعت میں گرانی محسوس کرتا ہوا آیا تھا۔ رات کو سونے سے پہلے نہ زبیدہ
نے ہارون کی باتوں میں دلچسپی لی اور نہ ہی ہارون نے زبیدہ کی باتوں میں۔ بس
ناراض ناراض سے اور کھوئے کھوئے سے رہے۔ تاہم خواب گاہ میں جانے
سے پہلے دونوں اپنی باتوں کو زیادتی سمجھتے ہوئے پچھتا رہے تھے۔ بہر حال
پچھتاوا کوئی اس قسم کا بھی نہیں تھا کہ دونوں میں علیحدگی ہو جائے۔ زبیدہ کو
اپنی صداقت پسندی پر اعتماد تھا کہ ہارون ضرور اس کی طرف توجہ کرے گا اور
ہارون کو یقین تھا کہ اس نے زبیدہ کے بارے میں کوئی ہتک آمیز بات نہیں
کی۔ زبیدہ خود بخود اس کی طرف رجوع کرے گی۔ مگر دونوں کے خیال پورے
نہ ہوئے۔ دونوں ہی نیند کی آغوش میں آرام کرنے لگے۔

جونہی ہارون کو نیند آ گئی وہ خوابوں کی دنیا میں کھو گیا۔ ایک خواب ایسا

سہانا آیا جس کے مناظر بیان سے باہر ہیں۔ وہ باب الجنت میں سے گزرا اور
جنت کی سیر کرنے لگا۔ حور و غلمان کے جلو اس کے استقبال کو بڑھے۔
ہر طرف سے آواز آ رہی تھی۔

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خٰلِدِيْنَ

"سلام ہو تم پر۔ شاد رہو۔ آباد رہو۔ داخل ہو جاؤ اس میں ہمیشہ کے
لئے" اور فرشتے فرما رہے تھے۔

سَلَامٌ عَلَيْكُمُ ادْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ

"سلامتی ہو تم پر داخل ہو جاؤ جنت میں اپنے نیک اعمال کی بدولت۔"

ہارون الرشید جدھر نظر اٹھاتا، اسے گھنے سائے دکھائی دیتے ہیں۔ ان
سایوں میں مسندیں لگی ہوتی ہیں۔ پاکیزہ عورتیں ان مسندوں پر بیٹھی ہیں۔
قسم قسم کے لذیذ کھانے اور چیزیں ان کے لئے وہاں موجود ہیں جس چیز کی وہ
خواہش کرتی ہیں آ موجود ہوتی ہے اور یہ آواز بھی اسکے کان میں پڑتی ہے۔

سَلَامٌ قَوْلًا مِّنْ رَّبٍّ رَّحِيْمٍ

"رب رحیم کی طرف سے ان کو سلام کہو۔"

دودھ اور شہد کی نہریں دور تک بہتی دکھائی دے رہی تھیں۔ بھینی بھینی
خوشبو نے ساری جنت کو معطر کر رکھا تھا۔ درخت جھوم جھوم کر یہاں کے
باسیوں کے پاؤں چوم رہے تھے۔ پھر سونے اور چاندی کی قطاریں شروع ہو
گئیں۔

ہارون جونہی تیسری قطار پر پہنچا تو اس کی حیرانی کی انتہاء نہ رہی کہ
تیسری قطار کے پہلے مکان پر لکھا تھا۔

هٰذَا الْبَيْتُ لِزُبَيْدَةَ زَوْجَتِهٖ هَارُوْنَ الرَّشِيْد

یہ گھر ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ خاتون کا ہے۔

ہارون الرشید جو کچھ دیکھ رہا تھا اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں کو ملا۔ آنکھوں کا گرد و غبار نکالا اور پھر غور سے دیکھا کہ یہ مکان زبیدہ کا کیسے بن گیا۔؟

اگر زبیدہ کا ہے تو کیا میری زبیدہ کا ہے۔ اسے کامل یقین ہو گیا کہ یہ مکان میری ہی زبیدہ کا ہے ۔ صاف لکھا ہوا ہے کہ یہ زبیدہ خاتون زوجہ ہارون الرشید کا مکان ہے۔ وہ جلدی سے صدر دروازے کی سیڑھیوں پر چڑھا اور اندر داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا۔

دروازے پر اس مکان کا داروغہ کھڑا تھا۔ اس نے ہارون کو روک دیا کہ آپ اس مکان میں داخل نہیں ہو سکتے۔

ہارون حیران ہو کر کھڑا ہو گیاہ کہ اس مکان میں داخل ہونے سے کیوں روک دیا گیا ہے۔ وہ تو ہر حال میں مکان کے اندر کے مناظر کو دیکھنے کا متمنی تھا۔ چاہتا تھا کہ جس مکان کے باہر کے ماحول کے نظارے اس قدر حسین، دلکش اور دلفریب ہیں اس کے اندر کے نظارے ان سے کہیں زیادہ بڑھ کے ہوں گے۔

ہارون نے داروغہ مکان سے پوچھا "کیا یہ ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ خاتون کا مکان نہیں ہے۔"

"ہاں ہے۔" داروغہ نے اثبات میں سرہلایا۔

"تو میں ہی ہارون ہوں۔ زبیدہ میری بیوی ہے۔ مجھے اندر جانے دو مکان کی سیر کرنے دو۔ مجھے کیوں روکتے ہو۔"

"بے شک زبیدہ آپ کی بیوی ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ

یہ مکان آپ کی ہی زبیدہ کا ہے۔ مگر آپ کا داخلہ اس میں ممنوع ہے۔ آپ کا میاں بیوی کا رشتہ اس دنیا تک ہے۔ یہاں ایمان اور یقین والے لوگ اور نیک اعمال والے لوگ ہی آتے ہیں۔ اور ان میں باہمی تعلقات و روابط پھر سے شروع ہوتے ہیں۔

ہارون کی بے قراری میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس نے داروغہ کے آگے ہاتھ باندھ دیئے۔ منتیں کرنے لگا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ سارے مناظر اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئے۔ اس کا کیف و سرور یکدم محو ہو گیا۔ پہلے اس دنیا کے دیکھنے پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ اب اسے اس دنیا پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

اس کی نیند مستقل طور پر غائب ہو گئی۔ اس نے بقیہ رات کروٹیں لے لے کر گزار دی۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر وہ سیدھا دجلہ کے کنارے کی طرف نکل گیا۔ حضرت بہلول رحمتہ اللہ علیہ کو دیکھا وہ اسی طرح ریت کے گھروندے بنا رہے ہیں اور یہی فقرہ ان کی زبان پر محو رقص ہے کہ "جنت کے مکان لے لو۔ جنت کے مکان لے لو۔"

ہارون خوش ہو گیا کہ ابھی تک جنت کے مکان بک رہے ہیں۔ جنت کے مکانوں کی منڈی لگی ہوئی ہے۔ اور حضرت بہلول رحمتہ اللہ علیہ مکان پر مکان بناتے جا رہے ہیں۔

ہارون نے آگے بڑھ کے پوچھا۔

"بہلول کیا واقعی جنت کے مکان ہیں؟"

بہلول رحمتہ اللہ علیہ نے ہارون کی طرف دیکھا اور فرمایا "دیکھ بھی آئے ہو پھر بھی یقین نہیں آیا؟"

"بہلول ! ایک مکان مجھے دے دو۔ مکان کی قیمت کیا رکھی ہے؟ تیسری قطار کا دوسرا مکان میرے لئے مناسب رہے گا۔ رکھ دوں اس پر پاؤں۔"

"نہیں ہارون! مکان کی قیمت تو کل والی ایک لاکھ دینار ہی ہے مگر ہم یہ سودا دکھا کر نہیں کرتے ---- انسان کو غیب کی باتوں پر یقین آنا چاہئے۔ فرشتے 'کتابیں' آخرت' قیامت' اور دوزخ و جنت کے ہونے پر اس کا ایمان پختہ ہونا چاہئے۔ ولی اللہ کی باتوں پر اس کا یقین ہونا چاہئے۔"

"جاؤ اب خیر خواہی کے کام کرو۔ رعایا کے ٹیکس اور محصول معاف کر دو۔ ظالم کے ہاتھ کو روکو' مظلوم کی گردن بچاؤ بے انصافی کو ختم کرو اور عدل کا نظام قائم کرو۔ آپ کو یقیناً" جنت مل جائے گی۔"

ہارون نے لاکھ منتیں کیں۔ ایک لاکھ دینار کی ڈھیری حضرت بہلول کے آگے کر دی۔ پھر دو لاکھ رکھ دیئے۔ حضرت بہلول نے پاؤں کی ایک ٹھوکر سے انہیں اڑا دیا۔ ---- ہارون آپ کے قدموں میں گر گیا۔ ہاتھ باندھے روتا رہا۔ اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی۔ وہ زمین پر گر گیا۔ جب اسے ہوش آیا تو دیکھا کہ حضرت بہلول رحمتہ اللہ علیہ وہاں موجود نہیں ہیں۔ حسرت ویاس کی کیفیت لے کر ہارون اٹھا اور لڑکھڑاتے قدموں سے اس نے بغداد کے محلات کی طرف بڑھنا شروع کر دیا۔

حوالہ کے لئے

شان ولایت از مولانا غلام رسول صاحب چشتی

دیگر امدادی کتب: دائرہ المعارف' پنجاب یونیورسٹی لاہور

تاریخ فرشتہ' از محمد قاسم فرشتہ

ماہ نامہ نور اسلام شرق پور شریف جون ۱۹۹۱ء

بیعت

☆ بیعت لینے سے بیعت لینے والے کی خوبیاں لوگوں پر عیاں ہو جاتی ہیں۔

☆ اللہ والے کسی غلط آدمی کے ہاتھ پر بیعت نہیں کرتے۔

☆ حکمرانوں کو ان کے اشغالِ شراب نوشی عوام سے غافل کر دیتے ہیں۔

☆ اہل اللہ حکمرانوں کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوتے۔

سلطان علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا سلطان محمد شاہ دکن کے تخت پر بیٹھا۔ محمد شاہ نہایت درجہ عقلمند اور سخی حکمران تھا۔ اس حکمران نے سامان شان و شوکت اور لوازمات سلطنت کو مہیا کرنے میں بڑی ایمانداری سے کوشش کی۔

دکن میں یہ چیز رواج پا گئی تھی کہ موجودہ حکمران سابقہ حکمران کے تخت کو اولاً" سجدہ کرتا ازاں بعد اس تخت پر بیٹھ کر امور سلطنت کو انجام دیتا۔ سلطان محمد شاہ کو اسی رسم کے مطابق پہلے اپنے باپ سلطان علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی کے تخت کو جو چاندی کا بنا ہوا تھا' پہلے سجدہ کرنا پڑتا اور پھر تخت پر بیٹھ کر سلطنت کے کام کرنے پڑتے۔

بادشاہ چونکہ غیرت مند تھا اور جانتا تھا کہ سجدہ سوائے خدا کی ذات کے

شرک ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اس مشرکانہ رسم کو ختم کر دے، مگر ڈرتا تھا کہ
کہیں امرائے سلطنت بگڑ نہ جائیں۔اور دکن کی حکومت اس کے ہاتھ سے
نکل نہ پائے ---- ایک طرف شرک کا احساس اور دوسری طرف حکمرانی
سے محرومی کا خدشہ اسے بے حد پریشان کئے ہوئے تھا۔

ایک دن ایک بیل گاڑی پر تلنگانہ کے راجہ نے فیروزہ کا ایک
خوبصورت تخت بادشاہ کی خدمت میں بھیجا --- تخت واقعی قابل دید تھا۔
---- یہ تخت جب ایوان شاہی میں سجایا گیا تو اکثر امراء نے اس کی بے حد
تعریف کی ---- اگر یہ تخت اس قدر تعریف کے قابل نہ بھی ہوتا پھر بھی
بادشاہ کی الجھن کو دور کرنے کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

بادشاہ نے فوراً باپ والا چاندی کا تخت ایک کونہ میں رکھوایا اور اس
فیروزہ کے تخت کو دیوان خانہ میں رکھا ---- اب بادشاہ کے لئے تخت کو
سجدہ کرنا ضروری نہ تھا۔ اس طرح بادشاہ تخت پوجا کی رسم سے بچ گیا۔

اسی دوران محمد شاہ کی والدہ ماجدہ جو ملکہ جہاں کے نام سے متعارف
تھی، حج کرنے کی غرض سے سفر حجاز پر روانہ ہوئی۔ ملکہ نے اپنے رشتہ
داروں کے علاوہ آٹھ سو کے قریب غریب اور محتاج عورتیں اپنے ہمراہ لیں
اور صدر الشریف کو ہدایت کی کہ وہ تمام مسافروں کا نگران اور اخراجات کا
ذمہ دار ہے اور ہمسفروں سے بھی کہہ دیا کہ انہیں جس قسم کی ضرورت پیش
آئے وہ ملکہ جہاں کے آدمیوں سے پوری کریں۔

ہر فرد و بشر نے بیت اللہ کا طواف کیا۔ غریبوں، محتاجوں اور مستحقین کو
انعامات سے نوازا گیا اور ملکہ نے اپنے لئے آخرت کا بہتر سامان مہیا کیا۔ اس
کے بعد ملکہ مدینہ منورہ پہنچیں۔ زیارت روضہ رسول سے آنکھوں کی پیاس

بجھائی اور سینے میں ٹھنڈک لی۔ ملکہ جہاں نے یہاں کی چار ہزار غریب کنواری
لڑکیوں کی شادیاں کیں۔

قیام مدینہ منورہ کے دوران میں ملکہ حضرت فاطمۃ الزہرہ رضی اللہ تعالیٰ
عنہا کے مزار پر روزانہ حاضر ہوتیں۔ ایک دن ملکہ نے پوچھا کہ نواسہ رسول،
جگر گوشہ بتول حضرت امام حسین رضی اللہ تعالی عنہ کا مزار کہاں ہے؟
بتانے والے (صدر الشریف) نے بتایا کہ سید الشہداء کا مدفن کربلا میں ہے
---- ملکہ حیران ہوئیں کہ ماں اور بیٹے کے مزارات میں اتنی دوری کیوں؟
کہ فاطمۃ الزہرہ کا مزار یہاں مدینہ منورہ میں اور حضرت امام حسین کا مزار
کربلا میں۔ آخر اس کا سبب کیا ہوا؟

صدر الشریف نے بتایا کہ یزید کی فوجوں کے ساتھ حضرت امام حسینؓ کی
لڑائی کربلا کے میدان میں ہوئی تھی ---- آپ اس میدان میں اپنے اعزہ و
اقربا یہاں تک کہ شیر خوار بچوں کے ساتھ شہید کر دیئے گئے تھے۔

آخر کیوں؟ حضرت امام حسین نے یزید کا کیا بگاڑا تھا؟

صدر الشریف نے عرض کیا کہ آپ نے یزید کی بیعت کرنے سے انکار
کر دیا تھا۔ یہ تو انہوں نے اچھا نہ کیا۔ اپنے حکمران کی بات نہ مانی مگر اس
انکار کی آخر کوئی معقول وجہ تو ہو گی۔

صدر الشریف نے مزید بتایا کہ حضرت امام حسین یزید کو خلیفۃ المسلمین
بننے کے اہل نہیں سمجھتے تھے۔ وہ فاسق و فاجر تھا۔ وہ شراب پیتا تھا ----
حضرت امام حسین کا موقف یہ تھا کہ عوام کے حقوق سے غافل رہنے والا
عوام کا حاکم نہیں ہونا چاہئے ---- یزید کے فسق و فجور اور شراب پینے کی
عادتیں غفلت میں مبتلا کرنے والی تھیں۔

اگر یہ بات ہے تو انہوں نے بہت اچھا کیا۔ ہمیں ان کے مزار اقدس کی بھی زیارت کرنی چاہئے ----- میں اپنے بیٹے محمد شاہ سے بھی کہوں گی کہ وہ بھی عوام سے بیعت لے تاکہ عوام کی نگاہ میں محمد شاہ میں جو خامیاں ہیں وہ اس کی بیعت سے انکار کرنے والے دوسرے لوگوں کو بتائیں۔

چنانچہ ملکہ جب ایک سال کے بعد اس سفر حجاز سے واپس تشریف لائیں۔ آتے ہی اس نے محمد شاہ سے کہا کہ وہ اپنی حکمرانی کی بیعت عوام سے لے تاکہ پتہ چلے کہ لوگ اس کی حکمرانی کے حق کو تسلیم کرتے ہیں یا رد کرتے ہیں۔

محمد شاہ کو بڑا اعتماد تھا کہ اس کی بیعت کرنے سے کون انکار کرے گا۔ اس نے ماں سے وعدہ کیا کہ وہ ضرور ایسا ہی کرے گا۔ ---- پورے ملک میں سلطان محمد شاہ بہمنی کی بیعت کی تحریک چلی۔ پھر لوگوں نے دھڑا دھڑ بیعت کرنی شروع کر دی۔ بادشاہ کے کارندوں، وزیروں، مشیروں اور امیروں نے کوئی ناخوشگوار واقع نہ ہونے دیا ---- عالموں اور دین دار لوگوں نے بھی محمد شاہ کی ذات پر اعتماد کیا اور بیعت کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کی۔

مگر ایک شام محمد شاہ کو جب بیعت کے سلسلہ کی خبریں سنائی جا رہی تھیں تو اسے بیعت نہ کرنے کی بھی ایک خبر سنائی گئی ---- بادشاہ اس خبر پر چونکا۔ کہنے لگا کیا غضب ہوا، وہ کون ہے جس نے میری بیعت سے انکار کر دیا ہے؟ ---- بتایا گیا کہ یہ شخصیت جس نے بیعت کرنے سے انکار کیا ہے حضرت شیخ برہان الدین غریب ہیں۔

حضرت شیخ برہان الدین غریب، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے قدیم مرید اور خلیفہ تھے۔ آپ نے زندگی بھر حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی

خانقاہ کی طرف پشت نہیں کی۔ حضرت شیخ نصیر الدین محمود چراغ دہلوی جب بھی دہلی میں تشریف لاتے تو وہ آپ کے ہی گھر میں قیام فرماتے تھے --- حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے وصال کے بعد آپ دولت آباد میں تشریف لے آئے۔ اس وقت آپ بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔

حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید و خلیفہ ہونے اور اپنی پاکیزہ روش کے باعث عوام میں بڑے مقبول و محترم تھے۔ خود محمد شاہ بھی آپ کی بارگاہ میں کئی بار آ چکا تھا۔

مگر آج جب محمد شاہ نے سنا کہ حضرت صاحب نے بیعت سے انکار کر دیا ہے تو بڑا حیران ہوا۔ وہ چاہتا تھا کہ ملک کے دیگر ایسے پاکیزہ لوگوں کو اس انکار کی خبر ہونے سے پہلے پہلے آپ سے بیعت لے لے۔ اس نے آپ کو بلانے کے لئے اپنے معتمد بھیجے مگر حضرت صاحب نے دربار شاہی میں آنے سے انکار کر دیا۔ معتمدین نے اپنی طرف سے لالچ بھی دیئے اور ناخوشگوار حالات کے پیدا ہونے کے خدشہ کا اظہار بھی کیا مگر آپ نے فرمایا۔ میاں! میں بوڑھا، محمد شاہ کی راہ کا کانٹا نہیں بنوں گا۔ جاؤ! اسے کہو! ایمانداری سے لوگوں کے حقوق کی حفاظت کرے۔ ----- رہی بیعت کرنے کی بات وہ مجھ سے نہیں ہونے کی۔ کیونکہ میرے نزدیک وہ منصب حکومت کا اہل نہیں ہے۔

یہ لوگ محمد شاہ کی نااہلی کی بات سن کر حیران رہ گئے اور ناکام واپس لوٹے۔ محمد شاہ اس انکار پر بہت ہی ناراض ہو گیا۔ اور کہلا بھیجا کہ وہ یا تو میرے دربار میں حاضر ہو جائیں یا پھر میرے ہاتھ پر بیعت کریں ---- اس کے جواب میں حضرت صاحب نے یہ روایت لکھ کر بھیجی کہ:

ایک بار تین شخص جن میں سے ایک مخنث ' ایک عالم دین اور ایک سید تھے، تینوں ایک ہندو کے ہاتھوں گرفتار کر لئے گئے۔ اس نے ان لوگوں سے درخواست کی کہ وہ بت کو سجدہ کریں۔ اب سید اور عالم دین نے سجدہ کر لیا مگر مخنث نے سوچا کہ میں نہ عالم دین ہوں کہ گناہوں کا کفارہ دے دوں نہ دانش مند اور سید ہوں کہ خدا کو پھر راضی کر لوں گا، لہٰذا اس نے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ میری کیفیت بھی مخنث کی سی ہے۔ میں ہر طرح کے مظالم برداشت کرنے کو تیار ہوں مگر نہ تمہارے دربار میں حاضری دے سکتا ہوں اور نہ تمہارے ہاتھ پر بیعت کر سکتا ہوں۔

یہ پیغام بادشاہ کو پہنچا تو وہ سیخ پا ہو گیا۔ بڑے غصے سے آپ کو کہا کہ اگر ایسا ہے تو ابھی اور فوراً شہر سے نکل جائیں۔ آپ نے مصلّٰی شانہ پر ڈالا اور چل کھڑے ہوئے۔ بادشاہ کو پتہ چلا تو حضرت کے جلال کو سمجھ کر شرمندہ ہوا اور صدر الشریف کے ہاتھ یہ مصرعہ لکھ کر بھیجا کہ

من زاں توام تو زاں من باش

اور عرض کیا آپ نہ جائیں میں خود حاضر ہو رہا ہوں۔

دوسرے دن محمد شاہ گلے میں پٹکا ڈالے حضرت خواجہ برہان الدین غریب کے دروازے پر کھڑا تھا۔ بادشاہ اپنے ساتھ کسی کو لے کر نہیں گیا تھا مگر اسے اس حالت میں دیکھنے والے جمع ہوتے گئے اور ہجوم بیکراں اکٹھا ہو گیا۔

بادشاہ نے بار بار دستک دی مگر حضور نے دروازہ نہ کھولا۔ آخر بادشاہ نے آپ کی چوکھٹ پر اپنا سر رکھ دیا۔ پھر اچانک دروازہ کھلا، حضور تشریف لائے انہوں نے بادشاہ کے سر کو اٹھایا۔

محمد شاہ! یہ سر صرف خدا کے آگے جھکنے کے لئے ہے ----- میں تو

ایک عاجز بندہ ہوں میری چوکھٹ کو سجدہ گاہ نہ بناؤ۔

نہیں حضرت! مجھے میری گستاخیاں معاف فرما دیں۔ میں آپ کے مقام سے بے خبر تھا۔ آپ کی عظمت کے اعتراف میں سر تسلیم خم کر رہا ہوں۔ دیگر لوگوں نے بخوشی میری بیعت کی ہے مگر آپ کے انکار نے مجھے شرمندہ کر دیا ہے۔ میں اس خامی کی نشان دہی چاہتا ہوں، جس کے باعث مجھے شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑا ہے۔

حضور نے فرمایا۔ محمد شاہ! تمہارا شغل شراب و کباب اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ آپ مسلمانوں کے معاملات زندگی کی نگرانی کریں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ تخت پر بیٹھنے کے قابل وہ ہے جو اسلام اور شرع کی پوری پوری پابندی کرتا ہے۔ جن اشغال سے تم دل بہلاتے ہو، ان سے رعایا کو باز نہیں رکھ سکو گے۔ اس طرح تمہاری رہنمائی اور سرپرستی سے ان لوگوں کو فائدہ پہنچے گا جو اسلامی طرز زندگی کو پامال کرتے ہیں۔

بادشاہ نے اسی دن دربار لگایا اور حکم دیا کہ ملک کے سارے شراب خانوں کو مسمار کر دیا جائے اور علما و مشائخ کو ہدایت کر دی کہ وہ لوگوں کو نیک اعمال کی طرف متوجہ کریں اور برے کاموں سے روکیں۔ بادشاہ نے خود بھی شراب سے توبہ کی۔

اب حضرت برہان الدین غریب اس کے طرز عمل سے مطمئن ہو گئے۔ بادشاہ آپ کی بارگاہ میں آنے جانے لگا۔ حضرت صاحب نے اسے غازی کا خطاب دیا اور محمد شاہ سلطان غازی محمد شاہ بہمنی کے نام سے مشہور ہوا ----- سلطان غازی محمد شاہ نے اسلام کی توسیع و تبلیغ میں خاص دلچسپی لی۔ چوروں ' قزاقوں اور لوٹ مار کرنے والوں کو ملک سے نیست و نابود کیا۔ ملک

میں چاروں طرف فرمان صادر کئے کہ حاکم اپنے علاقے کی حدود میں ظلم و ستم کو بالکل ختم کر دے اور ظالموں کا سر کاٹ کر عبرت کے لئے میرے پاس روانہ کر دے۔ اس طرح ظالموں اور قزاقوں کو ختم کر دیا گیا، صرف چھ مہینے کے اندر اندر تقریباً" تیس ہزار چور اور ڈاکو پکڑ کر گلبرگہ روانہ کر دیئے گئے۔ ان لوگوں کے سر کاٹ کر ایک چبوترہ بنایا گیا تاکہ محمد شاہ کی حکمت عملی کا شہرہ پھیل جائے۔ اسلام اور شریعت پر چلنے والے راستے بالکل پر امن و آرام دہ ہو گئے۔ مسلمانوں کا جان و مال بالکل محفوظ ہو گیا۔ غرضیکہ اس منصف مزاج بادشاہ کے عہد میں چھوٹے بڑے شریف اور رذیل سب بہت اطمینان اور سکون کی زندگی گزارتے تھے۔ ساری رعیت بہت خوش و خرم تھی اور بادشاہ کی ذات قدرت کا ایک بہت بڑا عطیہ بن گئی۔

حوالہ کے لئے:

تاریخ فرشتہ از محمد قاسم

تاریخ ادبیات پاکستان و ہندوستان، پنجاب یونیورسٹی لاہور

دیگر امدادی کتب:

اخبار الاخیار، شیخ عبدالحق محدث دہلوی

اردو دائرہ المعارف، پنجاب یونیورسٹی لاہور

نور اسلام، شرقپور شریف جون ۱۹۹۲ء

اختیار

★ فقیر لوگ کسی کام میں اپنے اختیار کو داخل نہیں ہونے دیتے۔

★ اللہ والے کا رومال سر پر آیا تو سخت گیر شخص کی رعونت ختم ہو گئی۔

★ ننگے سر رہنا سخت گیری کی علامت ہے۔

★ ولی اللہ کی قناعت پسندی نے محمد تغلق کو نرم کر دیا۔

فقیر لوگ جب دنیا کو طلاق دے کر اس سے الگ رہنے لگتے ہیں، تو دنیا ان کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ اہل دنیا پروانوں کی طرح ان شمعوں کا طواف کرنے لگتے ہیں۔ آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ ان کی خانقاہوں پر رونقیں آباد رہتی ہیں۔ ان آنے جانے والوں میں بعض اوقات وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو وقت کے حکمرانوں کے خلاف ہوتے ہیں، یہ بات حکمرانوں کے لئے بڑی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ یہ حکمران اپنے مخالفین کے جائز مطالبات پر غور نہیں کرتے بلکہ ان فقیروں کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق لوگوں کے ایسے ہجوم ان کے خلاف سازش کرنے والوں کے ہوتے ہیں۔

سلطان محمد تغلق کو بھی ان اللہ والوں کے ہاں کی یہ رونقیں مشکوک دکھائی دیں۔ اس کی خفیہ پولیس والے اسے خانقاہوں کے بارے میں اطلاعیں

دیتے رہتے، جو آدمی عوام کے لئے مفید نہ ہو ضروری نہیں کہ اس پر تنقید محض اس کے مخالف لوگ ہی کریں بلکہ وہ لوگ بھی اس کی پالیسیوں پر اتفاق نہیں کرتے جن کو حکومت سے کسی قسم کا کوئی مفاد نہیں ہوتا۔

چونکہ فقیروں کے ہاں صرف حق کا پرچار ہوتا ہے اور یہ پرچار امراء کو وارے نہیں آتا۔ اس وقت اس صورتحال کے پیش نظر اولا" اپنے نذرانوں سے علماء اور فقراء کو نوازتے ہیں اور مابعد ان کی زبان کے فرش پر اپنی تعریفوں کے تذکرے رقصاں دیکھنے کے آرزو مند ہوتے ہیں۔

شہنشاہ محمد تغلق بھی ایسے ہی امراء سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ پڑھا لکھا ہونے کے باوجود علمی تقاضوں کی گہرائی تک جھانکنے کا عادی نہ تھا۔ وہ معمولی جرائم پر کڑی سزا دینے سے نہیں چوکتا تھا۔

حضرت شیخ قطب الدین منور رحمتہ اللہ علیہ فقر میں ایک ممتاز مقام رکھنے والے بزرگ تھے۔ آپ حضرت خواجہ محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کے جلیل القدر، جامع کمالات اور مظہر کرامات خلیفہ تھے۔ تصنع اور تکلف سے آپ کو طبعا" نفرت تھی۔ لوگوں کے شور و غل سے دور رہتے تھے، آپ نے کبھی کوئی کام نہیں کیا جس سے ان کے اپنے اختیار کا دخل ہو۔ یہاں تک کہ اپنے اختیار سے اپنے کمرے سے بھی باہر نہ نکلا کرتے تھے، امراء کے دروازے پر کبھی نہ جایا کرتے۔ اور پوری زندگی توکل صبر اور قناعت میں بسر کی۔ شب زندہ دار بزرگ تھے۔

آپ کے ہاں ہر وقت فیوض و برکات کی نعمتیں حاصل کرنے والوں کا ہجوم رہتا۔ اس ہجوم مین وہ لوگ بھی ہوتے جو بادشاہ کے دربار میں حاشیہ نشین ہوا کرتے تھے اور وہ بھی جنہیں یہ حاشیہ نشین پسند نہ کرتے تھے۔

ایک دن بادشاہ کے دربار میں حضرت صاحب کے ہاں آنے والے عقیدت مندوں کے بارے میں گفتگو ہونے لگی۔

بادشاہ نے کہا سنا ہے ہانسی (ضلع حصار میں جو دہلی سے زیادہ دور نہیں) میں کوئی قطب الدین منور ہیں جن کے ہاں سیاسی گٹھ جوڑ ہوتے رہتے ہیں۔ اور مجھے آج تک ان کی سرگرمیوں سے بے خبر رکھا گیا ہے۔ آخر کیوں؟

حضور! حضرت قطب الدین منور صاحب کو سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں ہے، وہ ایسی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ ایک درباری نے عرض کیا۔

ممکن ہے آج ایسا ہی ہو مگر کل وہ ایسے اجتماعات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

میرا خیال ہے وہ ایسا ہرگز نہیں کریں گے۔ کسی دوسرے مصاحب نے عرض کیا۔

کل کو پچھتانے کی بجائے بہتر ہے کہ آج ہی ان کی زبان کو لگام دے کر رکھا جائے۔ بادشاہ نے کہا۔

آپ بجا فرماتے ہیں شہنشاہ معظم، چند درباری یک زبان ہو کر بولے۔

بادشاہ نے سارے درباریوں پر نگاہ ڈالی اور قاضی کمال الدین صدر جہاں کو طلب کیا۔

جی حضور! بندہ حاضر ہے۔ قاضی صاحب نے آگے بڑھ کر سر جھکا دیا۔

اب میر منشی کو طلب کیا گیا اور اس سے ایک حکمنامے کی تحریر لکھوائی گئی، بادشاہ نے یہ حکمنامہ قاضی کمال الدین کو دیتے ہوئے فرمایا۔

اسے قطب الدین منور کے ہاں لے جاؤ۔ حکمنامے میں تحریر کیا گیا کہ آپ چونکہ اکثر عبادات الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ نان و نفقہ کمانے

کے لئے آپ کے پاس وقت نہیں ہے۔ ہم آپ کو فلاں فلاں گاؤں بطور ہدیہ دیتے ہیں، تاکہ آپ فکر معاش سے بالکل آزاد ہو جائیں۔

اس ہدیہ میں بادشاہ کا خلوص قطعاً شامل نہیں تھا۔ بلکہ وہ چاہتا تھا کہ قطب الدین منور کو دنیا داری کے فریب میں مبتلا کر دیا جائے۔ ان کی دنیاوی ضروریات بڑھ جائیں گی، تو انہیں ہماری ضرورت محسوس ہوتی رہے گی۔ ہم ان کی رسی کبھی ڈھیلی چھوڑیں گے اور کبھی کھینچ لیں گے۔

صدر جہاں (قاضی کمال الدین) اس جاگیرداری مواضعات کا فرمان لے کر جب شیخ قطب الدین منور کے ہاں آیا تو شاہی دربار کی نسبت زیادہ لوگوں کو آپ کے ہاں بیٹھے ہوئے پایا۔ سب لوگ دو زانو بیٹھے تھے اور گردنیں جھکائے ہوئے تھے۔

صدر جہاں کا خیال تھا کہ وہ ایک بہت بڑا شاہی عہدہ دار ہے۔ اور دوسرے اسے حضرت صاحب کی خدمت میں ہدیہ جاگیر پیش کرنا ہے لہٰذا اسے حضرت صاحب تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئے گی۔ اس نے لوگوں کے کندھوں پر سے پھلانگتے ہوئے حضرت صاحب تک جانے کی کوشش کی۔

مگر آپ کے خدام نے اسے روک لیا وہ کہنے لگے اپنی باری کا انتظار کرو۔

شاید آپ جانتے نہیں میں کون ہوں؟ صدر جہاں نے کہا۔

ہماری طرح ایک سر،دو بازو اور دو ٹانگوں والے ایک انسان سے زیادہ آپ کیا ہیں؟

قاضی کمال الدین کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے کہنے لگا میں

قاضی کمال الدین ہوں سلطان محمد تغلق سے مجھے خاص قرب حاصل ہے۔ میں صدر جہاں کے عہدے پر فائز ہوں۔

آپ کی ساری باتیں درست ہیں مگر ہمیں وہی کچھ کرنے کی اجازت ہے، جو ہمیں فرمایا گیا ہے۔ یہیں بیٹھ جائیں جب آپ کی باری آئے گی آپ حضرت صاحب کے پاس جائیں گے۔

بھئی میں آپ کے حضرت صاحب کے لئے ایک خوشخبری لے کے آیا ہوں۔

کیا خوشخبری ہے؟

میرے پاس سلطان معظم محمد تغلق کا ایک خاص حکم ہے۔ میں بڑی جلدی ان تک اسے پہنچانا چاہتا ہوں۔

کیا وہ حکمنامہ آپ مجھے دے سکتے ہیں کہ میں خود ان تک پہنچا دوں؟

نہیں میں خود ہی اسے آپ تک پہنچاؤں گا۔

اگر آپ کا اصرار زیادہ ہے تو میں آپ کی آمد کی اطلاع آپ کو کر دیتا ہوں۔

ٹھیک ہے آپ انہیں اطلاع دے دیں۔

خادم حضرت صاحب کی خدمت میں گیا عرض کیا بادشاہ کا کوئی عہدہ دار آپ سے ملنے کا خواہش مند ہے۔

بھئی! ہم نے کسے روکا ہے یہ تو فقیر کی چوکھٹ ہے۔ جو آئے گا ہم اس سے ضرور ملیں گے۔ جاؤ اسے کہہ دو اگر اس سے ملاقات کرنے میں مجھ فقیر کو کوئی اختیار ہے تو ان لوگوں کے بعد ملوں گا جو اس سے پہلے آئے ہوئے ہیں اور اگر ان کے پاس مجبور کر دینے والا اختیار ہے تو وہ ابھی آ جائیں۔

حضور! وہ اپنے آپ کو صدر جہاں کہتا ہے اور حضور کی خدمت میں کوئی خوشخبری لے کر آیا ہے۔

میں نے ابھی خوشخبری سننے والا کون سا کام کیا ہے؟ ابھی تو ڈرتا ہوں کہ قیامت کے دن نامہ اعمال کہیں بائیں ہاتھ میں نہ دے دیا جائے۔

بہرحال اسے کہہ دو انتظار کرے تو بہتر ہے بصورت دیگر آ جائے۔

خادم نے حضرت صاحب کے ارشاد کے مطابق عرض کر دیا۔ صدر جہاں کی نخوت و تمکنت کے پسینے چھوٹنے لگے عاجزی اور انکساری نے دامن کھینچنا شروع کر دیا کچھ ایسا رعب طاری ہوا کہ مزید کچھ نہ کہہ سکا وہیں بیٹھ گیا جہاں کھڑا تھا اور یہ جگہ وہ تھی جہاں حضرت صاحب کے عقیدت مندوں کی جوتیاں پڑی تھیں۔

لوگ فیوض و برکات کی جھولیاں بھر بھر کے جانے لگے جگہ بنتی گئی اور لوگ آگے آگے بڑھتے گئے، آخر ایک وقت ایسا آیا کہ حضرت صاحب اور صدر جہاں کے درمیان کوئی شخص بھی حائل نہ تھا۔

قاضی کمال الدین کے دل میں آئی کہ اب جلدی سے بادشاہ کا حکمنامہ کھول کے آگے رکھ دے مگر جرات نہیں ہو رہی تھی۔ دو زانو بیٹھا تھا اور سر جھکا ہوا تھا۔ حضرت صاحب نے فرمایا جی صدر جہاں ایک فقیر کی بارگاہ میں تشریف آوری کیسے؟

حضور اولاً تو اس کلام و انداز کی معافی چاہتا ہوں جو آپ کے خادم کے ساتھ ہوئی ازاں بعد عرض گزار ہوں سلطان معظم محمد تغلق نے نہایت انکساری کے ساتھ سلام عرض کیا ہے اور یہ حکمنامہ آپ کی خدمت میں پیش کیا ہے کہ آپ فلاں فلاں گاؤں کے حقوق ملکیت قبول فرمائیں۔

کیا مجھے ان مواضعات کو قبول کرنے یا رد کرنے کا اختیار ہے۔

بادشاہ کی خوشی اسی میں ہے کہ اس ہدیہ کو قبول فرمائیں۔

آپ نے حکم نامہ ہاتھ میں لیا اور اس کی پشت پر یہ تحریر کر کے واپس بھیج دیا۔

شاید آپ کو علم ہو کہ سلطان نصیر الدین بن شمش الدین جب اچ اور ملتان کی جانب جا رہا تھا، تو حضرت شیخ فرید الدین گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں امیر الامراء غیاث الدین کو ایک فرمان جاگیری مواضعات دے کر بھیجا تھا لیکن شیخ فرید الدین نے اسے جواب دیا کہ ہمارے مشائخ نے ایسی جاگیریں قبول نہ فرمائیں تھیں، جاگیریں قبول کرنے والے اور لوگ بہت ہیں ان کو دے دی جائیں۔

اور آپ کو یہ بھی علم ہے کہ ہم بھی انہی کے مرید ہیں۔ ہمیں بھی وہی کرنا چاہئے جو انہوں نے کیا یعنی ہم جاگیر وغیرہ قبول نہیں کرتے۔

صدر جہاں جب واپس بادشاہ کے ہاں پہنچا تو وہ اس کا منتظر تھا حضرت شیخ قطب الدین منور کا واپسی جواب پڑھ کر حیران رہ گیا کہ یہ لوگ کیسے ہیں جو گھر آئی دولت سے بھی منہ موڑ لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ ضرور میرے لئے مشکلات کھڑی کریں گے کیونکہ دنیا کے سارے لوگ دنیا کے مال و دولت کے لئے ہیں، جو شخص مال و دولت سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے وہ جھگڑے والے کوچے میں کیسے آئے گا۔

لیکن صدر جہاں ایک بات ضرور ہے اس شخص کی قناعت پسندی حکومتی معاملات سے ٹکرا ضرور سکتی ہے۔ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ یہ اس کے گن گاتی ہے جس کا کھائے اب چونکہ میری احتیاج نہیں ہے لہذا وہ

ہمارے بارے رطب اللسان نہ ہوں گے تنقید ضرور کرتے رہیں گے آپ جانتے ہیں محمد تغلق کو اپنے معاملات میں تنقید قطعاً ناپسند ہے۔ کچھ خفیہ نویس ان پر مقرر کردو جو ان کے حالات و کوائف پر نگاہ رکھیں۔

ایک عرصے تک خفیہ نویسوں کی کوئی رپورٹ بادشاہ تک نہیں پہنچی جسے بادشاہ یا اس کی حکومت کے خلاف قرار دیا جائے۔

جب محمد تغلق ہانسی کا قلعہ دیکھنے کے لئے گیا تو رستے میں ہانسی سے ۸ میل پہلے ایک مقام بنسی میں قیام پذیر ہوا وہیں سے نظام زر بارے عرف مخلص الملک کو جو بڑا ظالم تھا کو ہانسی میں بھیجا۔ کہ وہ معلوم کرے کہ قلعہ کی کیفیت کیا ہے وہ ٹھیک ہے یا خراب ہو چکا ہے۔ اس کے کن حصوں کی تعمیر و مرمت اشد ضروری ہے؟

ادھر ارد گرد کے علاقوں کو پتہ چل گیا کہ بادشاہ محمد تغلق آیا ہوا ہے تو لوگ جوق در جوق بادشاہ کو سلام کرنے کی غرض سے آنے لگے یہاں تک کہ ہانسی کی ساری آبادی بنسی میں آ گئی تھی۔

جب نظام زر بارے ہانسی میں پہنچا تو قلعہ کے قریب ایک چھوٹے سے ٹوٹے پھوٹے مکان میں دھواں اٹھتا اسے دکھائی دیا جو اس بات کا غماز تھا کہ اس میں رہنے والے بادشاہ کو سلام کرنے کی غرض سے نہیں گئے۔

یہ گھر حضرت شیخ قطب الدین منور کا تھا جو گھر پر ہی اوراد و وظائف میں مشغول تھے۔

واپسی پر نظام زر بارے نے بادشاہ کو قلعے کی رپورٹ کے ساتھ ساتھ یہ اطلاع بھی دی کہ حضرت قطب الدین منور گھر پر مزے سے آرام کر رہے ہیں اور آپ کے استقبال کو نہیں آئے جبکہ سارا ہانسی آپ کے ہاں سرنگوں

ہے۔

بادشاہ کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ یہ بغاوت کیوں؟ اسے حکومت کا نشہ اور غرور تھا جیسا کہ عموماً ہوا کرتا ہے۔ اس نے فوراً حسن سربرہنہ جیسے عزت دار اور طاقتور کو حکم دیا کہ جاؤ اور شیخ قطب الدین منور کو یہاں پکڑ کر لے آؤ۔

چنانچہ حسن سربرہنہ حضرت صاحب کے ہاں گیا۔ دروازے پر دستک دی آپ کے صاحبزادے شیخ نور الدین باہر تشریف لائے جو اس وقت کم سن تھے۔ دیکھا تو حسن سربرہنہ کے چہرے پر غصہ غالب تھا آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اس نے سلام و ادب کا کوئی لفظ منہ سے نہیں نکالا فوراً کہا آپ کے ابو کہاں ہیں؟

میرے والد محترم میرے آقا سردار گھر میں تشریف رکھتے ہیں فرمایئے کیا کہنا ہے آپ نے ان سے، صاحب زادے نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

دیکھتے نہیں ہو میں کون ہوں حسن سربرہنہ ہوں میں بادشاہ محمد تغلق کی طرف سے آیا ہوں انہیں (حضرت قطب الدین منور) جلدی باہر بلا کر لاؤ۔

ایسے لگتا ہے کہ آپ بادشاہ کے نوکر ہیں مگر مجھے آپ پہچانتے ہیں۔ میں کون ہوں؟ میں شہنشاہ ولایت حضرت خواجہ شیخ قطب الدین منور صاحب کا لخت جگر ہوں۔ آپ کو بادشاہ نے آداب ملاقات نہیں سکھائے ہیں کیا؟

زیادہ ٹرٹر نہ کرو جاؤ اپنے باپ کو باہر بھیجو دیکھتے نہیں ہو میرے ہاتھ میں کوڑا ہے۔ یہ تم جیسے نافرمان لوگوں کے لئے ہی ہے۔

نافرمانی ہم تو جب سے پیدا ہوئے نہیں کی۔ فرمانبرداری کا سبق ہی ہمیں دیا جا رہا ہے۔ کس کی فرمانبرداری بھلا؟

اللہ کی ' اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کی ' والدین کی اور اساتذہ
کی۔

اور حاکم وقت کی فرمانبرداری تمہیں بھول جاتی ہے۔ جاؤ اپنے والد محترم
کو باہر بلاؤ۔

تھوڑی دیر کے بعد یہ صاحبزادے پھر باہر تشریف لائے کہا اندر آ جائیں
ابو اپنے کمرے میں اکیلے ہی ہیں۔

حسن سربرہنہ اندر گیا تو آپ کو ایک چٹائی پر مشغول اوراد پایا آپ نے
اشارہ فرمایا بیٹھ جاؤ۔ حسن غالیچوں کو اپنے پاؤں کے نیچے روندنے والا اس
صف پر کیسے بیٹھے جو فقیر کے ہاں بچھی ہو۔

حضرت صاحب سر جھکائے بیٹھے رہے اور اپنا وظیفہ مکمل کرتے رہے
اور حسن سربرہنہ کا دل پتہ ہونے لگا اس کی رعونت کافور ہونے لگی اس نے
محسوس کیا کہ حضرت صاحب کی محفل میں ننگے سر بیٹھنا آداب کے منافی ہے
مگر وہ سر کس سے ڈھانپے اس کے پاس تو کوئی رومال وغیرہ بھی نہیں تھا وہ تو
بس ننگے سر رہنے کا عادی تھا اس کی خفت میں ہر لحہ اضافہ ہوتا گیا۔

(یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے "سربرہنہ" محمد تغلق کے
زمانے میں ایک عہدیدار کے لئے خطاب تھا جیسے خانخاناں صدر جہاں صدر
الصدور یا امیر الامراء ہیں۔ جسے سربرہنہ کے عہدے پر سرفراز کیا جاتا اسے
کچھ بھی کرنے کی اجازت تھی۔ یہ بادشاہ کے مفاد میں جو ظلم و زیادتی چاہے
اسے اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی۔ جلاد کو سر قلم کرنے کے لئے حاکم
وقت کے حکم کی ضرورت ہوتی ہے مگر سربرہنہ کو اس کی ضرورت بھی نہیں
حسن اس عہدے پر مامور تھا اور حسن سربرہنہ کہلاتا تھا اور اس کی پہچان

اس کا ننگا سر تھا جو اسے دیکھتا کانپ جاتا (ننگے سر رہنے والوں کے لئے لمحہ
فکریہ ہے)

حضرت صاحب نے ایک رومال آگے بڑھا دیا فرمایا اسے سر پر باندھ لیں
جونہی سر پر رومال آیا ساری رعونت ختم ہو گئی حضرت صاحب کے خدام میں
نام لکھوانے کو جی چاہنے لگا۔

اب حضرت صاحب نے فرمایا کہئے حسن آپ کا آنا ایک فقیر کے ہاں
کیسے ہوا؟

عرض کیا سلطان محمد تغلق نے آپ کو بلایا ہے۔

حضرت صاحب نے دریافت فرمایا اس طلب کرنے میں مجھے کوئی اختیار
ہے یا نہیں؟

حسن کہنے لگا فرمان شاہی تو یہی ہے کہ میں آپ کو اپنے ساتھ لے کر
جاؤں اگر آپ نہیں جاتے تو ظاہر ہے میری سرزنش ہو گی۔

مطلب یہ ہوا کہ اگر میں آپ کے ساتھ شاہی دربار میں جاتا ہوں تو میں
اپنے اختیار سے تو نہیں جا رہا الحمد اللہ یہی فقیروں کا طریقہ ہے کہ امراء کے
درباروں میں کوئی اپنی غرض لے کر نہ جائیں۔

اب آپ کھڑے ہوئے گھر والوں کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا میں تمہیں
خدا کے سپرد کرتا ہوں پھر اپنی جانماز کندھے پر رکھی اور لاٹھی ہاتھ میں لے
کر پیدل روانہ ہوئے۔

حسن سربرہنہ پر آپ کا مقام واضح ہو رہا ہے عرض کرنے لگا حضور! آپ
پیدل کیوں چلتے ہیں یہ کوتل گھوڑے (ایسے گھوڑے جو سوار کے بغیر ساتھ
لائے گئے ہوں) کس لئے ہیں؟ آپ کسی ایک کا انتخاب فرمائیں۔

آپ نے فرمایا مجھے گھوڑے پر سوار ہونے کی ضرورت نہیں ہے ابھی
جسم میں اس قدر قوت ہے کہ پیدل چل سکتا ہوں، زمین کے لئے تو میں پہلے
ہی ایک بوجھ بنا ہوا ہوں گھوڑے پر سوار ہو کے مزید بوجھ کیوں ڈالوں؟

رستے میں آپ کے آباؤ اجداد کی قبریں آئیں، آپ نے حسن سربرہنہ
سے کہا کہ کیا مجھے یہاں کچھ دیر رکنے کی اجازت ہے تاکہ دعائے خیر کر لوں،
حسن نے ایسا کرنے کی اجازت دے دی۔

فاتحہ خوانی کے بعد عرض کیا میرے پیارے بزرگو! مجھے آپ کی قربت
سے بے اختیاری کے عالم میں لے جایا جا رہا ہے۔ اور میں اپنے اختیار سے
گھر سے بھی نہیں نکلا مجھے زبردستی لے جایا جا رہا ہے اور چند بندگان خدا کو
کسمپرسی کے عالم میں بغیر خرچ وغیرہ کے گھر میں چھوڑ آیا ہوں۔

یہ دعا مانگ کر آپ قبرستان سے باہر تشریف لائے تو ایک آدمی کو
قبرستان کے کنارے کھڑے پایا وہ سراپا جھک گیا اور ۵۰ روپے قبول کرنے کو
عرض کیا۔

آپ نے فرمایا مجھے ان روپوں کی ضرورت نہیں ہے یوں کرو ان روپوں
سے میرے گھر کی ضروریات کی چیزیں خرید کر میرے گھر میں دے دینا کیونکہ
ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ اور بچوں کے کچھ کھانے کا وقت قریب آ رہا
ہے۔

وہ آدمی چلا گیا اور آپ نے پھر حسن سربرہنہ کے ساتھ چلنا شروع کر
دیا۔

بستی میں پہنچے تو خیموں کا ایک جہان آباد تھا امراء، وزراء اور خدام کے
خیمے ایستادہ تھے، سائیس گھوڑوں کی تواضع میں مصروف تھے، ہاتھی جھوم جھوم

کر چارہ کھا رہے تھے اور مطبخ میں قسما قسمی کھانے تیار ہو رہے تھے۔ یہ
ساری خیمہ بستی ایک عجیب رنگ و نور کا نظارہ پیش کر رہی تھی۔

حضرت صاحب کو شاہی دربار میں کھڑا کیا گیا حسن سربرہنہ فرشی سلام
کرتا ہوا بادشاہ کے روبرو پہنچا۔

محمد تغلق نے گردن اونچی کرتے ہوئے گرجدار آواز میں پوچھا حسن تم
اکیلے کیوں آئے ہو؟ قطب الدین منور کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟

حضور! حضرت صاحب کو ساتھ لایا ہوں۔

حضرت صاحب کون؟ میں نے آپ کو قطب الدین منور کو لانے کے
لئے کہا تھا۔

ہاں حضور! حضرت صاحب سے میری مراد قطب الدین منور ہی ہیں وہ
باہر کھڑے ہیں مگر حضور اگر جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔

کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟

حضرت قطب الدین منور ایک درویش منش آدمی ہیں۔ میں نے ان کے
ہاں سراپا بے نیازی دیکھی ہے وہ کسی قسم کی احتیاج نہیں رکھتے ان کا وجود تو
اہل دنیا کے لئے سراسر برکت ہے، ان کی دعائیں حضور کے کام آ سکتی ہیں۔

محمد تغلق پر ان باتوں کا کچھ اثر نہ ہوا اور حضرت صاحب کو اپنے پاس
بلایا۔

جس وقت حسن سربرہنہ بادشاہ سے حضرت صاحب کے متعلق گفتگو کر
رہا تھا اس وقت دربار سے باہر باربکی خاندان کے نائب فیروز شاہ کھڑے تھے۔
انہوں نے حضرت صاحب کو دیکھا تو سراپا نیاز بن گئے عرض کرنے لگے بادشاہ
کو آپ کے بارے میں بہت سی غلط باتیں بتائی گئی ہیں اس لئے رواداری

اخلاق اور تواضع کا خوب خیال رکھیں۔

جونہی بادشاہ نے حضرت صاحب کو آتے ہوئے دیکھا تو وہ بیٹھے بیٹھے فوراً کھڑا ہوا اس نے اپنی کمان ہاتھ میں لی اور گزانداختی (بے پیکاں تیر کو کبھی کمان میں رکھنا اور کبھی نکال لینا) میں مشغول ہو گیا جیسے آپ کی آمد پر بے توجہی کا اظہار کر رہا ہو پھر جیسے جیسے حضرت صاحب اس کے قریب آتے گئے اس کے اوسان خطا ہوتے گئے اس پر ایک قسم کا خوف طاری ہوتا گیا حضرت صاحب جونہی بالکل اس کے قریب آئے وہ آگے بڑھا اور آپ سے مصافحہ کیا مگر حضرت صاحب نے اس وقت بادشاہ کا ہاتھ بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا جسے اس نے چھڑانے کی کوشش کی مگر چھڑا نہ سکا۔

بادشاہ محمد تغلق علماء اور مشائخ کے حق میں اچھا نہیں تھا اس کی تلوار ایسی کئی ہستیوں کے سر تن سے جدا کر چکی تھی حضرت صاحب نے اس کا ہاتھ پکڑا تو دیگر حاضرین کے نزدیک یہ ایک گستاخی تھی انہیں یقین ہو گیا کہ بادشاہ آپ کی حرکت کو معاف نہیں کرے گا اور بڑی جلدی انہیں موت کی آغوش میں سلا دے گا مگر بادشاہ نے اسے اپنے لئے ایک سعادت سمجھا۔

آپ نے فرمایا اولاً تو آپ ہانسی کو دیکھیں جس کے لئے آپ آئے ہیں رہی ملاقات کی بات تو یہ فقیر اپنے گھر میں پڑا ہے اور اس فقیر کو یہ بھی معلوم نہیں کہ بادشاہ سے ملاقات کن آداب کے ساتھ کی جاتی ہے۔ یہ فقیر تو بس بادشاہ اور عامۃ المسلمین کے لئے دعا میں مشغول ہے اس وجہ سے معذرت خواہ ہوں۔

حضرت شیخ قطب الدین منور کی اس گفتگو سے محمد تغلق بڑا خوش ہوا اور اچھا اثر لیا اس سے باربکی خاندان کے نائب سلطان فیروز شاہ سے کہا

حضرت صاحب جو چاہتے ہیں وہاں انہیں دے دیا جائے۔

حضرت صاحب نے فرمایا میرا مطلب صرف درویشی اور اپنے آباؤ اجداد کی جھونپڑی میں قیام ہے۔

پھر بادشاہ نے فیروز شاہ اور ضیاء برنی کو حکم دیا کہ حضرت صاحب کی خدمت میں ایک لاکھ روپیہ پیش کیا جائے۔

حضرت صاحب نے جب اس قدر گراں انعام کا نام سنا تو فرمایا نعوذ باللہ فقیر اسے ہرگز قبول نہیں کرے گا۔

اب دونوں (فیروز شاہ اور ضیاء برنی) نے بادشاہ سے عرض کیا شیخ قطب الدین منور اس رقم کو قبول نہیں کرتے۔

بادشاہ نے کہا مزید پچاس ہزار روپے دے دیئے جائیں، کیونکہ اس کے خیال کے مطابق وہ تھوڑی رقم کے سبب قبول نہیں کرتے ہوں گے۔

حضرت صاحب نے اب بھی یہ رقم قبول نہیں کی، فرمایا اتنی رقم ہمارے کس کام کی فقیر کی ضرورت تو بس دو سیر کھچڑی اور ایک چھٹانک گھی ہے۔

اب فیروز شاہ اور ضیاء برنی نے عرض کیا شاہی دربار میں ہم اس قدر کم ہدیہ کا تذکرہ بھی نہیں کر سکتے ہماری خوشی کے لئے ضرور قبول فرمائیں۔

جب ان کا اصرار بڑھا تو آپ نے ضرورت کے مطابق کچھ رقم قبول فرمالی جسے آپ نے فقراء میں بانٹ دیا۔

← حوالہ کے لئے: اخبار الاخیار از شیخ عبدالحق محدث دہلوی
ادلوی کتب فیروز سنز اردو انسائیکلوپیڈیا۔ تاریخ پاک و ہند برائے ایف اے

ماہنامہ نورِ اسلام فروری ۱۹۹۶ء
شرقپور شریف
ماہنامہ الہدیٰ
اسلامی ڈائجسٹ
نئی دہلی (بھارت) جولائی ۱۹۹۶ء

استاد

☆ انسان کی بری نیت بھی اس پر اثر انداز ہوتی ہے۔

☆ استاد کا مقام بڑا پاکیزہ مقام ہے، جسے مل جائے وہ اس کا حق ادا کرے۔

☆ قوم کے بچے استاد کے پاس امانت ہوتے ہیں۔

☆ ولی کامل نے استاد کا سلب شدہ علم واپس دلا دیا۔

☆ ولی کامل بعض اوقات دنیا داری کے روپ میں اپنے آپ کو چھپاتا ہے۔

حجاج بن یوسف کے بارے میں تاریخوں میں یوں آتا ہے کہ وہ بڑا ظالم حکمران تھا۔ اس کے ظلم کا شمار یوں کیا جاتا ہے کہ اگر ساری دنیا کے ظالموں کے ظلم ایک طرف رکھے جائیں اور دوسری طرف حجاج بن یوسف کے تو حجاج بن یوسف کے ظلم زیادہ ہوں گے۔ حضرت مالک بن دینار رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ عراق میں اس نے ایک لاکھ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور جب وہ مرا تو جیل میں پچاس ہزار مرد اور تیس ہزار عورتیں قید تھیں۔

اگرچہ اس کی اس سخت گیر پالیسی کے باعث عراق میں امن و امان قائم ہو گیا مگر ملک میں جہاں برے لوگ مارے گئے وہیں اچھے لوگ بھی اس کی

تلوار سے اپنے سر کٹوا بیٹھے۔ چنانچہ ایک وقت ایسا آیا کہ موصل کی جامع مسجد کے لئے قاری تک نہ رہا حجاج بن یوسف نے اس کے لئے قاری کے انتخاب کی خاطر ایک مقابلہ کروایا۔

دور و نزدیک سے کم و بیش ایک سو قاریوں نے اس مقابلہ میں حصہ لیا حسن قرائت اور تجوید قرآن کا بہترین مظاہرہ ہوا ایک سے ایک بڑھ کر پڑھنے والا قاری تھا۔ اساتذہ بھی تھے اور نوجوان شاگرد بھی۔

منصفین نے جو فیصلہ سنایا تو حافظ قاری ابو عمرو کا نام بہترین قرآن پاک پڑھنے والوں میں اول نمبر پر تھا یہ نوجوان قاری صوتی اعتبار سے بھی اور تجوید کے اعتبار سے بھی وحید العصر ثابت ہوا عمر بمشکل پچیس تیس سال کے درمیان تھی جامع مسجد میں اس کا تقرر ہو گیا۔

جب ابو عمرو نے تدریس کے کام کا آغاز کیا تو قرآن پاک سیکھنے والوں کا تانتا بندھ گیا ان میں غریبوں کے بچے بھی تھے اور امیروں کے،بھی ابو عمرو کی شہرت دور دور تک پہنچنے لگی حجاج بن یوسف اپنی وفات کے ایک سال قبل یعنی ۹۵ھ میں جب موصل میں آیا اور ابو عمرو کے مدرسے کی شہرت سنی تو بڑا خوش ہوا ابو عمرو کو اس نے انعام بھی دیا، حجاج بن یوسف ۹۶ھ میں مر گیا مگر اس کا یہ کام زندہ رہا اور قرآن پاک کی تدریس کا یہ سلسلہ چلتا رہا ایک دن عراق کے ایک شہر کرکوک کا ایک طالب علم قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اس مدرسہ میں پہنچا یہ طالب علم ذہانت و فطانت کے ساتھ ساتھ غیر معمولی طور پر حسین بھی تھا شاعروں اور ادیبوں نے اپنے محبوبوں کے حسن زیبا کے جن خدوخال کا ذکر کیا ہے ان سب سے یہ متصف تھا، موٹی اور سرمئی آنکھیں لمبی اور پتلی گردن، لمبا قد اور سفید رنگت زیادہ نمایاں تھے

مدرسے کے طالب علم جو جھوم جھوم کر قرآن پاک پڑھ رہے تھے، چپ ہو گئے۔ سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔ استاد نے بھی جب اس بچے کو دیکھا تو دیکھتا رہ گیا اس کی قاتل نگاہ جو ایک باشعور استاد پر پڑی تو وہ بھی گرفتہ دل ہو کر بسمل بن گیا اس کا نرم و ملائم اور لمبی پوروں والا ہاتھ پکڑا تو اس سے کھیلنے لگا۔ وہ سراپا اس کے حسن زیبا میں کھو گیا اس کی توجہ دوسرے سب بچوں سے ہٹ کر صرف اسی پر مرکوز ہو گئی۔

وہ استاد جو پڑھنے والے بچوں کی ایک منٹ کی خاموشی برداشت نہیں کرتا تھا، آج نہ جانے کیوں ان چپ کئے ہوئے بچوں پر چپ تھا۔ اس کے دل کی بات زبان کے فرش پر رقص کرنے لگی اور کہنے لگا۔

ہمیں تو اللہ تعالی نے ٹھیکے پر بنوایا ہے اور اس کو خود اپنے ہاتھ سے بنایا ہے۔ یہ بچہ ہم سے کیا سیکھے گا بلکہ ہم اس سے آداب محبت سیکھیں گے یہ میرے کمرے میں میرے پاس رہا کرے گا، دوسرے لڑکوں کے ساتھ اس کا اختلاط مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں ہو گا۔

شیطان کا داؤ ایک عالم دین پر چل گیا عالم دین کی نیت میں فتور آ گیا وہ اسے اپنی ہوس کا نشانہ بنانا چاہتا تھا بس موقعہ کی تلاش میں تھا۔

مغرب کی نماز قاری صاحب پڑھانے لگے تو تین آئتیں پڑھ کر بھول گئے۔ کسی سامع نے لقمہ دیا تو اگلی آیت اس سے نہ ملا سکے مجبوراً" رکوع میں چلے گئے، دوسری رکعت میں سورہ فاتحہ کے بعد ایک آیت بھی نہ پڑھ سکے سامع لقمہ پر لقمہ دیتا رہا مگر روانی پیدا نہ ہوئی۔

مقتدی حیران تھے کہ قاری صاحب کو کیا ہوا ہے جو آئتیں وہ بھول رہے ہیں انہیں تو وہ کئی بار پڑھ چکے ہیں آج کن خیالوں میں کھوئے ہوئے

ہیں آخر قاری صاحب نے کھڑے کھڑے سلام پھیر دیا کسی مقتدی کو امام بنایا اور اس کی اقتداء میں نماز پڑھی، عشاء کے وقت بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا، صبح کی نماز کے وقت وہ خود ہی مصلّٰی پر کھڑے نہیں ہوئے۔

طالب علموں کو پڑھانے بیٹھے تو پورا قرآن حافظہ سے سلب ہو چکا تھا ایک آیت تک زبان پر آنے کا نام نہیں لیتی تھی، یہاں تک کہ ناظرہ بھی نہیں پڑھ سکتے تھے اعلیٰ درجے کے شاگردوں سے کہا کہ دوسرے بچوں کے اسباق سنیں اور خود حجرے میں جا کر دروازہ بند کر کے رونے لگے نہ جانے کب تک روتے رہے۔

کچھ لوگوں نے آ کر قرآن پاک کے بھولنے اور رونے کی وجہ پوچھی مگر وہ کچھ بھی نہیں بتاتے تھے بس روتے ہی جاتے تھے پورے شہر میں اس بات کا شہرہ ہو گیا، لوگ توبہ توبہ کرنے لگے کہ ایسے نیک شخص سے کیا جرم سرزد ہو گیا ہے کہ قرآن پاک اس کی زبان پر آتا ہی نہیں ہے۔ نہ اس نے کبھی کوئی نماز چھوڑی، نہ کسی کا حق کھایا، نہ کبھی جھوٹ بولا، نہ امانت میں خیانت کی، نہ کبھی روزہ چھوڑا اور نہ ہی کبھی جھوٹی قسم کھائی۔ جو بھی پوچھتا کہ قاری صاحب آخر ہوا کیا ہے؟ قاری صاحب کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ جاتیں روتے روتے کہتے مجھ سے کچھ نہ پوچھو مجھے میرے حال پر چھوڑ دو مجھے اس سزا کی مدت پوری کرنے دو۔

ان پوچھنے والوں میں ایک دن ان کا ایک بڑا بے تکلف دوست آیا اس نے کہا قاری صاحب آؤ میرے ساتھ آپ جس تکلیف میں مبتلا ہیں اس کا علاج کرنے والے کے پاس چلیں۔

آخر کہاں؟ قاری صاحب نے پوچھا

عزیزم آپ کو کہیں لے ہی جاؤں گا۔

بھئی یہ بیماری نہیں ہے بس مجھے قرآن پاک بھول گیا ہے مجھے میرے استاد کے پاس لے چلو میں دوبارہ الف ب ت سے شروع کر کے پڑھوں گا۔

نہیں آپ دوبارہ قرآن پاک نہیں پڑھیں گے۔ یہ قرآن کو دوبارہ پڑھنے والی بات نہیں ہے۔ آپ نے اس دن دیکھا نہیں تھا کہ جب آپ نماز میں اپنی قرأت بھول گئے تو آپ کو بار بار لقمے ملتے رہے مگر آپ آگے نہیں چلتے تھے گویا آپ کو دوبارہ پڑھایا ہی جا رہا تھا لہٰذا میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ آپ کی کسی غلطی کا اثر ہے۔ کہ آپ سے علم جیسی دولت چھین لی گئی ہے اس علم کی واپسی سوائے کسی ولی اللہ کی نظر کرم کے نہیں ہو سکے گی۔

ولی اللہ اس معاملہ میں کیا کرے گا؟اللہ تو ہر ایک کو دوست رکھتا ہے جو اس کے کہے پر عمل کرے،میں نے کوشش کی ہے اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کروں یقیناً اس کی بارگاہ میں میرا گڑگڑانا میری مشکل حل کر دے گا۔

برادر آپ کی بات درست ہے مگر میں آپ سے پوچھتا ہوں جب سے آپ کا علم سلب ہوا ہے کیا اس دن سے آپ رو نہیں رہے ہیں؟

ہاں برابر رو رہا ہوں۔

اللہ سے آپ دعائیں نہیں مانگ رہے ہیں؟

برابر مانگ رہا ہوں۔

اور ہمارا یہ بھی یقین ہے کہ وہ ہر ایک کی فریاد سنتا ہے ہر شخص کے لئے وہ مشکل کشا ہے۔ پھر یہ محرومی کیوں؟

مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس دوست کا اظہار کرنا ہے جس کی بات مان لینے میں اللہ تعالیٰ کو خوشی ہوتی ہے۔

اس پر قاری صاحب نے سر تسلیم خم کر دیا کہا۔

چلو جس ولی اللہ کے پاس آپ لے جانا چاہتے ہیں مجھے لے چلو۔

وہ شخص قاری صاحب کو حضرت خواجہ حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کے پاس لے گیا۔

یہ سرکاری خطیب قاری اور حافظ جس سے ملنے کے لئے اجازت لینی پڑتی تھی،بڑے عاجزانہ انداز سے ایک بوریہ نشین کے پاس جا رہا تھا۔

خواجہ صاحب کا دروازہ بغیر دربان کے تھا آپ سے ملنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی،صرف مستورات کی خاطر ایک پردہ حائل کر دیا گیا تھا۔

آپ نے دنیا سے بیزار ہو کر آخرت کی فکر میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی یہ مشہور ہے کہ آپ ستر سال تک ہمہ وقت باوضو رہے۔ یہ دونوں حضرات آپ کی بارگاہ میں پہنچے تو آپ نے آنے کا سبب پوچھا قاری صاحب نے سارا واقعہ من و عن بیان کر دیا۔

آپ حیران ہوئے آپ نے اپنی انگلی اپنے منہ میں دبا لی،فرمایا تم نے ایک استاد ہو کر ایسی نیت کا ارتکاب کیا ہے یہ معصوم اور پھول سے بچے تو استاد کے پاس امانت ہوتے ہیں۔ جب یہ بچے اس کے ہاتھوں بگڑ جائیں گے تو اچھی قوم کا وجود ختم ہو جائے گا بہتر ہوا آپ سے علم چھین لیا گیا ہے،آپ علم کی صحیح ترسیل کرنے والے نہیں ہیں،جاؤ اب گنواروں کی طرح زندگی بسر کرو جنہیں انسان کی قدر اور احترام کا احساس نہیں ہے،جاؤ ان بدطینت حکمرانوں کی طرح رہو جو عوام سے سب کچھ چھین لینا چاہتے ہیں۔

قاری صاحب نے اپنے ساتھی کی طرف نہیں دیکھا کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے؟ ولی اللہ کی بارگاہ سے اسے کیوں دھتکارا جا رہا ہے؟ وہ فوراً قدموں میں جاگرا رونے لگا حضور مجھ سے غلطی ہو گئی ہے مجھے علم واپس لٹا دیں، آئندہ میں ایسی غلطی ہرگز نہیں کروں گا۔

حضرت خواجہ حسن بصری نے اس گرے ہوئے قاری کو اٹھا کر سیدھا بٹھا دیا۔فرمایا۔

دیکھو نوجوان! میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ آپ دل کی زبان سے اپنی غلطی کا اعتراف کر رہے ہیں اور تائب ہونے کا وعدہ بھی کر رہے ہیں آپ کی امید انشاء اللہ بر آئے گی آپ گھبرائیں نہیں آپ کا علم آپ کو واپس مل جائے گا۔

سنیئے! حج کے دن قریب ہیں جاؤ پہلے حج ادا کرو اور حج ادا کرنے کے بعد آپ مسجد حنیف میں پہنچ جائیں وہاں تمہیں محراب مسجد میں ایک ایسا شخص ملے گا جو پورا دنیا دار دکھائی دے گا لوگ اس کی تکریم کرنے میں جوق در جوق اس کے گرد جمع ہو رہے ہوں گے تمہیں اس کے اس مقام سے حیران نہیں ہونا چاہئے ان سے دعا کی درخواست کرنا اگر انہوں نے دعا کر دی تو آپ کا کام بن جائے گا۔

ابو عمرو نے حضرت خواجہ حسن بصری کی ہدایت کے مطابق اولاً" حج سے فراغت پائی پھر مسجد حنیف میں پہنچے اس وقت ظہر کی نماز کا وقت ہوا چاہتا تھا لوگ وضو کر کے نماز کی تیاری کر رہے تھے جماعت کھڑی ہونے سے پہلے ایک کثیر مجمع جمع ہو گیا مگر محراب مسجد خالی پڑی تھی وہ بار بار دائیں بائیں دیکھتے کہ وہ مستجاب الدعوات کون ہیں جن کے پاس مجھے بھیجا گیا ہے تھوڑی دیر کے

بعد ایک بزرگ تشریف لائے لوگوں نے کھڑے ہو کر ان کو تعظیم دی نماز پڑھی جانے کے بعد اس بزرگ کے گرد لوگوں کا حلقہ بن گیا،کوئی ان کے قدم چومنے لگا،کسی نے ان کے ہاتھوں پر بوسہ دیا،کسی نے کندھے دبانے شروع کر دیئے اور کوئی پاؤں دبانے لگا۔

ابو عمرو یہ سارا منظر دیکھتا رہا وہ حیران تھا کہ حضرت خواجہ حسن بصری نے اسے ان کے پاس کیوں بھیجا ہے؟اس کے نزدیک حضرت خواجہ حسن بصری زیادہ مستجاب الدعوات ہیں۔وہ اس فکر میں تھا کہ ان بزرگوں کے روبرو اپنی داستان غم بیان کرے یا نہ کرے اور اگر کرے تو اس کثیر مجمع کے سامنے کیوں کر؟ لوگ اس کی بات سن کر ضرور ہنسیں گے،ان کی تضحیک آمیز اور ملامت آمیز باتیں تو اس کا منہ کالا کر دیں گی،اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

پھر اچانک لوگوں کی بھیڑ کم ہونے لگی ایک وقت آیا کہ یہ بزرگ اکیلے رہ گئے ابو عمرو آگے بڑھا اور قدموں میں جا گرا رونے لگا اور اپنی ساری داستان غم ایک ہی سانس میں بیان کر دی،آپ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا،ابو عمرو کی ہچکی بندھ گئی وہ آپ کے سامنے ہاتھ جوڑے ہوئے تھا،اس کے ہلتے ہوئے لبوں سے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے،اس کی آنکھیں آپ کے چہرے پر مرکوز تھیں اور دیکھے جا رہی تھیں ان آنکھوں میں التجا کے سوا کچھ نہ تھا۔

آپ اٹھے مٹی کے پیالے میں پانی لائے فرمایا۔

ابو عمرو اسے پی جاؤ۔

اس نے پانی پیا تو وہ ہوش کی دنیا میں آ گیا۔

حضرت صاحب نے فرمایا دیکھو ابو عمرو! استاد کا مقام بڑا پاکیزہ مقام ہے۔ یہ مل جائے تو اس کا حق ادا کرنا چاہئے۔ اگر تم جیسے استاد قوم کو مل جائیں تو قوم کی تعمیر کیسے ہو گی؟ اللہ تعالیٰ سے وعدہ کرو کہ تمہاری شاگردی میں آنے والا ہر بچہ تمہارے اپنے بیٹے کی طرح ہے جس طرح تم اپنے بیٹے کی فلاح اور بہتری چاہتے ہو اسی طرح شاگردوں کی چاہو گے۔

عرض کی حضور! میرا علم ایک بار مجھے واپس مل جائے میں ایسا ہی کروں گا جیسا آپ فرما رہے ہیں۔

آپ نے بارگاہ خداوندی میں ہاتھ اٹھائے، ابو عمرو کہتے ہیں آپ کا ہاتھ اٹھانا تھا کہ میرے دل میں علم قرآن کا نزول ہونے لگا میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔

حضرت صاحب نے کوئی زیادہ طویل دعا نہیں فرمائی صرف اتنا کہا بار الہا! تیرا بندہ علم کی چھینی ہوئی دولت واپس مانگتا ہے۔ اسے علم جیسی دولت سے محروم نہ رکھ، اس کے علم کے ساتھ اسے باطن کی روشنی بھی عطا فرما۔

آپ نے دعا ختم کی منہ پر ہاتھ پھیرے تو ابو عمرو پہلے سے زیادہ علم قرآن کے مالک بن چکے تھے، پورا قرآن پھر سے یاد تھا وہ بہت خوش تھے، ان کا دل بلیوں اچھلنے لگا اس خوشی میں وہ ہر ایک چیز اپنے اس محسن پر قربان کرنے کو تیار تھے ان کے پاس اتفاق سے ایک ہزار دینار تھے انہوں نے نکالے اور آپ کے آگے ڈھیر کر دیئے مگر اس بزرگ نے ایک سکہ تک نہیں لیا۔

اور جب ابو عمرو فرط مسرت سے قدم بوس ہوا تو انہوں نے دریافت فرمایا کہ میرا پتہ تمہیں کس نے بتایا؟

ابو عمرو نے حضرت خواجہ حسن بصری کا نام بتایا۔

فرمانے لگے حسن بصری نے مجھے رسوا کر دیا ہے، میں تو اپنے آپ کو ایک دنیا دار کے روپ میں چھپائے ہوئے تھا اور میرا یہ راز بھی انہی کو معلوم تھا وہ اس راز کی حفاظت نہ کر سکے مجھے اس بات کا بڑا رنج ہے۔

اب میں بھی چاہتا ہوں کہ ان کا جو راز میرے پاس محفوظ ہے اسے فاش کر دوں ـــ سنو! ظہر کے وقت جو بزرگ دائیں طرف دیوار کے بالکل قریب نماز پڑھ رہے تھے، حسن بصریؒ ہی تھے۔ وہ بصرہ سے چلتے ہیں یہاں آ کر نماز پڑھتے ہیں، یہ ان کا روزانہ کا معمول ہے مجھ سے ملتے ہیں پھر ہم دونوں باتیں کرتے کرتے عصر کے وقت بصرہ میں پہنچ جاتے ہیں۔

ابو عمرو اس انکشاف پر حیران ہو گیا مکہ سے بصرہ تک آتے جاتے روزانہ ۱۴۰۰ میل کی مسافت طے کرتے ہیں اور پھر ۷۰۰ میل کا سفر صرف دو اڑھائی گھنٹوں میں طے ہو جاتا ہے۔ یہ تصرفات تو بس کسی ولی کامل کے پاس ہی ہو سکتے ہیں۔

حوالہ کے لئے:

۱۔ تذکرہ الاولیاء از حضرت فرید الدین عطارؒ

۲۔ مفتاح العلوم پہلی جلد از مولوی نذیر احمد عرفی نقشبندی مجددی

امدادی کتب، اردو انسائیکلوپیڈیا، مطبوعہ فیروز سنز

ماہنامہ نور اسلام، دسمبر ۱۹۹۵ء

شرقپور شریف

ماہنامہ ہدیٰ اسلامی ڈائجسٹ

جوتی کی اڑان

★ مرشد کے ارشاد اور کام میں حکمت ہوتی ہے وہاں تکرار درست نہیں۔

★ اللہ کے بندے خلوت پسند ہوتے ہیں۔ یہ خلوت انہیں ویرانوں میں ہی ملا کرتی ہے۔

★ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے مال بڑھتا ہے۔

★ اللہ کے بندوں کے منہ سے نکلی ہوئی بات مقبول بارگاہ ہوتی ہے۔

سلطان محمود غزنوی نے بت شکنی کے شوق میں ہندوستان پر سترہ حملے کئے۔ ۱۰۲۱ء میں اس کی فوجوں کی زد میں لاہور پڑتا تھا۔ لاہور پر اس وقت راجا بھیم سین کی حکومت تھی۔ یہ راجا بڑا بہادر تھا مگر اس کی فوج کے دل پر محمود غزنوی کی ہیبت چھا چکی تھی۔ فوجوں کی بیدلی نے انہیں جم کر لڑنے نہیں دیا۔ اس طرح سلطان کی فوجوں کے گھوڑے بڑی جلدی لاہور کی دیواروں کے سائے تلے آ کر ہنہنانے لگے۔

اب سلطان کالنجر اور گوالیار کا رخ کرنا چاہتا تھا۔ مگر لاہور کا انتظام کس کے سپرد کرے۔؟ امراء وزراء اور بہادر جرنیل اس کے سامنے تھے۔ ہر ایک کے دل میں خواہش تھی کہ لاہور کا حاکم اسے مقرر کیا جائے۔ مگر سلطان نے

گورنر کے تقرر کا فیصلہ ایک دو دن کے لئے موخر کر دیا۔

ایک دن صبح کی نماز سے فارغ ہوا تو ایاز دکھائی دیا۔ خوشی اور افسردگی کے جذبات یکدم پیدا ہوئے۔ فرمایا! ایاز! اگرچہ ہم تمہیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں مگر مفتوحہ علاقوں کا انتظام بھی چلانا ہوتا ہے۔ میں تمہیں سلطنت لاہور کا والی مقرر کرتا ہوں، میں امید کرتا ہوں کہ تم اسکے انتظام میں اپنی قابل داد صلاحیتوں کا ثبوت دو گے۔

ایاز نے سر جھکا دیا بہتر تھا کہ میں آپ کے ساتھ میدان جنگ میں رہتا مگر چونکہ آپ کا حکم ہے کہ میں لاہور میں رہ جاؤں۔ مجھے یہ حکم بجا لانے میں عذر نہیں ہو گا۔

اور ہاں! دیکھو ہم آپ کو بطور نائب ایک شخص دے رہے ہیں، جو یہیں کا رہنے والا ہے پڑھا لکھا اور سمجھدار ہے کہنے کو تو وہ ہندو ہے مگر وفاداری اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

آپ درست سوچ رہے ہیں میرے آقا! ایاز نے گردن جھکاتے ہوئے عرض کیا مگر سلطان نے نائب کا نام نہیں بتایا اور اپنے خیمے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ایاز کو طلب کیا گیا تو ایاز نے سلطان کے علاوہ ایک تیسرا شخص بھی دیکھا۔

سلطان نے کہا' دیکھو ایاز! یہ رائے راجو ہے جوگی ہے مگر امور سلطنت کو خوب سمجھتا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ یہ پورے اخلاص کے ساتھ آپ سے تعاون کرے گا۔ رائے راجو نائب صوبیدار تو بن گیا مگر اس نے سلطنت کے کاموں میں کوئی زیادہ دلچسپی نہ لی وہ ایک جوگی تھا اسے دنیا سے کنارہ کشی میں ہی لطف آتا تھا۔

ایاز نے جب امور سلطنت میں اس کی عدم دلچسپی دیکھی تو اس کے سارے کام خود ہی نبٹانے شروع کر دیئے۔ راجو دریائے راوی کے کنارے دھونی رما بیٹھا۔ ہندو عورتیں اس کے پاس آتیں اپنی مرادیں مانگتیں اور منتیں پیش کرتیں ان منتوں میں طرح طرح کی چیزیں ہوتیں عمدہ قسم کے کھانے ' پھل اور مٹھائیاں وافر مقدار میں پیش کی جاتیں،جوگی اکیلا ان ساری چیزوں کو کیسے کھاتا ایک آدھ گزرنے والے کو اس نے بلاکے کھانا کھلایا اور پھر اشتہار لگ گیا۔ کام کرنے سے عاری لوگ ادھر آجاتے انہیں سب کچھ کھانے پینے کو مل جاتا۔ ایسے لوگوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی اور ایک الگ بستی سی بن گئی جہاں کام کئے بغیر دنیا جہاں کی نعمتیں مل جاتی تھیں۔ آہستہ آہستہ ان لوگوں میں کئی مسلمان بھی شامل ہونے لگے۔

اُدھر حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے مرشد حضرت ابو الفضل بن حسن نے آپ سے فرمایا کہ لاہور چلے جائیں۔ رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیں اور اپنے باطنی علم سے مخلوق خدا کو فائدہ پہنچائیں۔

حضرت ابوالفضل بن حسن کے ایک مرید حضرت میراں حسین زنجانی رحمتہ اللہ علیہ پہلے ہی لاہور میں موجود تھے۔ اس لئے حضرت داتا گنج بخش کو تردد ہوا کہ یہ خدمات تو میرے بھائی حسین زنجانی پہلے ہی انجام دے رہے ہیں۔ اور وہ قطب الاقطاب بھی ہیں پھر وہاں میری کیا ضرورت ہے؟

مرشد نے فرمایا تمہیں اس سے کیا۔ تم حکم بجا لاؤ اور جلدی سے چلے جاؤ چنانچہ حضور داتا صاحب اپنے دو ساتھیوں حضرت شیخ احمد حمادی سرخی اور حضرت شیخ ابو سعید ہجویری کو ساتھ لے کر لاہور کی طرف چل دیئے۔

غزنی سے لاہور تک کا دشوار گزار رستہ ان تین افراد کے قافلے نے دن

رات ایک کر کے طے کیا۔ پہاڑوں ' وادیوں اور دریاؤں کو عبور کرتے کرتے لاہور میں ۱۰۳۹ء میں پہنچے۔

آپ شام کے وقت لاہور تشریف لائے۔ شہر کا دروازہ بند ہو چکا تھا آپ نے دروازے کے باہر ہی رات بسر کی،صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد آپ شہر کی مشرقی جانب چل دیئے۔ تو آپ نے دیکھا لوگوں کا ایک بڑا ہجوم جنازہ اٹھائے آ رہا ہے۔ آپ بھی اس کی نماز جنازہ میں شامل ہوئے۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس کا جنازہ ہے،لوگوں نے بتایا کہ یہ ایک ولی کامل کا جنازہ ہے۔ آپ کی روحانیت سے مخلوق خدا کے بے بہا فائدہ پہنچ رہا تھا ایسے لگتا ہے ان کے بعد اب یہ شہر ویران ہو جائے گا۔

اس ولی کامل کا نام نہیں بتائیں گے۔ آپ؟

ہاں ہاں یہ حضرت میراں حسین زنجانی ہیں جو ہمیں روتے چھوڑ کر چل دیئے ہیں لوگوں کی آہوں اور سسکیوں کی آواز برابر آ رہی تھی۔

جونہی آپ نے حضرت میراں حسین زنجانی کا نام سنا فوراً مرشد کے حکم کی حقیقت کو سمجھ گئے۔

بھاٹی دروازے کی بستی کے باہر بالکل ویرانہ تھا ایک بہت بڑا قبرستان تھا۔ درختوں کے جھنڈ میں سے دن کو بھی گزریں تو خوف آتا تھا۔

اللہ کے بندے خلوت پسند ہوتے ہیں یہ خلوت انہیں ویرانوں میں ہی ملا کرتی ہے، جہاں آپ کا مزار مبارک ہے آپ نے یہیں ڈیرہ ڈال دیا قریب ہی دریائے راوی کی موجیں ساحل کے ساتھ ٹکراتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

ایک صبح ایک عورت سر پر دودھ کا مٹکا اٹھائے گزری تو اس نے داتا

صاحب کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ خیال کرنے لگی ایک اور جوگی آ گیا ہے۔ یہ بھی اپنی دکان چمکانے کو بیٹھا ہے، مگر اس کی دکان کیسے چمکے گی؛ اس کا تو جوگیوں والا رنگ روپ ہی نہیں، نہ گیروے کپڑے ہیں، نہ لمبی لٹیں ہیں، نہ لٹوں میں راکھ ہے، نہ دھواں گرم ہے، نہ حقہ چلتا ہے۔

یہ عورت انہیں خیالوں میں گم جب حضور داتا صاحب کے پاس سے گزرنے لگی تو حضور داتا صاحب نے اسے روک لیا۔

فرمایا بیٹی تم کہاں جا رہی ہو اور اس مٹکے میں کیا ہے؟ گجری نے کہا۔ میرے مٹکے میں دودھ ہے میں اپنے جوگی کے پاس لئے جا رہی ہوں۔

کیا تمہارے جوگی کے پاس اور عورتیں بھی دودھ لے کر جاتی ہیں؟ داتا صاحب نے پوچھا۔

ہاں جوگی رائے راجو کے پاس اس قدر دودھ جمع ہو جاتا ہے کہ اگر وہ اس سے نہانا چاہیں تو نہا سکتے ہیں۔

اگر اس کی ضرورت سے زیادہ دودھ وہاں جمع ہو جاتا تو تم اپنے مٹکے والا دودھ مجھے دیدو۔ اور اس کی جتنی قیمت تم مانگو میں تمہیں دینے کو تیار ہوں۔

نا بابا نا میں آپ کو دودھ نہیں دے سکتی۔

آخر کیوں؟

اگر میں نے آپ کو دودھ دے دیا تو میری بھینسوں کے تھنوں میں سے لہو کی دھاریں بہہ نکلیں گی۔

لہو کی دھاریں کیوں بہنے لگیں گی۔؟ کیا ان کے تھن زخمی ہو گئے ہیں؟

نہیں بابا ۔۔۔۔۔ اگر ہم جوگی کو دودھ نہ دیں گے تو اس کی بد دعا سے تھنوں سے دودھ کی جگہ لہو آئے گا۔

حضور داتا صاحب مسکرا دیئے، فرمایا اگر تم مجھے دودھ دیدو گی تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے تمہاری گائیں اور بھینسیں بہت سا دودھ دیں گی اور جانوروں پر بھی کوئی برا اثر نہیں ہو گا۔

اس عورت کو آپ کی باتوں میں صداقت ہی صداقت نظر آئی۔ وہ آگے بڑھی اور دودھ سے بھرا ہوا اپنا مٹکا بابا جی کے آگے رکھ دیا۔ آپ نے تھوڑا سا دودھ پیا اور باقی دریا میں پھینک دیا۔

گجری بگڑ گئی۔ کہنے لگی آپ نے دودھ دریا میں کیوں پھینکا ہے؟ وہ آپ مجھے واپس کر دیتے۔ میں اتنا دودھ ہی جوگی کے پاس لے جاتی۔

اس لئے کہ ایک گھونٹ دودھ بھی جوگی کو نہ ملے، وہ خوب ناراض ہو۔ اسے غصہ آئے پھر وہ آپ کو بد دعا دے۔ تاکہ آپ کی بھینسوں کے تھنوں میں سے لہو آنے کے زیادہ امکانات پیدا ہوں۔ اور میرا اللہ لہو پیدا نہ ہونے دے۔ دودھ کی نہریں چل نکلیں۔ جتنا دودھ تم دوہتی ہو اس سے دوگنا تگنا دودھ تجھے ملے ۔ دودھ سے تیرے برتن بھر جائیں۔

گجری سہمے ہوئے دل کے ساتھ خالی مٹکا لے کر گھر چلی گئی۔ اور شام کا انتظار کرنے لگی کہ بابا جی کی بات سچی ہوتی ہے یا جوگی کی۔

شام کو جب گجری کا خاوند گھر میں آیا تو بھینسوں نے دیکھتے ہی رینگنا شروع کر دیا سروں کو ہلا ہلا کر اشارے کرنے لگیں۔

وہ تھپکی دے کر نیچے بیٹھا اور تھنوں کو سوتنا شروع کر دیا ۔ تھن دودھ سے بھر گئے دوہنے لگا تو دودھ ختم ہونے میں نہیں آتا تھا، گجری جان بوجھ کر باہر نکل گئی، کہیں تھنوں سے خون آیا تو میری شامت آ جائے گی۔ اس نے دروازے کے روزن میں سے دیکھا تو تھنوں سے سفید رنگ کی دھاریں نکل

رہی تھیں وہ جلدی سے خوشی خوشی اندر آئی ادھر دودھ سے برتن بھر گیا
اس نے دوسرا برتن دیا وہ بھی بھر گیا،پھر تیسرے برتن میں دوہنا شروع کیا۔

اسی طرح ساری بھینسوں نے روزانہ کے معمول سے دگنا تگنا دودھ
دیا۔ گجری نے خوشی خوشی اپنے خاوند سے کہا کہ راوی کنارے ایک اور بابا
آیا ہے۔ آج میں نے دودھ اسے دیا تھا اس نے کہا تھا کہ تمہاری بھینسیں
زیادہ دودھ دیں گی۔ اس کی بات بالکل سچ ثابت ہوئی ہے۔

یہ خبر آناً فاناً قرب و جوار کے دیہاتوں میں پھیل گئی۔ پھر اگلی صبح جتنے
لوگ راجو جوگی کو دودھ دیتے تھے وہ سب کے سب حضرت داتا صاحب کی
خدمت میں دودھ لے کر جانے لگے۔ راجو کے پاس دودھ کی ایک بوند بھی نہ
گئی۔ وہ ایڑیاں اٹھا اٹھا کر لوگوں کو دیکھتا لوگ دودھ کے مٹکوں کے ساتھ
آتے دکھائی دیتے مگر اس تک کوئی بھی نہ پہنچتا تھا۔

اس نے اپنے ایک چیلے کو بھیجا کہ پتہ کرے دودھ کس کے پاس جا رہا
ہے۔ اس نے آکر بتایا کہ ان کے رستے میں ایک اور بابا جی بیٹھے ہیں سارا
دودھ ان کے پاس جا رہا ہے۔

راجو بڑا پریشان ہوا۔ غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا آنکھوں میں خون
کے ڈورے آ گئے۔ وہ لال پیلا ہو کر اٹھا اور سیدھا حضرت صاحب کی
خدمت میں آیا، کہنے لگا دودھ تو تم نے ہمارا بند کر ہی دیا ہے۔ اب میں آپ
کا کوئی اور کمال دیکھنے آیا ہوں۔

آپ نے فرمایا میں کوئی جادو گر نہیں ہوں۔ جو اپنے کمالات تم کو دکھا
سکوں میں تو بس ایک عاجز و مجبور انسان ہوں۔ اگر تم میں کوئی کمال ہے تو
دکھاؤ؟

چونکہ اس جوگی نے ہندووانہ طریقے سے بڑی بڑی ریاضتیں کی تھیں اور
مجاہدہ میں زندگی گزاری تھی۔ اس نے اپنے بس کے کئی کرشمے دکھائے حتی
کہ ہوا میں اڑنے لگا، اتنی بلندی پر جاتا کہ دکھائی نہ دیتا۔ نیچے آتا پھر مشرق
و مغرب کی دوریوں تک جانے میں تیزی دکھاتا، آپ کے قریب سے گزرتا تو
کہتا۔

آئیں نا آپ بھی اڑ کر دکھائیں آپ کی پرواز کی کوئی اڑان تو میں بھی
دیکھوں۔ اگر تم اڑ نہیں سکتے تو مجھے ہی نیچے اتار کر دکھائیں؟

اب آپ نے اپنی جوتی مبارک اس کی طرف پھینکی وہ جوتی اڑنے لگی۔
اس کے سر تک گئی اور مارنا شروع کر دیا۔ وہ جدھر جاتا جوتی ادھر ہی جا کر
اس کے سر کی خوب مرمت کرتی، وہ جتنا تیز اڑتا جوتی بھی اتنی تیزی کے
ساتھ اسے شکار کر لیتی۔ جوگی تنگ آ گیا حق کے سامنے باطل کی کوئی پیش نہ
گئی، تو نیچے اتر آیا۔

اس کے پسینے چھوٹے ہوئے تھے سانس اکھڑا ہوا تھا۔ خدمت میں حاضر
ہوا۔ عرض کی حضور معاف فرما دیں مجھے دائرہ اسلام میں داخل کر لیں۔

آپ نے فرمایا جاؤ دریا میں نہا کر آؤ۔ آپ نے اسے کلمہ پڑھایا اور
مسلمان کیا۔ اس کا نام راجو کی بجائے عبداللہ رکھا۔ پھر یہی عبداللہ بیعت ہو
کر حلقہ ارادت میں داخل ہوا اور اپنی پوری زندگی آپ کی خدمت میں رہ کر
گزارنے کا عزم کیا۔ اس کی عقیدت محبت اور خلوص کی جھولی جو بھری ہوئی
دیکھی، تو آپ نے اسے گلے لگا لیا۔ خلافت دی اور شیخ ہندی کا لقب عطا فرمایا
اور دعا دی کہ میرے وارث تم اور تمہاری اولاد ہو گی۔ تاریخ اس بات پر شاہد
ہے کہ حضرت داتا صاحب کی کوئی اولاد نہ تھی۔ ایک بیٹا حسن نامی پیدا ہوا جو

شیر خوارگی میں ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس طرح شیخ ہندی کی اولاد ہی جو نسل واحدہ (نسلاً بعد نسل ایک بیٹا رہتا) آپ کی سجادہ نشین رہی۔ نسل واحدہ بارہ پشتوں تک چلتی رہی۔ پھر اکبر بادشاہ کے عہد میں حضرت شیخ لطیف اللہ رحمتہ اللہ علیہ اور ان کے خاندان کے دیگر افراد نے داتا صاحب کے مزار پر اولاد کے سلسلہ میں خیر کثیر کے لئے خصوصی استدعا کی تو حضرت داتا صاحب رحمتہ اللہ علیہ کے طفیل اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور خانوادہ حضرت شیخ ہندی میں بتدریج اضافہ شروع ہوا۔

امدادی کتب حوالہ کے لئے

گلزار اولیاء، از علامہ عالم فقیری
فیروز سنز اردو انسائیکلوپیڈیا
تاریخ ادبیات مجلد تیسری۔ چوتھی (پنجاب یونیورسٹی لاہور)
نور اسلام، شرقپور شریف
اگست ۱۹۹۴ء

شمسی حوض کی تعمیر

- ★ ولی کامل نے ایک غلام لڑکے کو بتا دیا کہ وہ بادشاہ بنے گا۔
- ★ ولی کامل نے قبل از وقت بادشاہ کو اس کے خواب سے آگاہ کر دیا۔
- ★ مرید اور مرشد کے تعلقات کے احترام کی روشن مثال۔
- ★ ولی کامل نے توجہ کی تو ناپسندیدہ جگہ بھی پسندیدہ بن گئی۔
- ★ رفاہ عامہ کے کاموں میں اللہ تعالی آسانیاں پیدا کر دیتا ہے۔

بخارا شہر کے باہر ایک خوبصورت بچہ بیٹھا ہوا رو رہا تھا۔ ایک فقیر ادھر سے گزرا بچے کو دیکھ کر اسے ترس آ گیا۔ پوچھا بیٹا! کیا بات ہے۔ تم نے رو رو کر اپنا حال کیوں اس قدر ویران کر لیا ہے۔ لڑکا کچھ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا۔ فقیر نے دوبارہ پوچھا، بیٹا! اگر تم نے بازار سے کوئی چیز لینی ہے تو آؤ میرے ساتھ میں تمہیں لے دوں۔ لڑکے نے روتے ہوئے کہا۔

میاں جی! میں بازار سے اپنے مالک کے لئے انگور لینے آیا تھا۔ مگر جو پیسے میرے مالک نے انگوروں کے لئے دیئے وہ مجھ سے کہیں گم ہو گئے ہیں۔ اب مالک کے خوف نے مجھے اس قدر ہراساں کر رکھا ہے۔

اس فقیر نے لڑکے کو انگور خرید کر دے دیئے اور کہا بیٹا! اگر خدا تمہیں کسی وقت بادشاہ بنا دے تو فقیروں اور حاجت مندوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا جو خدا نے اس وقت تمہارے ساتھ کیا ہے۔

میں بادشاہ بن جاؤں گا! لڑکے نے حیران ہو کر عرض کیا۔ میں تو غلام ہوں، غریب ہوں، میری غربت زندگی بھر مجھے غلام ہی رکھے گی۔

بیٹا تیرے ماتھے کا ستارہ مجھے بتا رہا ہے کہ تم یقیناً" ایک دن بادشاہ بنو گے۔

لڑکا برابر غلامانہ زندگی گزارتا رہا ایک مالک کے ہاتھ سے دوسرے مالک کے ہاتھ بکتا رہا یہاں تک کہ یہ لڑکا بغداد میں آکر بھی بک گیا۔

بغداد کے ایک امیر کے ہاں محفل سماع تھی۔ قوال عارفانہ کلام سنا رہے تھے سامعین کا ایک جم غفیر جمع تھا۔ حضرت حمید الدین ناگوری رحمتہ اللہ علیہ اس محفل کی صدارت فرما رہے تھے۔ جبکہ ان کے ہمراہ خواجہ فرید الدین مسعود گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ اور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ تشریف فرما تھے۔ بعض سامعین پر وجد طاری تھا اور اکثر ہر ہر شعر پر جھوم جھوم جاتے تھے۔ فنافی اللہ قسم کے لوگ تڑپ تڑپ کر داد دے رہے تھے۔

میر محفل کا ایک غلام جو بڑا خوبصورت لڑکا تھا ہاتھ میں شمع لئے کھڑا تھا۔ محفل پر مختلف کیفیتیں طاری ہوئیں مگر یہ لڑکا بڑی استقامت کے ساتھ کھڑا رہا رات نصف سے آگے بڑھی تو بعض لوگ نیند کی آغوش میں جانے لگے اور کچھ اٹھ اٹھ کر اپنے گھروں میں چل دیئے مگر یہ لڑکا اسی طرح شمع ہاتھ میں لئے کھڑا رہا قاضی حمید الدین ناگوری رحمتہ اللہ علیہ نے اس لڑکے کو دیکھا تو بڑے خوش ہوئے پھر ان پاک طینت فقراء کی توجہ اس طرف دلائی اور اس کے حق میں دعا کروائی کہ اللہ تعالیٰ اس خاک کے ذرے کو عرش کی رفعتوں تک پہنچا دے۔ اسے مس خام سے کندن بنا دے اور اس کی غلامانہ زندگی کی زنجیروں کو توڑ کر آقا بنا دے۔

ان پاک طینت فقراء کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی اللہ تعالیٰ نے لاج رکھ لی۔ یہ غلام بکتا بکتا قطب الدین ایبک تک پہنچا اولا" اس کا داماد بنا اور بعد ازاں تخت دہلی پر متمکن ہوا۔

یہ غلام وہی لڑکا تھا جو بخارا کے بازار میں انگور خریدنے گیا تو پیسے کھو بیٹھا اور ایک جگہ بیٹھ کر رونے لگا تھا۔ ایک فقیر نے اسے انگور خرید کر دیئے اور فرمایا کہ جب تم کبھی بادشاہ بن جاؤ تو فقیروں اور حاجت مندوں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرنا جیسا تیرے رب نے آج تیرے ساتھ کیا ہے اور پھر یہ غلام بغداد کی ایک محفل سماع میں حضرت حمید الدین ناگوری رحمتہ اللہ علیہ، حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر اور حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کی خاص توجہ اور دعاؤں کا مرکز بن گیا۔ یہ غلام جو آج تخت دہلی پر متمکن ہوا سلطان شمس الدین التمش ہے۔ جو بچپن سے اب تک فقراء پاک طینت کے کمالات دیکھ رہا تھا اس کے دل میں ایسے فقراء کی بے حد قدر و منزلت پیدا ہو چکی تھی اور خاص کر کے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کا اعلیٰ و ارفع مقام اس کے دل میں جاگزیں تھا۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ، حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید خاص اور خلیفہ تھے۔ خلافت پانے کے بعد حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے ہمراہ بغداد شریف میں تشریف لے گئے وہاں آپ نے اپنے مرشد کے ہاں بڑی ریاضتیں کیں اور خلق خدا کو بھلائی کا رستہ دکھایا اور بھلائی کی ہدایت کی پھر حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ تو وہاں سے چلے آئے اور اجمیر شریف کو اپنا مسکن بنا لیا مگر حضرت خواجہ وہیں رک گئے۔

کچھ مدت کے بعد آپ کے دل میں مرشد کی یاد چٹکیاں لینے لگی۔ فرقت کی گھڑیوں نے دل کا سکون چھین لیا۔ اضطراب اور بے قراری نے آنکھوں سے نیندیں ہتھیا لیں۔ آپ چاہتے تھے کہ "پرندہ بن کر جاؤں اور مرشد کی قدم بوسی کر کے آؤں۔"

چنانچہ آپ مرشد کے ہاں جانے کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ منزلیں طے کرتے ہوئے ملتان میں تشریف لے آئے تو حضرت شیخ بہاؤالدین اور حضرت جلال الدین تبریزی سے بھی ملے ان دونوں حضرات کو آپ سے بے حد عقیدت ہو گئی اور آپ کی بے حد خدمت کی اس طرح آپ کچھ دنوں تک ملتان میں ٹھہرے رہے پھر ان بزرگوں کی اجازت سے آپ دہلی میں تشریف لائے۔

یہاں سے آپ نے حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کو ایک عریضہ لکھا اور اجمیر شریف ارسال فرمایا کہ بندہ حقیر آپ کی قدم بوسی سے مشرف ہونا چاہتا ہے۔ دہلی کے باہر قیام پذیر ہے اگر اجازت ہو تو اجمیر شریف میں حاضر ہو کر قدموں میں سر رکھ سکے۔ آپ کے پیرو مرشد کو جب یہ خط ملا تو آپ بے حد خوش ہوئے۔ اسی وقت جواب میں لکھا کہ "قرب روحانی کو بعد مکانی مانع اور مزاحم نہیں اور نہ ہو گا۔" ---- اور مزید تاکید کی کہ آپ کو دہلی میں رہنا چاہئے یہاں کے لوگوں کو آپ کے وجود مسعود سے فائدہ ہو گا۔

اگرچہ آپ فراق کی آگ میں جل رہے تھے۔ اجمیر شریف جانے کا اضطراب انہیں کہاں سے کہاں تک کھینچ لایا تھا مگر مرشد کے اشارے کو سر آنکھوں پر رکھا اور دہلی میں قیام پذیر ہو گئے بعد ازاں آپ گاہے گاہے اجمیر

شریف میں تشریف لے جاتے رہے۔

ابھی آپ بغداد میں تھے کہ آپ کی شہرت کی خبریں ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچ چکی تھیں۔ جگہ جگہ آپ کی قدردانی ہو رہی تھی دہلی کے تخت پر اس وقت سلطان شمس الدین التمش رونق افروز تھا۔

طبقات ناصری میں لکھا ہے کہ شمس الدین التمش فراختائی ترکوں کے ایک بہت بڑے گھرانے کا بیٹا تھا اس کا باپ ایلم خان تھا وہ البری قبیلے کا سردار تھا التمش اپنی سیرت اور صورت کے اعتبار سے سب بھائیوں میں ممتاز تھا۔ اس امتیاز پر اس کے بھائی اس پر خوش نہ تھے۔ وہ اس کے دشمن بن گئے اور اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کے بھائیوں نے کیا تھا۔ بھائیوں اور بھتیجوں نے مل کر اسے بیچ ڈالا پھر یہ سوداگر اسے بخارا میں لے آئے اور صدر الدین بخاری کے ایک رشتہ دار کے ہاتھ معقول رقم لے کر بیچ ڈالا۔ پھر حاجی بخاری نے خریدا، پھر حاجی جمال الدین چست قبا نے خریدا، پھر غزنی آیا یہاں سلطان شہاب الدین غوری نے خریدنے کی کوشش کی مگر سودا نہ ہو سکا۔ پھر اس غلام کو سلطان قطب الدین ایبک نے خریدنے کی خواہش کی مگر شہاب الدین غوری نے روک دیا کہ یہ غلام غزنی کے بازاروں میں کسی بھی قیمت پر نہیں بک سکتا اگر تم زیادہ ہی اصرار کرتے ہو تو تم دہلی جاؤ اور اس غلام کے سوداگر کو وہاں بلاؤ پھر سودا کرو۔

چنانچہ ایسے ہی ہوا قطب الدین ایبک نے اسے دہلی میں منگوا کر خرید لیا قطب الدین ایبک اس کی صورت پر تو پہلے ہی فریفتہ تھا سیرت بھی اسے پسند آئی تو اپنی بیٹی کا نکاح اس سے کر دیا۔ اور پھر جب قطب الدین ایبک فوت ہو گیا تو یہ شمس الدین التمش جس نے اپنے بچپنے کا آغاز غلامانہ زندگی سے کیا

تھا،تخت دہلی پر رونق افروز ہوا۔

حضرت خواجہ بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ دہلی کے باہر ہی ہیں۔ مرشد کو خط لکھ چکے ہیں کہ جواب آئے تو دہلی میں داخل ہوئے بغیر اجمیر شریف تشریف لے جائیں سلطان کو خبر ہوئی کہ آپ شہر کے باہر تشریف فرما ہیں۔ سلطان اس وقت تخت دہلی پر بیٹھا امور سلطنت کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ سب سے اہم مسئلہ اس وقت لکھنوتی کا تھا جہاں اس کا بیٹا ناصر الدین حاکم تھا۔ اس کی اچانک موت سے فتنوں نے سر اٹھا لیا تھا۔ ..... سلطان شمس الدین لکھنوتی کی طرف جانے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کی دہلی میں آمد کی خبر ملی اور مزید پتہ چلا کہ آپ دہلی کے باہر تشریف فرما ہیں شہر میں آپ آنا نہیں چاہتے۔

شمس الدین التمش اسی وقت کھڑا ہو گیا،اس نے دربار کے سارے کاموں کو موقوف کر دیا۔ وہ ننگے پاؤں دربار شاہی سے نکل کھڑا ہوا اس کے کندھے پر رکھی ہوئی چادر زمین پر گھسٹتی جا رہی تھی۔ ایک خادم نے آگے بڑھ کر بادشاہ کا جوتا رکھ دیا بادشاہ نے چلتے چلتے اسے پہنا .... بادشاہ نے کسی بھی خدم و حشم کو ساتھ لے جانے کی پرواہ نہ کی ....حضرت قطب الدین بختیار کاکی اس وقت دہلی سے پانچ کوس دور موضع کیلوکھ میں قیام کئے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے یہ سارا فاصلہ گھوڑے کے بغیر پیدل طے کیا۔

جونہی بادشاہ کو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کی قیام گاہ نظر آئی وہ سراپا نیاز بن گیا،اس کا سر جھک گیا،اس کی نظریں جھک گئیں،اس کے قدموں کی رفتار دھیمی ہو گئی۔ ...... بادشاہ غلامانہ انداز میں چلتا رہا اور حضور کی بارگاہ میں پہنچ گیا۔ اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر حضور

کے قدموں کو بوسہ دیا اور ہاتھ باندھ کر اور سر کو جھکا کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔

حضور نے دریافت فرمایا شمس الدین کیسے ہو؟ آؤ یہاں بیٹھ جاؤ۔

بس حضور خیریت سے ہوں۔ بادشاہ نے عرض کیا۔

آؤ! کیسے آنا ہوا۔ خواجہ صاحب نے پوچھا۔

میری تمنا ہے کہ آپ شہر میں تشریف لے چلیں۔

مگر آپ نے فرمایا شمس الدین ابھی نہیں۔ جیسے مجھے حکم ہو گا ویسے کروں گا۔

بادشاہ کافی دیر تک وہیں بیٹھا رہا پھر اجازت ملنے پر واپس آ گیا۔

بادشاہ ہفتے میں دو بار آپ کی خدمت میں جاتا اور اصرار کرتا رہا کہ آپ شہر میں تشریف لے چلیں مگر آپ اپنے مرشد کے حکم کے منتظر تھے۔ اس لئے آپ نے ہر بار یہی فرمایا جیسے حکم آئے گا ویسے کروں گا۔

آخر ایک دن آپ کو مرشد کا خط ملا کہ آپ دہلی میں رہیں اور لوگوں کو ہدایت دیں .... مرشد کا پیغام جونہی آپ تک پہنچا اس کے تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ شمس الدین بھی آ گیا اور پھر منتیں کرنے لگا۔

اب آپ نے بادشاہ کی بات مان لی اور شہر دہلی میں تشریف لائے۔ مسجد اعزالدین کے پاس ایک عمدہ جگہ تھی وہ آپ کے حوالے کر دی گئی۔

ان دنوں دہلی کے شیخ الاسلام جمال الدین محمد بسطامی تھے۔ آپ بڑے پائے کے بزرگ ہیں وہ بھی آپ کے پاس آئے اور آتے ہی آپ کے معتقد ہو گئے۔ اس طرح دونوں کے درمیان بڑا خلوص اور محبت ہو گئی۔

دہلی میں قیام کے دوران امراء رؤساء اور غرباء آپ کی خدمت میں

حاضر ہوتے اور دینی و دنیوی دولت کے خزانے لوٹ لوٹ کے لے جاتے خلق خدا کی ایک کثیر تعداد آپ کی ہدایت سے مستفید ہونے لگی ...... سب لوگ آپ پر فریفتہ تھے کیونکہ آپ جیسا روشن دل اور روشن دماغ بزرگ انہوں نے دیکھا ہی کب تھا۔

پھر دہلی کے شیخ الاسلام حضرت جمال الدین محمد **بسطامی اچانک** رحلت فرما گئے۔ یہ عہدہ خالی ہو گیا۔ بادشاہ کو اس عہدہ کے لئے کوئی موزوں آدمی نہ ملتا تھا۔ اس کی پریشانی میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ آخر ایک دن ڈرتے ڈرتے بادشاہ حضور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا حضور! شیخ الاسلام کا عہدہ خالی پڑا ہے میری بڑی سعادت ہو گی کہ آپ اس عہدہ کو قبول فرمائیں۔

مگر خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کی تو ایسی باتوں کی طرف توجہ ہی نہ تھی۔ .... آپ نے اس عہدہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ہرگز ہرگز اس امر کو قبول نہ کیا۔

پھر بادشاہ نے مجبور ہو کر یہ عہدہ شیخ نجم الدین صغریٰ کو دے دیا جو خود بھی اس عہدہ کے لئے مدت سے خواہش کرتے تھے۔

سلطان شمس الدین جب سے تخت دہلی پر متمکن ہوا تب سے اس کے دل میں ایک ایسی خواہش نے جنم لیا جو اس کے اندر ہی پروان چڑھتی رہی کہ وہ ایک ایسا حوض تعمیر کرے جو ساری مخلوق خدا کے لئے فائدہ مند ہو، اس کا پانی شیریں ہو، ٹھنڈا ہو، صحت کے لئے نہایت مفید ہو۔ ...... وہ جب بھی شہر دہلی سے باہر نکلتا جگہ کے انتخاب کرنے کا خیال اس کے دل میں ضرور موجزن ہوتا اور اس کی تعمیر کا نقشہ تو جاگتے سوتے اٹھتے بیٹھتے بناتا ہی

رہتا تھا۔

جب سے حضرت خواجہ قطب الدینؒ بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ دہلی میں تشریف لائے بادشاہ کا یہ خیال جنون کی حد تک اس کے دل و دماغ میں اثر انداز تھا، آخر کار اسے ایک دن خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے روبرو بیان کرنا پڑا۔

حضور! میں چاہتا ہوں کہ دہلی میں ایک حوض کی تعمیر کروں جو حوض شمسی کے نام سے مشہور ہو اس کا پانی صحت کے لئے مفید ہو، میٹھا بھی ہو، ٹھنڈا بھی ہو، میں ابھی تک اس کے لئے کسی بھی مقام کا تعین نہیں کر سکا ہوں۔ آپ میری رہنمائی فرمائیں تاکہ میرے شوق کی تکمیل ہو سکے۔

بڑا اچھا خیال ہے آپ کی نیت میں سے خلوص ٹپکتا ہے یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کو اس راہ میں کامیاب فرمائے گا۔ .....جاؤ جگہ ڈھونڈو اور ہمیں بتاؤ۔

بادشاہ تو اس جستجو میں کئی بار نکل چکا تھا اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ .... مگر اب وہ جس جگہ پر بھی جاتا وہیں حوض بنانے کی جگہ اسے پسند آ جاتی پہلے جگہ پسند نہ آئی تھی۔ اب پسندیدہ جگہوں میں انتخاب مشکل ہو گیا۔

بادشاہ پھر حضرت خواجہ صاحب کے ہاں حاضر ہوا اور عرض کی حضور میں نے جن جگہوں کو پہلے ناپسند کیا تھا اب وہی جگہیں مجھے پسند آ رہی ہیں اور انتخاب کرنا مشکل بن گیا ہے۔ اب آپ ہی کسی جگہ کا تعین فرما دیں۔

حضور خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ اٹھے اور بادشاہ کو ساتھ لے کر چل دیئے ..... لوگوں نے دیکھا کہ جو بادشاہ خدام کے جلو میں چلا کرتا تھا آج خود ایک خادم بن کر حضور خواجہ کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے۔ ..... اس وقت جہاں حوض شمسی ہے وہاں آکر حضور ٹھہر گئے۔ چاروں طرف

نگاہ ڈالی ماحول کو دیکھا۔ فرمایا۔

شمس الدین آپ یہاں حوض بنائیں گے۔ اس جگہ کا تصور کر کے رات کو سو جائیں ممکن ہے اس جگہ کے بارے میں کچھ مزید فوائد آپ پر ظاہر ہوں۔

شمس الدین نے عشاء کی نماز پڑھی، کچھ نوافل بھی پڑھے اور پھر اسی مصلّے پر لیٹ گیا لیٹتے ہی وہ نیند کی سہانی آغوش میں آرام کرنے لگا کہ اچانک اس نے برکتوں والا ایک خواب دیکھا کہ وہ جیسا حوض چاہتا تھا ویسا بنا ہوا ہے اس کے چبوترے پر وہ کھڑا ہے کہ ایک نورانی شخصیت گھوڑے پر سوار تشریف لائی اس قدر خوبصورت کہ تعریف نہیں ہو سکتی چند اور آدمی بھی ہمراہ ہیں۔ جب اس گھڑسوار نے شمس الدین کو دیکھا تو فرمایا۔

شمس الدین اس قدر متفکر کیوں ہو؟ کیا چاہتے ہو کیا آرزو اور تمنا ہے۔

بادشاہ نے عرض کیا۔ حوض کی تعمیر کرنا چاہتا ہوں۔ جس سے خلقِ خدا کو فائدہ پہنچے۔ اس کا پانی صحت کے لئے مفید ہو۔ پانی ٹھنڈا بھی ہو اور میٹھا بھی۔

ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں۔ کہ ایک شخص نے کہا۔

شمس الدین یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ تیرے بخت بیدار ہیں جو چاہتا ہے، مانگ لے تو اپنے مقصود میں کامیاب ہو گا۔

بادشاہ کے ذہن پر بس حوض کی تعمیر سوار تھی وہ بار بار حوض کی بات ہی کرتا رہا.... کہ اچانک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑے نے زمین پر ایک کھر مارا۔ فوراً" اس جگہ سے پانی بہنے لگا۔

حضور نے فرمایا شمس الدین اس جگہ پر حوض ضرور بنائیو۔ یہ خلق خدا

کے لئے مفید ثابت ہو گا پانی بھی اتنا لذیذ ہو گا کہ کہیں سے نہ ملے گا۔ ......

پھر شمس الدین جاگ گیا وہ آنکھیں مل مل کر دیکھنے لگا کہ وہ سہانا منظر جو ابھی ابھی اس کی آنکھوں کے سامنے تھا کدھر گیا؟ وہ نورانی شخصیت کہاں گئی؟ وہ پھر لیٹ گیا اس نے بار بار آنکھیں بند کیں کہ شاید وہ نظارے دوبارہ دیکھ سکے۔ مگر ایسا نہ ہو سکا پھر اسے نیند نہ آئی کروٹیں بدل بدل کر صبح کی۔

صبح کی نماز پڑھنے کے بعد وہ سیدھا حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے در دولت پر حاضر ہوا۔

حضور خواجہ نے جونہی بادشاہ کو دیکھا آپ مسکرا دیئے فرمایا۔

کیوں بھئی اب تو خوش ہونا۔ جاؤ اسی جگہ کو دیکھ کر آؤ جہاں تم کل گئے تھے۔

بادشاہ نے وہاں جا کر دیکھا تو اس کی حیرانی کی انتہا نہ رہی کہ وہاں گھوڑوں کے سموں کے نشان ہیں، اور ایک جگہ سے پانی بہہ رہا ہے۔

بادشاہ پھر حضور خواجہ کے پاس آیا اور خواب کی کیفیت اور صداقت بیان کرنے لگا۔

آپ نے فرمایا شمس الدین مت کرو ذکر اس بات کا بس حوض کی تعمیر کا کام شروع کرو۔

چنانچہ یہ حوض شمسی جو اس وقت دہلی میں ہے وہی ہے جس کے پانی نے حضور آقائے دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے گھوڑے کے قدموں کو چوما تھا۔

حوض بنا تو اس کا شمار عجائب روزگار میں ہونے لگا سارے حوض پر سنگ سرخ استعمال کیا گیا دو سو چھتر بھیگہ اور آٹھ بسوہ کے رقبہ میں یہ پختہ حوض

پھیلا ہوا ہے اور دیگر باغات اور عمارات اس کے علاوہ ہیں اگرچہ اب اس کی وہ پہلی سی شان نہیں ہے اور اس کا رقبہ سکڑ گیا ہے۔ مگر پھر بھی دنیا کا کوئی حوض اپنی بڑائی کے اعتبار سے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔حوض کا پانی اس قدر وافر تھا کہ "قطب الدین کے جھرنے میں پانی اسی حوض سے جاتا تھا اور پھر سلطان فیروز شاہ اسی حوض سے قلعہ تغلق آباد تک لے گیا۔

حوالہ کے لئے

ا۔ سوانح عمری حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی شائع کردہ اللہ والے کی قومی دکان

۲۔ تاریخ فرشتہ' از محمد قاسم فرشتہ

۳۔ آثار الصنادید از سرسید احمد خاں

ماہ نامہ نور اسلام، شرقپور شریف

نومبر ۱۹۹۱ء

حدیث دلنواز

☆ ولی اللہ کی نگاہ مستقبل کے حالات کو دیکھنے کی قوت رکھتی ہے۔

☆ ولی اللہ نے ایک عورت کی وساطت سے اورنگ زیب عالمگیر کی تخت نشینی کا فیصلہ فرمایا۔

☆ حضرت شہ دولا رحمتہ اللہ علیہ نے عورت کے قتل کی رسم کو آن واحد میں ختم کر دیا۔

حضرت شہ دولا گجراتی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کا سلسلہ طریقت بہاؤ الدین زکریا ملتانی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ سے ملتا ہے جبکہ نسب کا سلسلہ سلطان بہلول لودھی سے جا ملتا ہے۔ مغل شہنشاہ ظہیرالدین بابر نے لودھیوں کو تباہ کر کے رکھ دیا تو اس خاندان کے بچے کھچے لوگ مختلف جگہوں میں جا بسے' کچھ لوگوں نے روحانیات میں مقام حاصل کیا۔ حضرت شہ دولا انہیں لوگوں میں سے تھے، آپ بڑے صاحب کرامت بزرگ تھے۔ عہد طفولیت میں ہی آپ یتیم ہوگئے آپ کو ایک سفاک آدمی نے ایک ہندو لالہ کے ہاتھ ۲۰۰ اشرفیوں میں فروخت کر دیا۔ سن شعور کو پہنچے تو آپ کی بعض خرق عادت باتوں کی بنا پر لالہ نے آپ کو آزاد کر دیا۔ اب آپ سید سرمست سیالکوٹی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت سید سرمست نے آپ کی باطنی تربیت کی تو آپ پر جذب کی کیفیت رہنے لگی۔

آپ بڑے خوش بیان اور بڑے خوش گفتار بزرگ تھے۔ آپ ایک باوقار سالک اسرار الٰہی سے آگاہ اور روشن ضمیری کی صفت سے متصف تھے' آپ ایک مدت تک انسانی خدمت کرتے رہے' آپ نے ۱۰۷۵ھ میں وصال فرمایا اور گجرات میں مدفون ہوئے۔

عہد مغلیہ کا عظیم فرماں روا اورنگ زیب ۲۴ اکتوبر ۱۶۰۸ء میں گجرات اور مالوہ کے سرحدی مقام دوحد میں پیدا ہوا، یہ شاہجہان کا تیسرا لڑکا تھا۔ اس نے بڑی ذہین طبیعت پائی تھی' مروجہ تعلیم بڑے شوق سے حاصل کی' خصوصیت کے ساتھ علوم دینیہ میں گہری دلچسپی تھی' بچپن سے ہی سلیم الفطرت تھا۔ طبیعت میں متانت' حوصلہ مندی' شجاعت اور زہد و تقوٰی کے اوصاف موجود تھے۔ شروع سے اس کی زندگی زاہدانہ تھی اور وہ ان آلائشوں سے محفوظ تھا جو کہ عموماً مغل شہزادوں کی کمزوری تھی۔

تاریخ برصغیر میں اورنگ زیب کے عہد حکومت کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے' غزنی سے لے کر چاٹگام تک اور کشمیر سے لے کر ناٹک تک اس کے نام کا سکہ چلتا تھا' ہر مسجد میں اسی کے نام کا وظیفہ پڑھا جاتا تھا۔ تخت نشین ہونے کے بعد اس نے قرآن پاک حفظ کیا' اس نے خط نسخ میں قرآن پاک کے دو نسخے اپنے ہاتھ سے لکھے اور اس پر سات ہزار روپے کے خرچ سے مطلا حواشی چڑھا کر مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں تحفہ کے طور پر روانہ کیے۔

اورنگزیب جب فوت ہوا تو اس نے وصیت کی کہ چار روپیہ دو آنے جو کہ اس نے ٹوپیوں کی سلائی کے بچے ہیں اور ۳۰۵ روپے جو کہ قرآن پاک کی کتابت سے کمائے ہیں' غرباء میں بطور صدقہ تقسیم کر دیئے جائیں۔

قبل از اسلام سے اب تک کے تقریباً ہر دور میں بچیوں کی پیدائش پر کوئی زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا جاتا رہا' صرف اسلام نے ہی ایک ایسا معاشرہ تشکیل دیا جس نے عورت کی پیدائش کو مستحسن قرار دیا، ورنہ اکثر لوگ تو عورت کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دیتے' یا زمین میں زندہ دفن کر دیتے تھے۔ اسلام نے ایسی پیدا ہونے والی لاکھوں' کروڑوں بچیوں کو تحفظ دیا۔ انہوں نے نہ صرف اپنی طبعی عمرگذاری بلکہ معاشرے میں ایک عزت کا مقام بھی پایا۔

اس کے باوجود کچھ خاندانوں اور کچھ مذہب والوں نے عورت کے مقام کو نہ سمجھا اپنے خاندان کی بے عزتی خیال کرتے ہوئے انہیں مار دیتے رہے۔ ایسے ہی خاندانوں میں گجرات میں ملک راجو ہندو کا خاندان تھا ملک راجو بذات خود اولاد نرینہ ے محروم تھا۔ [illegible] کے ہاں لڑکیاں پیدا ہوتی رہیں اور موت کی بھینٹ چڑھتی رہیں۔ ملک راجو کی بیوی نہ جانے کتنی بار امید سے ہوئی' بچی کو جنم دیا مگر اولاد نام کی نعمت ے محروم رہی۔ اس کی گود ماں کی ممتا سے خالی رہی جب بھی امید سے ہوتی اپنے ہر بت کے آگے گڑگڑا کر روتی اور التجائیں کرتی کہ کاش اس کے ہاں کوئی بیٹا پیدا ہو' مگر بیٹا شائد اس کی قسمت میں نہ تھا۔ ادھر ملک راجو کی جوانی کا سورج بھی نصف النہار ے آگے پہنچ چکا تھا مگر اسے نہ تو اس کے بڑھاپے کا سہارا مل سکا اور نہ ہی خاندان کے نام کو زندہ رکھنے والا کوئی بیٹا۔ اس کا دل روز بروز بجھتا چلا جا رہا تھا۔ اس کا اعتقاد دیویوں اور دیوتاؤں سے اٹھ رہا تھا' اب تو اس نے مزاروں کی چوکھٹوں پر بھی جا جا کر ماتھا ٹیکنا شروع کر دیا تھا اور وقت کے ولیوں کے آستانوں پر حاضر ہونے لگا تھا۔

اب کے جب اس کی بیوی امید سے ہوئی تو ملک راجو وقت کے کامل ولی اللہ اور بزرگ شخصیت حضرت سید پیر شاہ دولا رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں آیا اور آپ کے قدموں میں سر رکھ دیا اور رونا شروع کر دیا۔

شاہ صاحب نے اس کے سر کو اٹھایا اور آنے اور گریہ زاری کی وجہ پوچھی' ملک راجو کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

حضرت جی! میرے پاس لڑکیاں ہی پیدا ہوتی ہیں چاہتا ہوں کوئی لڑکا پیدا ہو کہ میرا نام بھی زندہ رہ سکے۔

آپ نے آسمان کی طرف نگاہ کی اور مسکرا دیئے۔ فرمایا۔

راجو اب کے بھی تیرے ہاں لڑکی پیدا ہوگی۔ تم وعدہ کرو کہ اسے قتل نہیں کرو

گے اور نہ کسی اور کو قتل کرنے دو گے اس کے بعد تیرے ہاں لڑکے پیدا ہوں گے۔

راجو خوش ہوگیا اس نے وعدہ کیا کہ وہ ضرور اس نومولود بچی کے گرد اپنی ہرفن کی حصاریں کھڑی کردے گا۔

راجو جب گھر میں آیا تو اپنی بیوی کو غمگین پایا۔

پوچھا کیا بات ہے؟

کہنے لگی وضع حمل کے دن قریب ہیں مگر ڈرتی ہوں کہیں اس بار بھی لڑکی پیدا نہ جائے اور آپ کے خاندان کے بے رحم ہاتھ اس کا گلا دبانے کو آگے بڑھیں اور ل کے ٹکڑے کو میری آنکھوں کے سامنے موت کی آغوش میں سلا دیں۔ اے کاش کہ میں بچی کو جنم دینے سے پہلے ہی مرجاؤں، کوئی میرا پیٹ چاک کر کے دیکھے اگر میرے پیٹ میں بچی ہے، تو میں زہر کھا کے اپنی زندگی کا خاتمہ کرلوں۔

راجو کہنے لگا فکر کرنے کی کوئی بات نہیں ہے اب کے اگر بچی پیدا ہوئی تو میری زندگی اس کی زندگی کو بچانے کے لئے ڈھال بن جائے گی۔

راجو کی بیوی کھڑی ہوگئی ــــــــ

راجو! کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟

وہ بے اختیار رونے لگی اتنی روئی کہ اس کی ہچکی بندھ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد جب راجو نے بیوی کو بتایا کہ وہ آج حضرت شاہ دولا کے ہاں گیا تھا اولاد نرینہ کی دعا کے لئے عرض کیا تو بیوی نے یکدم سر اٹھایا۔

واقعی آپ حضرت شاہ دولا کے ہاں گئے تھے؟ بیوی نے کہا۔ کیا انہوں نے میرے لئے بیٹے کی دعا کی تھی؟ وہ تو بڑے پہنچے ہوئے ولی اللہ ہیں۔ وہ ہاتھ اٹھا دیں تو اللہ تعالیٰ ان کے اٹھے ہوئے ہاتھوں کی لاج رکھ لیتا ہے۔

ہاں! انہوں نے فرمایا کہ راجو! تیرے ہاں اب کے پھر بچی پیدا ہوگی۔

بچی پیدا ہوگی! شاہ دولا پیر نے فرمایا ہے کہ بچی پیدا ہوگی کیا؟ مرنے کے لئے وہ بچی پیدا ہوگی؟ اور ایک اور خون ہمارے ہاتھوں سے ہو جائے گا۔ یہ معصوم خون ہم کب تک کرتے رہیں گے؟ راجو کی بیوی نے سراسیمہ ہو کر کہا اور رونا شروع کر دیا۔

نہیں بھاگوان! حضرت شاہ دولا پیر نے فرمایا ہے کہ اب کے بچی پیدا ہوگی مگر اسے قتل نہیں کرنا۔ اس کی زندگی کو بچاؤ اسکی حفاظت کرو تو پھر تمہارے ہاں بیٹا پیدا ہوگا۔

ٹھیک ہے تو راجو مجھے بتاؤ تمہاری باہوں میں اس قدر طاقت ہے کہ سماج کے ان ظالم ہاتھوں کی ایک ایک انگلی کو توڑ کے رکھ دو جو بچیوں کو قتل کرنے کی ترغیب دیتا ہے؟ اگر بچی کی حفاظت کرکے تمہیں بیٹا ملتا ہے تو پیدا ہونے والی بچی کی حفاظت کرنا زچگی کے وقت میرے گرد اتنی اونچی دیواریں اٹھا دینا کہ نہ میری بچی کی آواز ان ظالموں کے کانوں میں پہنچے اور نہ انکے قدم زچہ خانہ کی جانب بڑھنے پائیں۔

ہاں ہاں! ایسا ہی ہوگا تو کوئی فکر نہ کر۔

ملک راجو کی بیوی اس رات یہ خیال کرتے ہوئے گہری نیند سو گئی کہ اس کی چھاتی کے ساتھ لگنے والی کوئی تو بیٹی زندہ رہے گی اور صبح کو جب وہ اٹھی تو معمول کے خلاف اس کی مصروفیات اور دلچسپیاں تھی۔ آج وہ جو بھی کام کرنے لگتی اس میں پورے انہماک کے ساتھ مگن ہو جاتی۔ اس کی گردن کی اٹھان اور چلنے کی ادا میں ایک خاص قسم کی کشش تھی، اس کا چہرہ ہر گھڑی متبسم رہنے لگا۔

آخر ایک دن وہ لمحہ آیا جب کہ وہ ایک بچی کی ماں بن گئی، بچی کے رونے کی آواز جونہی بلند ہوئی ماں کا کلیجہ اس وقت سہم گیا، ماں نے دایہ سے کہا کہ وہ کسی کو بچی کی پیدائش کی خبر نہ دے۔

مگر زچگی کے ایام گزارنا ہی خبر گھڑنے پر لوگوں کو مجبور کر دیتا ہے لوگ اور خاص کر کے عورتیں ایک دوسری سے پوچھنا شروع کر دیتی ہیں کہ زچہ نے کس کو جنم دیا

ہے، ویسے بھی مٹھائیوں کی تقسیم دروازے پر سرس کے پتوں کا سہرا باندھنا اور شہنائیوں کا بجنا ایک بیٹے کی پیدائش کا پتہ دیتے ہیں اور اگر خاموشی رہے یا گھر کے افراد سہمے سہمے نظر آئیں تو بچی کی پیدائش کا اظہار کرتے ہیں۔

یہاں بھی اگرچہ بچی کی پیدائش کو لاکھ صیغہ راز میں رکھنے کی کوشش کی گئی مگر یہ خبر راز نہ بن سکی۔ نند نے ایک کان میں بات کی پھر بات کو پر لگ گئے اور بات پرائی بن گئی۔ پھر ہر ایک نے منہ جوڑ جوڑ کر باتیں کیں اور بچی ہوئی بچی ہوئی کی رٹ لگ گئی۔

خاندان کے وڈیروں نے بچی کی خبر سنی تو وہ اس وقت چلے آئے۔ ملک راجو سے کہا لاؤ، ابھی اپنی بیٹی اپنے ہاتھوں سے قتل کرو۔

نہیں یہ بچی قتل نہیں ہوگی۔ یہ میری بیٹی ہے میں اسے رکھوں یا ماروں تمہیں اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

نہیں راجو تم غلط سوچ رہے ہو تیری میری بیٹی ہونے کا سوال نہیں ہے سوال خاندان کی عزت کا ہے، پورے خاندان کے لئے، ہاں ہاں یہ بچی پورے خاندان کے لیے کلنک کا ٹیکہ ہے، یہ خاندان کے ہر فرد کے سر کو جھکانے کا باعث ہے۔ جوان ہوگی تو ہمارے سروں کی پگڑی ہمارے داماد کے ہاتھوں میں ہوگی وہ جب چاہے گا اچھال کے رکھ دے گا ہم کسی کو اپنا داماد نہیں بنانا چاہتے۔

یہ کہتے کہتے وہ آگے بڑھے تاکہ بچی کو اٹھا لائیں اور اس کا کام تمام کر دیں ملک راجو کی بیوی کی تو چیخیں نکل گئیں، راجو جلدی سے آگے بڑھا بچی اور خاندان کے وڈیروں کے درمیان حائل ہوگیا۔

رک جاؤ اس بچی کو ہاتھ نہ لگانا ورنہ اس کی ایک ایک رونگٹے کی قیمت تمہیں ادا کرنا پڑے گی، جس طرح بچہ اپنے خاندان کے نام کو زندہ رکھتا ہے اس طرح بچی نسل

انسانی کو زندہ رکھتی ہے۔ آپ لوگ جو زخم اس بچی کو لگانا چاہتے ہیں، وہ حقیقتاً میرے دل پر لگے گا۔

کیا دوسری بچیاں جو قتل ہوتی ہیں ان کے والدین کو کوئی تکلیف نہیں ہوتی؟

وڈیروں نے کہا آپ کی اس بچی کو کیا سرخاب کا پر لگا ہے جو آپ ہمارے ارادوں میں آڑے آرہے ہیں؟

حضرت شاہ دولا پیر نے فرمایا ہے کہ اگر تم اپنی بچی کی جان بچاؤ گے تو تم بیٹے کا منہ دیکھ سکو گے، یہی میری بچی کے لئے سرخاب کا پر ہے اس کی زندگی میں میرے بیٹے کی پیدائش کی خوش خبری ہے، بچی پیدا ہوئی ہے میں اسے حضرت شاہ دولا پیر کی خدمت میں لے جاؤں گا وہ جو فیصلہ کریں گے میں اس کی پابندی کروں گا۔

خاندان کے یہ وڈیرے بڑبڑاتے ہوئے ناکام واپس چلے گئے اور بچی کی زندگی بچ گئی۔ ملک راجو بچی کو اٹھا کر حضرت شاہ دولا پیر کی خدمت میں لے گیا۔ حضرت جی نے بچی کے ہاتھوں کو دیکھا اس کے ماتھے پر نگاہ ڈالی اور فرمایا۔

راجو تو بڑا خوش بخت ہے جا اس بچی کی حفاظت کر اس کی تعلیم و تربیت پر خاص دھیان دینا۔ یہ بڑے مقدروں والی بیٹی ہے یہ جوان ہو کر بس شہزادی کہلائے گی، ہندوستان کے بادشاہ کی بیوی بنے گی، برصغیر کے بادشاہوں کی ماں بننے کا اسے شرف حاصل ہوگا۔ راجو! سن! میں نے اس بچی کا نام بائی رکھا ہے یہ اسی نام سے پکاری جائے گی بائی مطلب مقدراں والی اور عزت دار خاتون ہے۔

ملک راجو نے اس بچی پر پوری پوری توجہ دی تعلیم و تربیت پر خاص دھیان دیا لڑکی سن بلوغت کو پہنچی تو واقعی ایک شہزادی بن گئی، اس کے حسن کا شہرہ دور دور تک ہونے لگا، رنگ، چہرے کے تناسب، نقوش متوازن، ناک اور موٹی آنکھوں میں ایک پری سی لگتی تھی، جو بھی اسے دیکھتا دل تھام کے رہ جاتا، اس کی علم دوستی اور سلیقہ مندی

ہر ایک کی توجہ کا مرکز بن گئی تھی، پھر خاندان کے وہی وڈیرے جو اسے قتل کرنے کو گئے تھے آج اس کا رشتہ مانگنے لگے۔

انہی دنوں بادشاہ شاہجہان کشمیر کی سیر کرنے کے لئے لاہور میں آیا، اس کے ساتھ اس کا بیٹا اورنگ زیب بھی تھا اور برادر نسبتی آصف خان بھی لاہور کے قرب و جوار کے والیان ریاست اور امراء نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق تحائف پیش کئے۔

ملک راجو نے اپنی طرف سے اس بیٹی کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ میرا یہ حقیر تحفہ قبول کریں۔

بادشاہ نے لڑکی کو دیکھا تو اس میں وہ ساری صفات موجود پائیں جو شاہی محلات میں جانے والی عورت میں ہوتی ہیں، وہ بڑا خوش ہوا اور اسے قبول کر لیا، اتفاق سے اورنگ زیب بھی اس وقت قریب ہی تھا وہ تو اسے دیکھتے ہی دیوانہ ہو گیا، جونہی شاہجہان کسی اور طرف متوجہ ہوتا، اورنگ زیب بائی دیکھنے لگتا، بائی اسے ہر لحاظ سے پسند تھی پھر یہ فکر بھی اس کے دامن گیر ہوئی کہ نہ جانے شہنشاہ معظم اس تحفہ کو کسے دینا پسند فرمائیں، بہتر ہوگا کہ بائی کا نکاح مجھ سے کر دیا جائے۔

شاہجہان نے سیر کے لیے آئے ہوئے سارے امراء اور نوجوانوں کو دیکھا بائی سر کو جھکائے بالکل خاموش کھڑی تھی، آج اسے حضرت شاہ دولا پیر کی پیش گوئی پوری ہوتی دکھائی دے رہی تھی اس پیش گوئی کا کچھ حصہ پورا ہوتے وہ دیکھ چکی تھی کیونکہ بائی کی پیدائش کے بعد یکے بعد دیگرے ملک راجو کے ہاں کئی لڑکے پیدا ہو چکے تھے۔ اور اس کا دوسرا حصہ یہ تھا کہ وہ آج جانشین تخت کی توجہ بننے والی تھی۔

شاہجہان اول تو اسے مسلمان کیا پھر اورنگزیب کے ساتھ اس کا نکاح کر دیا، اورنگ زیب بائی کو پا کر بڑا خوش ہوا وہ اسے لے کر ملتان میں چلا گیا۔

اور پھر جب شاہجہان کا آخری وقت آیا وہ بیمار تھا وہ دارا شکوہ کو تخت دہلی پر بٹھانا

چاہتا تھا لہٰذا اسے نامزد کر دیا گیا تو اورنگ زیب کو بڑی فکر دامن گیر ہوئی، کیونکہ دارا شکوہ ہندومت کو فروغ دینے کا خواہش مند تھا۔ اس طرح سرزمین ہندوستان میں اسلام کے روبہ زوال ہونے کا ابھی خطرہ تھا، وہ دن بدن آزردہ ہوتا گیا تو بائی نے فکرمندی کی وجہ دریافت کی، اورنگ زیب نے اپنے تخت نشینی کے مسئلہ کی وضاحت کی۔

بائی نے اس کو تسلی دی اور عرض کیا تم خواہ مخواہ ہلکان ہوتے جاتے ہو میرے متعلق پیش گوئی کی جا چکی ہے کہ میں بادشاہ کی بیوی بنوں گی چونکہ اب میں آپ کی بیوی ہوں اس لئے آپ بادشاہ بنیں گے کیونکہ حضرت شاہ دولا کی بات غلط نہیں ہو سکتی، جائیں آپ بھی گجرات کی ولائت کے شہنشاہ حضرت شاہ دولا کی بارگاہ میں ان سے دعا کرائیں۔

اورنگ زیب بائی کو ساتھ لے کر منزلیں طے کرتا ہوا فوراً گجرات پہنچا اور حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی، اورنگ زیب نے اپنے ساتھ دیگر تحفوں کے علاوہ ایک زرد رنگ کا مرغ، دو ولائتی بلیاں اور ایک چھڑی بھی پیش کی۔

حضرت نے سارے تحفے باری باری فقراء میں تقسیم کر دیئے، مرغ اور بلیوں کو آزاد کرتے ہوئے فرمایا جاؤ تم جہاں رہنا چاہتی ہو رہ سکتی ہو مگر وہ یہ بارگاہ چھوڑ کر کہاں جائیں، لوگوں کے حلقے سے باہر نکل کر بیٹھ گئیں مرغ بالکل بے فکر ہو کر بلیوں کے درمیان بیٹھ گیا اور تیسرا تحفہ چھڑی اورنگ زیب کو واپس کر دی اور فرمایا۔

اورنگ زیب اس چھڑی کو سنبھالنے والے تم ہی ہو، جاؤ اس چھڑی کا حق ادا کرنا یہ چھڑی تمہارا سہارا بنے گی اور رہنما بھی، ظالم کا ہاتھ اس چھڑی سے توڑنا، رعایا کو اس چھڑی سے ہانک کر ترقی کی منزلیں طے کرتے جانا۔

اورنگزیب خوش ہوگیا۔ اس نے تو پہلے ہی سوچ رکھا تھا کہ اگر حضرت نے یہ چھڑی واپس کردی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں بادشاہ بنوں گا کیونکہ چھڑی حکمرانی کی نشانی ہوتی ہے۔

حضرت نے اس کو بادشاہ بننے کی پیشگی خوش خبری اور مبارکباد دی، اورنگزیب چھڑی لے کر اپنی بیوی کے پاس آیا اور کہا کہ میں حضرت شاہ دولا کو اتنا بڑا ولی نہ سمجھتا تھا لیکن آج میں آپ کی کشف و کرامات کا قائل ہوگیا ہوں۔

بائی نے جواب دیا شہزادے! ہمارے خاندان میں بیٹی کو پیدا ہوتے ہی قتل کر دینے کا رواج تھا مگر میرے باپ کو حضرت شاہ دولا نے ایسا کرنے سے باز رکھا اور جب میں پیدا ہوئی تو میرے متعلق یہ خوش خبری دی کہ میں بادشاہ کی بیوی اور بادشاہوں کی ماں بنوں گی چنانچہ ان کی یہ خوش خبری حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

تاریخ اس بات کا بھی انکشاف کرتی ہے کہ مشہور ہندو رائے بلبھ کو حضرت شاہ دولا کے ساتھ نہایت عقیدت تھی، شاہ صاحب نے اسے سدابسنت کا خطاب دے رکھا تھا، چنانچہ داراشکوہ نے شاہجہان کا ولی عہد نامزد ہونے کے باوجود رائے بلبھ کو دعا کے لئے حضرت شاہ دولا کے ہاں بھیجا، حضرت صاحب نے فرمایا تخت نشینی کا فیصلہ تو مدت سے اورنگزیب عالمگیر کے حق میں ہوچکا ہے اب وہی تخت دہلی پر متمکن ہوگا۔

چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ اورنگ زیب بادشاہ بنا اور اس نے ہندوستان پر بڑی شاندار اور مستحکم اسلامی طرز کی حکومت کی اور اس کے بعد اس کا بیٹا بہادر شاہ اول جو اسی بائی کے بطن سے پیدا ہوا، وہ بھی ہندوستان کا حکمران رہا۔

اورنگ زیب جب بادشاہ بن گیا تو اس نے اپنے اتالیق شائستہ خان کو دو ہزار روپیہ اور انواع و اقسام کے پھلوں کے ٹوکرے دے کر آپ کی خدمت میں ارسال کرنے کا پروگرام بنایا، بائی کو علم ہوا تو اس نے بھی شائستہ خان کے ہمراہ حضرت شاہ دولا

کی خدمت اقدس میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی اور اورنگ زیب نے بخوشی بائی کی یہ بات مان لی۔

اس طرح شائستہ خان اور بائی جب حضرت شاہ دولا پیر کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اورنگ زیب کا سلام پیش کیا اور ملکی حالات پر قابو پانے کی دعا کے لئے عرض کیا تو حضرت صاحب نے روپے اور پھل اسی وقت فقراء میں تقسیم فرما دیئے اور بائی کو ایک سرخ رنگ کا دوپٹہ پیش کیا اور فرمایا۔

اورنگزیب سے کہنا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے اللہ خیر کرے گا۔

حوالہ کے لیے

سیارہ ڈائجسٹ اولیاء کرام نمبر
تاریخ پاک و ہند، صاحبزادہ عبدالرسول، اورنگ زیب عالمگیر، مطبوعہ لاہور
تاریخ فرشتہ، از قاسم فرشتہ
عہد مغلیہ، صفدر حیات صفدر

درویش خدامست

★ علوم ظاہری و باطنی سے متصف ولی اللہ کی کتاب زندگی کا ایک ورق

★ ایک ولی کامل کی تحریر کو اورنگ زیب نے حرز جان بنالیا۔

★ حضرت شاہ عبدالرحیم رحمتہ اللہ علیہ کی قناعت اور بے نیازی

★ فتاویٰ عالمگیری کی تالیف و تدوین میں کس قدر احتیاط برتی گئی۔

★ جس شخص کا نام امراء میں لکھا جائے اس کا نام اللہ کے دربار سے کاٹ دیا جاتا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے والد ماجد قدوہ العارفین، زبدہ الواصلین، صاحب کرامات جزیلہ و مقامات جلیلہ حضرت شاہ عبدالرحیم رحمتہ اللہ علیہ علوم ظاہری و باطنی میں اپنی نظیر آپ تھے۔ آپ حضرت عبداللہ خلیفہ ابوالقاسم اکبر آبادی کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے۔ آپ صوفیاؒ کے اشغال میں سے کوئی شغل اختیار کرنے کی فکر میں تھے کہ اچانک بخارا سے ایک بزرگ حضرت خواجہ ہاشم تشریف لائے۔ انہوں نے شغل استکتاب کی تلقین کی یعنی اسم ذات "اللہ" کو ہمیشہ کاغذ یا تختی پر لکھتے رہنا۔ آپ کو اولیاء اللہ سے ملنے کا بڑا شوق تھا آپ اکثر ان کی تلاش میں رہے۔ امراء اور ارباب حکومت کے ہاں جانے سے پرہیز رکھا۔

نوٹ: اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری رحمتہ اللہ علیہ نے بھی شغل استکتاب اپنا رکھا تھا۔ اسم ذات "اللہ" کے قطعات اسی شغل کا نتیجہ ہیں۔

اورنگ زیب عالمگیر پڑھا لکھا بادشاہ تھا۔ صوم و صلوٰۃ کا پابند اور حافظ قرآن تھا۔ دینی کتابوں کا اکثر مطالعہ کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی عملی زندگی میں دینی سلجھاؤ تھا۔ عربی، فارسی، ترکی اور ہندی ادب پر اس کی گہری نگاہ تھی۔ شاعری سے بھی لگاؤ تھا۔ قرآن مجید لکھ کر اور ٹوپیاں سی کر اپنے اخراجات پورے کرتا تھا۔ اسلامی نظام عدل و قضا پر فتاویٰ عالمگیری اسی کے اہتمام سے مدون کی گئی۔ اس کتاب کے مسودات وہ خود دیکھا کرتا تھا۔ جہاں عبارت میں جھول ہوتا یا مسئلہ کی وضاحت قرآن و حدیث کی روشنی میں نہ کی جاتی اورنگ زیب کی گرفت سے بچ نہ سکتی۔ یہ کتاب آٹھ سال میں مرتب کی گئی اور دو لاکھ کی کثیر رقم خرچ کی گئی۔ اورنگ زیب کو اس کی تیاری میں جہاں جہاں سے کسی عالم کا پتہ چلا اسے ہر قیمت پر اس کام میں شامل کرنے کی کوشش کرتا۔

اورنگ زیب عالمگیر اپنے محل میں عالم استغراق میں تھا۔ حکومت اور کاروبار حیات سے بالکل بے نیاز ہو کر مراقبہ میں تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس کی گہری سوچ اور دھیان نہ جانے کن کن امور کا محاسبہ کر رہا تھا۔ اس حالت میں اورنگ زیب کا ایک خادم پنکھا ہلا رہا تھا۔ پنکھے کی ٹھنڈی ہوا ہر لمحے اورنگ زیب کو اونگھ اور نیند کی حدوں کے قریب کر رہی تھی۔ خادم کا یہ روز کا شغل تھا وہ اس کام سے کبھی بھی تھکتا نہیں تھا۔ مگر آج نہ جانے اسے کیا ہوا کہ اچانک بے خودی کی حالت اس پر طاری ہو گئی۔ پنکھا گرا اور ایک ہلکا سا شور پیدا ہوا، جسے بادشاہ کی طبع نازک برداشت نہ کر

سکی۔ اور جلدی سے جھک کر پنکھا اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے پھر سے ہلانے لگا۔

بادشاہ کو خادم کی یہ حرکت پسند نہ آئی ۔ اس نے قدرے غضب ناک ہو کر پوچھا "کیوں کیا بات ہے اونگھنے کیوں لگ گئے۔"

خادم چپ تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ ہی پیلا ہوا جا رہا تھا۔ "بس میں اپنے مرشد کے خیال میں کھو گیا تھا۔ اس اثناء میں مجھ سے یہ غلطی سرزد ہو گئی۔ خدا کا شکر ہے کہ پنکھا گرنے سے آپ کو چوٹ نہیں آئی۔"

"اب کوئی لکڑی میرے سر میں لا مار....... کر لے اپنے دل کا شوق پورا ..... پاگل کہیں کا۔ کہتا ہے مرشد کے خیال میں کھو گیا تھا۔ کون ہے تیرا مرشد؟ کیا نام ہے اس کا؟ ہمیں بھی تو پتہ چلے جو تیرے دل کی دنیا پر اس قدر غالب ہے۔ کہ تیرے فرائض کی ادائیگی میں یوں مخل ہوتا ہے۔"

: "حضور! میری اس سستی کی جو سزا آپ دیں مجھے منظور ہے مگر خدارا میرے مرشد کی شان میں کوئی بھی نازیبا لفظ زبان پر نہ لائیں۔ آج مجھ پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ بڑی پر کیف کیفیت تھی۔ غیبت اور بے خودی کی اس حالت میں میں اپنے بارے میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ میں اپنے ہر عمل سے بیگانہ تھا۔"

خادم یکدم اورنگ زیب کے قدموں میں گر گیا۔ وہ معافی مانگنے لگا۔ " خدارا میرا قصور مجھے معاف فرما دیں۔ میرے مرشد کی ذات کو ہدف تنقید نہ بنائیں۔"

بادشاہ اب احسان کے دائرے میں آ گیا تھا۔ اس کی زبان کی درشتی رخصت ہو چکی تھی، محبت اور رحم کی وادیوں میں وہ چہل قدمی کرنے لگا

تھا۔ اس نے خادم کا سر اٹھایا۔ اسے پیار سے سینے کے ساتھ لگا لیا، ایک باپ کا پیار اسے دیا۔

مگر خادم اسی طرح اپنے جرم کی معافی کا خواستگار تھا ۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں کی بارش برسا رہی تھیں۔ اورنگ زیب نے اپنے دامن سے اس کے رخساروں پر تڑپنے والے آنسوؤں کو پونچھا اور کہنے لگا۔

"جاؤ میں نے تمہارا جرم معاف کیا۔ اب تو خوش ہو جاؤ۔" خادم نے للچائی ہوئی نظروں سے بادشاہ کی جانب دیکھنا شروع کیا کہ کیا واقعی اس کا جرم معاف کر دیا گیا ہے۔

"بادشاہ نے تالیف قلب کے لئے پھر کہا "ہاں ہاں ! میں نے آپ کو دل و جان سے معاف کر دیا ہے۔ اب افسوس کا ہے کا۔"

"یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ اب مجھے بتاؤ تمہارا مرشد کون ہے۔؟ وہ یقیناً" بڑا ولی کامل ہو گا۔ جس کی توجہ آپ کے حالات پر ہر وقت رہتی ہے۔ اگر میں آپ کے مرشد سے ملاقات کرنا چاہوں تو تم میری اس معاملے میں کیا مدد کر سکتے ہو۔؟

خادم سراپا نیاز بن گیا اس نے اپنے ہاتھ باندھ لئے۔ گردن جھکا لی اور عرض کرنے لگا۔

"حضور شہنشاہ معظم میرے مرشد کا نام حضرت سید شاہ عبدالرحیم ہے۔ وہ ایک ولی کامل ہیں۔ وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی صحیح فرمانبرداری کے پرچارک ہیں۔"

"ہاں ہاں!تو سچ کہہ رہا ہے۔ ان کی شہرت میں نے بھی ایسی ہی سنی ہے۔ " اورنگ زیب نے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ ان سے ملاقات کروں۔ ان کو

میرے پاس لے کر آؤ۔"

"حضور! جان کی امان پاؤں تو عرض کروں! خادم کہنے لگا "وہ ایک فقیر ہیں' بے نیازی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ملوک اور اغنیائ کے گھر میں جاناان کے ہاں دستور نہیں ہے۔"

"بڑے تعجب کی بات ہے۔" اورنگ زیب حیران ہو کر کہنے لگا۔ "امراء سلطنت اس قدر ہی بڑے ہوتے ہیں کہ فقراء ان سے راہ و رسم کو برا خیال کرتے ہیں۔ ۔۔۔۔۔۔ خیر کوئی بات نہیں میں کسی اور شخص کو ان کے ہاں بلانے کے لئے بھیج دوں گا۔"

خادم تو پہلے ہی گردن جھکائے کھڑا تھا۔ بادشاہ نے بھی گردن جھکا دی اور سوچنے لگ گیا کہ حضرت شاہ عبدالرحیم کے ہاں کس کو بھیجا جائے۔

فتاوی عالمگیری کی تدوین انہی دنوں ہو رہی تھی۔ بڑے بڑے جید علماء تحقیق و جستجو میں منہمک تھے۔ ان علماء میں وقت کے معروف عالم حضرت شیخ حامد جو مرزا زاہد بیگ کے مدرسے میں حضرت شاہ عبدالرحیم کے ہم سبق رہے تھے بھی شامل تھے، حضرت شاہ عبدالرحیم کے ساتھ ان کے اخلاص میں اب تک کمی نہیں آئی تھی۔ دوستی جوں کی توں قائم تھی۔ بلکہ اب اس دوستی نے عقیدت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔

اورنگ زیب نے انہیں بلایا۔ اولا" ان سے فتاوی کی تدوین کے کام کی رفتار کے بارے میں پوچھا اور فرمایا "شیخ حامد میاں تم شاہ عبدالرحیم کو جانتے ہو؟"

"ہاں! انہیں کون نہیں جانتا۔ وقت کے چوٹی کے عالم ہیں۔ بے نیاز قسم کے فقیر منش ہیں۔ میرے تو ان کے ساتھ ذاتی مراسم ہیں۔ میرے دل

میں ان کا احترام جسقدر ہے شاید ہی کسی اور کے دل میں ہو۔"

"اگر ایسا ہے تو انہیں فتاویٰ کی تدوین کے کام میں کیوں شامل نہیں کیا گیا۔"

"میری ان سے ایک بار گفتگو ہوئی تھی۔ اجرت اور روزینہ کا ذکر بھی کیا تھا مگر ٹال گئے میں نے زیادہ اصرار مناسب نہ سمجھا۔"

انہیں میرے ہاں لے آؤ گے۔ بادشاہ نے کہا۔

"ویسے تو امراء کے ہاں آنا جانا پسند نہیں کرتے۔ بہرحال کوشش کر دیکھتا ہوں۔" شیخ حامد نے عرض کیا۔

بادشاہ نے اپنے شوق اور استدعاء ملاقات کے بارے میں لکھ کر ایک عریضہ شیخ حامد کے ہاتھ میں دے دیا۔

حضرت والا کے ہاں جب اورنگ زیب کا یہ پیغام پہنچا تو قبول نہ کیا۔ شیخ نے بڑی باتیں کیں۔ مبالغہ سے بھی کام لیا۔ مادی مفادات کا لالچ بھی دیا۔ لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر مایوس ہو کر شیخ نے عرض کیا کہ ایک خط لکھ دیجئے تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ میری طرف سے کوئی کوتاہی ہوئی ہے۔

حضرت والا نے فرمایا "آپ کی خوشی کے لئے لکھے دیتا ہوں۔"

خط لکھنے کے لئے کاغذ دیکھنے لگے کہ اچانک ان کی نگاہ اس کاغذ پر پڑی جس میں آپ کے جوتے لپٹے ہوئے تھے۔

شیخ حامد سے فرمانے لگے۔ "وہ جوتوں والا کاغذ تو لے آؤ۔"

یہ کاغذ بالکل ردی قسم کا کاغذ تھا۔ اس قدر شکنیں پڑی تھیں کہ لکھنا مشکل تھا۔ شیخ حامد چاہتے تھے کہ آپ اسکی بجائے کوئی اچھا کاغذ لیں، مگر خاموش رہے کہ شاید آپ خود ہی خیال فرمائیں گے لیکن آپ نے اسی کاغذ

کو تھوڑا سا جھاڑا اور لکھنا شروع کر دیا۔ مجبوراً" شیخ حامد نے عرض کیا۔

"حضور آپ بادشاہ کو خط لکھ رہے ہیں۔ کوئی اچھا سا کاغذ لے لیں تو ٹھیک رہے گا۔ بادشاہوں کے مزاج بڑے نازک ہوتے ہیں۔ کہیں برا نہ مان جائیں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ اس کاغذ کے ذریعے بادشاہ کو ایک غریب آدمی کی زندگی کا احساس ہو۔ کیونکہ اس کاغذ کی شکنوں کی نسبت غریب آدمی کا جسم زیادہ شکن آلود ہوتا ہے۔ زیادہ زخم خوردہ ہوتا ہے اور زیادہ قابل نفرت ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ بادشاہ پر واضح ہو جائے کہ جس طرح یہ قابل نفرت کاغذ بادشاہ تک ایک پیغام کا ذریعہ بن گیا ہے ایسے ہی وہ غریب لوگ خدا کے ہاں ایک شکایت کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔"

بہر حال حضرت شاہ صاحب نے وہی کاغذ استعمال کیا اور لکھا۔

بِئْسَ الْفَقِیْرُ عَلٰی بَابِ الْاَمِیْرِ

یعنی بدترین فقیر وہ ہے جو امیر کے دروازے پر ہو۔

بس اس قدر لکھا اور خط اورنگ زیب کی طرف بھیج دیا۔

بادشاہ نے خط کو دیکھا تو رونے لگا۔ اسے اپنی جیب میں محفوظ کر لیا۔ جب بھی لباس تبدیل کرتا اس کو اپنی جیب میں محفوظ رکھتا۔ یہاں تک کہ مرنے تک یہ خط بادشاہ کے پاس محفوظ رہا۔ فرصت کے وقت بادشاہ خط کا مطالعہ کرتا اور زارو قطار روتا تھا۔

بادشاہ نے بارہا حضرت والا سے ملاقات کی خواہش کی مگر آپ نے کبھی بھی اس خواہش کا احترام نہیں کیا۔ آخر کار جب فتاویٰ عالمگیری کی تدوین مکمل ہو گئی اور نظرثانی کا کام شروع ہوا تو آپ کو پھر اسی نظرثانی کے کام

میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔ آپ نے پھر انکار کر دیا۔ روزینہ اور وظیفہ کا لالچ آپ نے ٹھوکر مار کر پرے کر دیا۔

آپ کی والدہ ماجدہ کو اس کا علم ہوا تو بیٹے سے فرمایا۔

"بیٹا! کیا حرج ہے دین کے کام میں شامل ہونے سے۔ اگر تیری ضد سے فتاویٰ میں کوئی کمی رہ گئی اور اس کے باعث دین میں کوئی رخنہ رہ گیا اور پھر اس کے بگاڑ کے نتیجہ میں ایک ذمہ داری تم پر بھی عائد ہو گی۔ اس کے ساتھ ساتھ جو آپ اس کام میں وقت صرف کریں گے اس کا معاوضہ بھی بادشاہ دے رہا ہے۔"

والدہ کا احترام اور اصرار غالب آیا۔ اس طرح حضرت والا نے اس کام کو کرنے کی ذمہ داری قبول فرمالی۔ جونہی آپ اس کام میں مصروف ہوئے تو حضرت خلیفہ ابوالقاسم اکبر آبادی رحمتہ اللہ علیہ کو معلوم ہوا کہ آپ نے معاوضہ کے عوض فتاویٰ عالمگیری کی نظرثانی کا کام کرنا قبول فرمایا ہے۔ آپ نے فرمایا۔

"دین کے کام میں معاونت کار ثواب ہے مگر اس کامعاوضہ درست نہیں ہے۔ کام کرو مگر وظیفہ کو ترک کر دو۔"

شاہ صاحب نے جواباً عرض کیا "میں نے اس کام کو کرنے اور وظیفہ کو قبول کرنے کی حامی محض والدہ ماجدہ کے اصرار پر بھری ہے۔ میرا انکار والدہ کی ناراضگی پر محمول ہو گا۔ کیونکہ **اِذَا جَاءَ حَقُّ اللّٰہِ ذَھَبَ حَقُّ الْعِبَادِ** دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ میری کوشش کے باوجود اس وظیفہ کو دور کر دے اور والدہ کی ناراضگی بھی نہ ہو اور آپ کی ہدایت پر بھی عمل ہو سکے۔"

چند دنوں کے بعد بادشاہ نے فتاویٰ کی نظرثانی کے لئے کام کرنے والے

علماء کے نام طلب کئے حضرت والا کا نام بھی اس فہرست میں تھا۔ بادشاہ نے اس نام کے آگے لکھا ہوا وظیفہ کاٹ دیا اور بہت سی زمین ان کے نام لکھ دی۔ حضرت والا سے عرض کیا گیا تو وظیفہ کی کٹوتی پرخوش ہوئے۔ خدا کا شکر ادا کیا اور پھر زمین بھی لینے سے انکار کر دیا۔

کام کا معاوضہ لینے سے انکار کے باوجود ذرا کام میں آپ کا انہماک دیکھیں۔ ایک دن نظرثانی کا کام کرتے ہوئے ایک ایسی عبارت پر آپ کی نظر پڑی جو بڑی گنجلک تھی اور مسئلہ مکمل طور پر کچھ کا کچھ ہو گیا تھا۔ آپ نے ان تمام کتابوں کی ورق گردانی فرمائی جو اس مسئلہ کا ماخذ تھیں۔ تو معلوم ہوا کہ یہ مسئلہ دو کتابوں میں بیان ہوا ہے۔ اور ہر ایک نے الگ الگ عبارت میں بیان کیا ہے۔ مگر فتاویٰ کے مؤلف نے دونوں عبارتوں کو جمع کر دیا۔ اس وجہ سے مسئلہ کے بیان میں خرابی ہو گئی۔

وَ مَنْ لَّمْ یَفْقَہْ فِی الدِّیْنِ قَدْ خَلَطَ فِیْہِ هٰذَا غَلَطٌ وَ صَوَابُہٗ کَذَا

یعنی جو دین کی سمجھ نہیں رکھتا اس نے گڑبڑ کر دی ہے اور صحیح یوں ہے۔

ان دنوں اورنگ زیب عالمگیر کو اس کی ترتیب و تدوین کا بہت زیادہ اہتمام تھا اور ملا نظام الدین ایک دو صفحات بادشاہ کے سامنے پڑھتا تھا۔ جب وہ اس مقام پر پہنچا تو اتفاقاً" اس نے اس حاشیہ کی عبارت کو بھی متن کے ساتھ ملا کر پڑھ دیا۔ بادشاہ چونکا اور کہا "یہ عبارت کیسی ہے؟" ملانظام الدین نے اس وقت تو دفع الوقتی کرتے ہوئے کہا "اس جگہ میں نے مطالعہ نہیں کیا تھا کل تفصیل سے عرض کروں گا۔"

ملا نظام الدین شام کو جب گھر واپس آئے تو ملا حامد کو بلا کر خفا ہوئے کہ

یہ حصہ میں نے تمہارے اعتماد پر چھوڑ دیا تھا۔ تم نے مجھے بادشاہ کے سامنے شرمندہ کر دیا۔ یہ تو بتائیے یہ لفظ کیا ہے؟ ملا حامد نے اس وقت کچھ نہ کہا۔ پھر اس نے حضرت والا شاہ عبدالرحیم سے اظہار خیال کیا۔ آپ نے وہ کتابیں پیش کر دیں جو اس مسئلہ کی ماخذ تھیں اور عبارت کی خرابی کو اس طرح سے واضح کیا کہ سب نے تسلیم کر لیا۔

حوالہ کے لئے

۱۔ انفاس العارفین از حضرت شاہ ولی اللہ رحمتہ اللہ علیہ
۲۔ اورنگ زیب عالمگیر، مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز

دیگر امدادی کتب:

اردو انسائیکلوپیڈیا، فیروز سنز
تاریخ فرشتہ، از محمد قاسم فرشتہ

ماہ نامہ نور اسلام شرقپور شریف
جولائی ۱۹۹۱ء

مسجد کا سنگ بنیاد

★ مرشد کامل سے عقیدت مرید پر فیوض کی بارش کا باعث بنتی ہے۔

★ جذبہ صادق سے کئے ہوئے کام کی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے۔

★ مرشد کامل نے بہت دور سے اپنے مرید کی مشکلات کو سمجھ لیا۔

★ شاہجہان اللہ والوں سے محض عقیدت کی بنأ پر ایک دین پرور بادشاہ بن گیا۔

شاہجہان جہانگیر کا تیسرا بیٹا تھا وہ جہانگیر کی راجپوت رانی جگت گوسین کے بطن سے لاہور میں پیدا ہوا۔ اکبر کو اپنا یہ پوتا بڑا پسند تھا۔ اس کا نام خرم تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت کا بڑا اچھا انتظام کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں اپنی خدا داد صلاحیتوں کے باعث جلد ہی علم و ادب میں طاق ہو گیا وہ شراب و کباب کے نزدیک تک نہ جاتا تھا۔ شکل و شباہت اور آداب و اطوار سے شائستہ اور مہذب تھا۔ اس باعث جہانگیر بھی اس سے بڑا خوش تھا۔ بزرگان دین کا معتقد تھا تاریخ اسے دین پرور بادشاہ مانتی ہے۔

حضرت خواجہ معصوم رحمتہ اللہ علیہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فاروقی رحمتہ اللہ علیہٗ کے صاحبزادے ہیں۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۱ شوال ۱۰۰۷ھ میں ہوئی۔ آپ پیدائشی ولی ہیں۔ رمضان المبارک کے مہینے

میں آپ دن کے وقت دودھ نہیں پیتے تھے۔ صورت اور سیرت کے اعتبار سے اپنے والد محترم سے مشابہت رکھتے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں علوم کی تحصیل سے فارغ ہوئے اور تین ماہ میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ آپ کے سات ہزار خلفاء اور نو لاکھ مرید تھے۔

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فاروقی رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی زندگی میں ہی اپنے صاجزادوں حضرت خواجہ معصوم اور حضرت خواجہ محمد سعید رحمتہ اللہ علیہ کو خرقہ خلافت سے سرفراز فرما دیا۔ اور ۱۰۳۱ھ کے بعد آپ کے ہاں جو بھی مرید ہونے کے لئے آیا آپ نے اسے حضرت خواجہ محمد معصوم رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں بھیج دیا۔ انہیں بیعت ہونے والوں میں ایک دن وہ مغل شہزادہ آیا جسے بعد میں شہنشاہ ہند بننا تھا۔ یہ شہزادہ خرم تھا جو شاہجہان کے لقب سے جہانگیر کی وفات کے بعد تخت دہلی پر متمکن ہوا۔

شہزادہ خرم شہزادگی کے دنوں میں بھی حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ کے ارادت مندوں کے حلقے میں آ کر بیٹھا کرتا تھا۔ اسے حضرت مجدد پاک سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی محبت کا نتیجہ تھا کہ وہ جب سے بالغ ہوا شعائرِ اسلامی کو اس نے اپنانا شروع کر دیا سبزہ خط کو اس نے چہرے کی رونق اور بہار سمجھا۔

حضرت خواجہ محمد معصوم رحمتہ اللہ علیہ سے بیعت ہونے کے بعد اس کی زندگی میں مزید دینداری آنے لگی۔ وہ بزرگان دین کے مراتب و مناقب کا دل و جان سے قائل تھا۔

چنانچہ جب حضرت مجدد پاکؒ کا وصال ۱۶۲۴ء بمطابق ۱۰۳۴ھ میں ہوا تو شہزادہ خرم حضرت خواجہ محمد معصوم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ شریک غم تو

تھا ہی شریک حال بھی ہونا چاہتا تھا۔ حضرت صاحب چونکہ مجدد پاک کی آخری رسومات میں بے حد مصروف تھے، وہ شہزادہ خرم پر کوئی خصوصی توجہ نہ دے سکتے تھے۔ شہزادہ خرم کوئی دل کی بات ان مصروفیات کے باوجود جلدی سے کہنا چاہتا تھا مگر سوء ادب کا خیال اس کی زبان کو روکے ہوئے تھا۔ حضرت صاحب جب بھی حاضرین میں تشریف لاتے شہزادہ خرم جلدی سے ان کے کان میں کوئی بات کہنے کے لئے جستجو کرتا، مگر کوشش کے باوجود اسے یہ بات کہنے کا موقعہ ہاتھ نہ آیا۔ آخر جب وہ دروازے کے پاس ایک سوگوار کی حیثیت سے کھڑا تھا اور حضرت صاحب کا ادھر سے گذر ہوا آپ نے شہزادہ خرم کو دیکھا۔

حضور نے فرمایا خرم! اللہ کو جو منظور تھا وہ ہو گیا۔ ہم تو اللہ کے ہر فیصلہ پر لبیک کہنے والے ہیں۔

مگر حضور! میں ایک عرض کرنا چاہتا ہوں۔ قبول ہو جائے تو زہے نصیب۔

ہاں کہو خرم! کیا کہنا چاہتے ہو۔

حضور مجھے ایک غلام سمجھا جائے اور غلاموں کی طرح مجھے ان لوگوں کی خدمت کرنے کی اجازت فرما دیں، جو حضور حضرت مجدد پاک کی تعزیت کے لئے تشریف لا رہے ہیں اور لاتے رہیں گے۔

نہیں خرم! حضرت صاحب کے مخلصین ہمارے مہمان ہیں ان کی خدمت کرنا ہمارا حق بنتا ہے خرم پاؤں پر گر گیا حضور میں آپ کا غلام ہوں میں ہاتھ باندھ کر عرض کرتا ہوں کہ یہ خدمت کرنے کا موقعہ آپ میرے سپرد فرما دیں۔

حضرت صاحب نے اجازت دے دی چنانچہ ایک ماہ تک جتنے بھی مخلصین حضور کی تعزیت کے لئے آئے ان کی خدمت پر جس قدر اخراجات ہوئے وہ شہزادہ خرم نے برداشت کئے۔

پھر تو اس مرید پر قطب الارشاد، غوث زمانہ، قیوم ثانی، عروۃ الوثقیٰ حضرت خواجہ محمد معصوم کا خاص کرم ہو گیا فیوض کی اس پر بارش ہونے لگی۔

بادشاہ بن کر بھی اس کی حاضری حضرت خواجہ محمد معصوم رحمتہ اللہ علیہ کی بارگاہ میں رہتی تھی۔ آپ اس پر توجہ فرماتے تھے عبادات کی پابندی کا درس دیتے تھے۔

شاہ جہان ایک دین پرور بادشاہ ہوا ہے جب وہ بادشاہ بنا تو راسخ العقیدہ مسلمانوں نے بڑی خوشی اور مسرت کا اظہار کیا چنانچہ اس کی تخت نشینی پر شاہجہان کے ایک درباری مورخ عبدالحمید لاہوری نے لکھا کہ۔

"اسلام کی عبادت گاہیں گرتی جا رہی تھیں اور شریعت کی بنیادیں متزلزل ہو رہی تھیں، کہ خدا تعالیٰ نے اس بادشاہ اسلام نواز اور کفر گداز کو تخت کی زینت فرمایا۔"

عبدالحمید لاہوری کی اس عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ شاہ جہان کو اللہ تعالیٰ نے تخت محض اس لئے دیا تھا کہ اس سے اسلام کی خدمت ہو سکے اور کفر کی مذمت۔

بادشاہ میں ان صفات کے پیدا ہونے کا باعث صرف یہی ہے کہ شہزادہ خرم فقراء کی چوکھٹ کا غلام بنا رہا۔ اور پھر جب وہ بادشاہ بن گیا تو ایک دن حضرت خواجہ محمد معصوم رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا بارگاہ معصومیہ میں ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ حضور نے دیکھا فرمایا خرم بھائی آج

خیریت ہے۔

حضور والا! بندہ پروری فرما کر اپنے فرزندان گرامی سے جو ہر ایک اپنے اپنے مقام پر قطب وقت ہیں، کسی ایک کو شاہی دربار میں رہنے کے لئے ارشاد فرمادیں تاکہ ان کے نفس قدسیہ کی برکت سے تمام اہل دربار اور شاہزادگان اور امراء و اراکین سلطنت فیض یاب ہوں۔

آپ نے فرمایا خرم بھائی! فقیری اور بادشاہی الگ الگ راہیں ہیں ہم فقیر لوگ ہیں شاہی دربار کی کدورت روحانیت کو مکدر بنا دیتی ہے۔

حضور آپ نے درست فرمایا ہے مگر میں تو اپنے دربار کی اسی کدورت کو روحانیت میں بدل دینا چاہتا ہوں۔ میرے دربار کے اندھیروں میں اگر اللہ والوں کے وجود مسعود کی شمع روشن نہیں ہو گی تو نور و ایمان کے اجالے کیسے ہوں گے؟

حضور نے شاہ جہان کی بات کو درست مانتے ہوئے اپنے صاحبزادے شیخ الشیوخ مسند الاصفیاء امام الاولیاء حضرت خواجہ سیف الدین رحمتہ اللہ علیہ کو دہلی میں بھیج دیا اس طرح ان کے فیض سے تمام اراکین امراء و شاہزادگان فیض حاصل کرتے رہے اور یہ اسی دینی فضا اور دینی ماحول کی وجہ ہے کہ شاہ جہان نے جو عمارتیں بنوائیں ان میں دینی اور اسلامی تعمیر کی جھلک کو واضح کر کے پیش کیا۔ محرابیں، ستون، دالان اور مینار اسلامی رنگ و عظمت کے نشان ہیں۔ اور دہلی کی جامع مسجد کی جب بنیاد رکھی گئی تو شاہ جہان نے سنگ بنیاد رکھنے کی جو شرط رکھی وہ اسلامی اقدار کا احیاء اور عبادات کی پابندی کی مظہر ہے، آیئے آج اسی مسجد کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کریں۔

یہ بات ۱۰۶۰ھ کے شوال کی ۱۰ تاریخ کی ہے کہ شاہجہان آباد کے مغرب

کی جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر لوگ جمع ہونے لگے۔ ان میں سے کوئی بھی دوسرے شخص سے یہ نہیں پوچھتا تھا کہ آج پہاڑی پر کیا ہے کیا کوئی عجوبہ ملا ہے۔ یا کوئی جلسہ ہو رہا ہے۔ یا بادشاہ معظم کے کسی جلوس کا اجتماع ہے ان میں سے کوئی بات بھی درست نہیں لگ رہی تھی۔ کیونکہ جانے والے لوگوں میں امراء کے ساتھ ساتھ غرباٗ بھی اسی تیزی سے جا رہے تھے جس تیزی سے امراء چل رہے تھے غرباٗ کے ہاتھوں میں گیتیاں، پھاوڑے اور کسیاں تھیں جو ذہن کو اس طرف لے جانے میں مدد کرتی تھیں کہ پہاڑی پر ضرور کوئی عجیب چیز ملی ہے جس کی کھدائی کے لئے یہ لوگ کسیاں اور پھاوڑے اٹھائے چلے جا رہے ہیں اور امراء کا پہاڑی پر جانا کسی جلسے یا جلوس کی غمازی کرتا تھا اور اگر جلسے جلوس کو گمان میں لایا جائے تو خیال آتا تھا کہ غرباٗ کا جلسے میں شامل کرنے کا کیا تک ہے۔ غرباٗ تو بس امراء کی راہوں کو ہموار، صاف اور ٹھنڈا کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔

بہرحال لوگوں کے اس بہتے ہوئے سیلاب میں غرباٗ اور مزدور طبقہ امراء سے زیادہ تھا یہ لوگ صرف آج تک کے لئے ہی پہاڑی کی طرف گامزن نہ تھے بلکہ ہر صبح اور شام کو ان لوگوں کی آمدورفت جاری رہی یہ پانچ ہزار افراد کا قافلہ ہر صبح پہاڑی کی طرف جاتا اور ہر شام کو واپس آتا دکھائی دیتا۔ اس طرح یہ لوگ مسلسل ۶ سال تک جاتے رہے کام کرتے رہے اور شام کو واپس آتے رہے۔

پہاڑی پر ۲۷۰ فٹ لمبی اور ۹۰ فٹ چوڑی ایک مسجد کی بنیادیں کھودی گئیں اور پھر ان میں پتھروں کی سلیں دفن ہونے لگیں۔ اس طرح ۶ سال کے عرصہ کے بعد ان پانچ ہزار راجوں مستریوں مزدوروں بیلداروں اور

سنگتراشوں نے ایک شاندار اور خوبصورت مسجد کی تعمیر مکمل کر لی۔ جس پر اس وقت کے مطابق ۱۰ لاکھ روپیہ خرچ آیا۔

باوجود اس کے کہ آج اس مسجد کو بنے ہوئے ساڑھے تین سو سال کا عرصہ بیت رہا ہے، مگر اس کی خوبی لطافت اور خوشنمائی میں فرق نہیں آیا۔ مغلیہ دور کی اور عمارات بھی ہیں جن کو انہیں راجوں اور کاری گروں نے بنایا جنہوں نے اس مسجد کو بنایا وہی میٹریل استعمال کیا گیا جو اس مسجد میں گیا اس طرح کے انجینئروں نے ان عمارات کے نقشے تیار کئے جن انجینئروں نے اس مسجد کا نقشہ بنایا۔ مگر ان عمارات کی ہیئت میں خوبصورتی' خوشنمائی اور لطافت میں فرق آگیا اور یہ مسجد اپنے دامن میں وہی لطافتیں اور نزاکتیں لئے ہوئے ہے۔

ہم نے آج تک اس پہلو پر نگاہ نہیں ڈالی ہو گی۔ اس پہلو کو تلاش کرنے کے لئے اگر ہم بادشاہ (شاہجہان) کے اس عزم و ارادہ اور تمنا کے الفاظ ذہن میں لائیں جو اس نے اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھتے وقت کہے تھے۔ کہ

"آج ہم جس مسجد کا سنگ بنیاد رکھ رہے ہیں وہ یقیناً" ایک طویل عرصے تک اہل دنیا کی کشش کا باعث بنی رہے گی۔ شاید دنیا کے عجائبات میں اس کا شمار ہونے لگے۔ یہ مسجد مغلیہ فن تعمیر کا ایک نادر نمونہ ہو گی۔ اس مسجد کے لئے سنگ سرخ سنگ مرمر اور سنگ موسی اعلی قسم کا لایا گیا ہے اس مسجد میں کام کرنے والے کاریگر اپنے فن میں یکتائے روزگار ہیں۔ علاوہ ازیں میں چاہتا ہوں کہ اس مسجد کا سنگ بنیاد وہی شخص رکھے۔

جس نے بالغ ہونے کے بعد سے اب تک کوئی غیر شرعی کام نہ کیا ہو۔

جس نے کبھی نماز' روزہ اور تہجد قضا نہ کی ہو۔

جس نے کبھی جماعت کی تکبیر اولی فوت نہ کی ہو یعنی بعد بالغ ہونے کے آج تک نماز باجماعت پڑھی ہو اور تکبیر اُولیٰ میں شامل ہوتا رہا ہو۔

نہ عمداً" کذب بیانی کی ہو' نہ کسی کی چوری کی ہو اور نہ کبھی زنا کا مرتکب ہوا ہو۔ اس وقت کے مجمع میں کتنے ہی لوگ بیٹھے تھے۔ علماء اور صلحاً جمع تھے۔ جن میں حضرت شیخ حبیب' حضرت کبیر عارف' حضرت میر فخرالدینؒ حضرت سید محمد قنوجیؒ حضرت شیخ ناظر اور حضرت سید جلال سرفہرست تھے۔ اس مجمع میں زاہد بھی اور پارسا بھی آئے ہوئے تھے۔ ظاہر اور باطن کی دنیا میں شہنشاہ بھی اس اعلان کو سن رہے تھے مگر کوئی شخص آگے بڑھ کر سنگ بنیاد رکھنے کو تیار نہ ہوا۔

ہم یہ تو نہیں کہتے کہ اس وقت کوئی بھی اس معیار پر اترنے والا نہ تھا اور نہ ہی ایسا ہمارا گمان ہے۔ یقیناً کئی ہوں گے، جن کے حالات سے بادشاہ واقف تھا۔ اس لئے وہ انہیں کے ہاتھ سے مسجد کا سنگ بنیاد رکھوانے کا آرزو مند تھا۔ مگر ایسے لوگوں کا آگے نہ بڑھنا اور نہ اٹھنا یقیناً" اس لئے ہو گا کہ وہ اس شہرت اور دکھاوے کو پسند نہ کرتے تھے۔ یہ تو ایک راز تھا جو ان کے اور ان کے رب کے درمیان تھا۔ وہ دنیوی شہرت کے قائل نہ تھے۔

مگر یہ شرط اپنی جگہ پر بڑی سخت تھی اس میدان میں اترنے کے لئے حاضرین میں سے ہر ایک شخص نے اپنے ماضی کے جھروکوں میں سے جھانکنا شروع کر دیا۔ ایک ایک کذب بیانی نے سر اٹھا اٹھا کر اپنے آپ کو دکھایا کہ احتیاط سے قدم اٹھانا نمازوں کی تکبیر اولیٰ کا فوت ہونا تو کجا کئی فوت شدہ

نمازیں انہیں یاد آنے لگیں۔ چھوڑے ہوئے روزے یاد آ گئے۔ زنا پر آمادہ کرنے کے لئے اپنی محبوبہ سے پیار بھری اور میٹھی میٹھی باتیں سنائی دینے لگیں۔

سارے مجمع میں ایک سکوت تھا۔ کسی شخص کی آنکھ کی پتلی حرکت نہیں کرتی تھی۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ اپنے اپنے ماضی کی کارگزاریوں پر بنی ہوئی فلم خود اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں۔

مسجد کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے کوئی بھی آگے نہ بڑھا دن پر دن گذرتے گئے پھر اچانک ایک دن ایک ایلچی حضور خواجہ محمد معصوم رحمتہ اللہ علیہ کی جانب سے بادشاہ کی خدمت میں آیا اور پیغام دیا کہ حضور بادشاہ کو بلاتے ہیں۔

بادشاہ فورا" منزلیں طے کرتا ہوا سرہند شریف میں پہنچا خدم و حشم کو شہر سے باہر کھڑا کیا اور پیغام بھیجا کہ حضور کا غلام بارگاہ میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔

بادشاہ کو اجازت مل گئی۔

آپ نے سارے ارادت مندوں کو باہر بھیج دیا اوربادشاہ کو خلوت میں بٹھایا اور فرمایا خرم بھائی! آپ نے ولی کی جامع مسجد کے سنگ بنیاد کے لئے جو شرط لگائی ہے، وہ ٹھیک نہیں ہے ---- اگر کوئی شخص بھی آپ کی شرط کے مطابق آگے نہ بڑھا تو لوگوں کے بھرم ٹوٹ جائیں گے۔ دنیا والے کسی کی عزت بھی نہیں کریں گے۔ کسی کو کوئی اہمیت نہ دیں گے ----- اس صورت میں بُرے اچھوں کے پاس نہیں آئیں گے۔ ان کی اصلاح نہیں ہو سکے گی۔ اور پھر تمہیں کیا خبر کہ کسی کا ایک سجدہ دوسرے کی عمر بھر کی نمازوں

پر بھاری ہو جائے۔ اس بات کو پردے میں رہنے دیں کسی کا پیٹ ننگا نہ کریں۔

جاؤ تم خود اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھو۔ جو تم نے شرط لگائی ہے اس کو پورا کرنے کی صلاحیت تم میں موجود ہے۔

چنانچہ بادشاہ نے خود دہلی میں جاکر اس مسجد کا سنگ بنیاد رکھا اور پھر لوگوں کا گمان اس طرف منعطف ہونے لگا کہ بادشاہ میں یقیناً" وہ ساری خوبیاں موجود ہوں گی جن کی شرط اس نے لگائی تھی چونکہ اس پر بزرگوں کی نگاہ تھی اور یہ خوبیاں اس میں واقعتاً" موجود تھیں۔

پانچ ہزار لوگوں کا روزگار پورے چھ سال تک اس مسجد کی تعمیر کے بہانے سے چلتا رہا۔ مسجد کی تعمیر مکمل ہوئی تو مغلیہ فن تعمیر کا ایک شاہکار بن گئی۔ جس کے مرمریں صحن میں آج سورج اور چاند کی کرنیں رقص کر رہی ہیں اس کے صحن کی خاک لاکھوں کروڑوں بندگان خدا کے قدموں کو بھی اور پیشانی کو بھی چوم چکی ہے اور چومتی رہے گی۔

مسجد میں داخل ہوں تو آسودگی اور روحانی طمانیت کا احساس پیدا ہوتا ہے ---- اس وقت کے لوگ بھی اور آج کے لوگ بھی اس مسجد کے بارے میں یہی رائے رکھتے ہیں کہ اس کا سنگ بنیاد ایک ولی کامل کے ارشاد سے اس بادشاہ کے ہاتھوں سے رکھا گیا جو ولی تو نہیں مگر ولیوں کی چوکھٹ کا غلام بنا رہا۔

مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی۔

۱۔ اردو انسائیکلوپیڈیا مطبوعہ فیروز سنز

۲۔ تاریخ ہند از مولوی ذکاء اللہ

۳۔ آثار الصنادید از سرسید احمد خاں

حسن مجبور ہوا اس کو منانے کے لئے

☆ پاکیزگی' پاکیزگی کو ہی چاہتی ہے۔

☆ ولی کامل کے باحیاء بیٹے نے حسن کی رنگینی اور شوق کو پس پشت رکھا۔

☆ فقراء کے ہاں دولت کے خزانے امراء کے تکبر کو توڑنے کے لئے ہوتے ہیں۔

فرغانہ کے شہنشاہ جمال الدین کی خوبرو اور نیک و پارسا و متقی بیٹی راستی خانہ کعبہ کا طواف کر رہی تھی' کہ اس کے آگے آگے ایک نوجوان بھی طواف کرنے میں مشغول تھا۔ اس مشاعحہ سیرت لڑکی کی اچانک نگاہ جو اس نوجوان کی پشت پر پڑی تو وہ حیران رہ گئی۔ کیونکہ اس نوجوان کی پشت سے بار بار نور کی شعائیں منعکس ہو رہی تھیں۔ نور کا ایک ہالہ اس کے گرد قائم ہے اور وہ نوجوان اس قدر انہماک کے ساتھ محو طواف ہے کہ گویا اسے دنیا و مافیہا کی کچھ خبر نہیں۔

اس نوجوان دوشیزہ نے طواف تو مکمل کر لیا مگر اس کے بعد ایک گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ ایسے لگتا ہے یہ نوجوان کوئی صاحب بصیرت ہے' سلوک کی منزلوں کا راہی ہے' معرفت شناس بھی ہے اور حقیقت آشنا بھی اور پھر اس کی پشت سے نور کی شعاعوں کا منعکس ہو کر نکلنا اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ اس کی اولاد کمال کے درجے طے کرنے والی ہے۔

شہزادی ایک طرف ہو کے کھڑی ہو گئی اور اس نوجوان کا انتظار کرنے لگی۔

نوجوان طواف سے فارغ ہو کر جب جانے لگا تو شہزادی نے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا اور گویا ہوئی "اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا میں آپ سے پوچھ سکتی ہوں

کہ آپ کون ہیں اور آپ کا وطن شریف کہاں ہے ؟"

نوجوان ایک طرف سے ہو کر آگے بڑھا اور اس دوشیزہ کو اپنے پیچھے کر لیا اور فرمانے لگا۔ "میں آپ کی سب باتوں کا جواب دینے کو تیار ہوں مگر آپ میرے سامنے نہ آئیں۔ بس میری پشت کی جانب سے سوال کرتی رہیں میں آپ کے سوالوں کا جواب دیتا رہوں گا"۔

یہ دوشیزہ نوجوان کے اس طرز عمل سے اور زیادہ متاثر ہوئی۔ اس نے اپنے سوال کو مکرر عرض کیا کہ آپ کون ہیں؟ اور آپ کا وطن شریف کہاں ہے؟

نوجوان نے جواب دیا۔ "مجھے صدرالدین کہتے ہیں اور وطن میرا ملتان ہے"۔

"ملتان!" شہزادی نے متعجبانہ لہجے میں کہا۔ "کیا وہی ملتان جہاں حضرت بہاؤ الدین زکریا رہتے ہیں؟"

"جی ہاں! وہی ملتان جہاں کی تعلیت کے فرائض حضرت خواجہ بہاؤ الدین رحمتہ اللہ علیہ کے سپرد ہیں"۔

"آپ کا ان کے ساتھ کیا تعلق ہے؟ محض شہری ہونے کے ناطے سے یا برادری کے اعتبار سے ـــــ یا آپ ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہیں؟"

نوجوان نے کہا "ان سارے تعلقات خاص کے علاوہ مجھے ان کی فرزندی کا شرف بھی حاصل ہے"۔

شہزادی کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گویا ہوئی۔ "کیا آپ کی شادی ہو چکی ہے ؟"

نوجوان نے فرمایا "نہیں!"

شہزادی نے عرض کیا۔ "اگر آپ شادی کرنا چاہیں تو ایک موزون رشتہ آپ کو مل سکتا ہے"۔

نوجوان نے مسکراتے ہوئے فرمایا "یہ معاملہ میرے والدین سے متعلق ہے۔ وہ جب اور جس کے لئے فرمائیں گے، میں بے حیل و حجت قبول کرلوں گا۔"

اس گفتگو کے بعد شہزادی اور نوجوان مناسک و زیارات کی غرض سے جدا ہو کر چلے گئے۔ مگر شہزادی جب اپنے ملک میں گئی تو اس نے یہ تمام کیفیت اپنے والد شہنشاہ فرغانہ جمال الدین سے بیان کی۔ شہنشاہ اس خبر سے بہت خوش ہوا۔ اس نے فوراً ملک کا انتظام وزیروں امیروں کے سپرد کیا اور خود ملتان کے سفر کے لئے روانہ ہوا۔

ایک شاہی قافلہ بڑی شان و عظمت کے ساتھ رواں دواں تھا' وہ شہزادی بادشاہ کے ہمراہ تھی۔ یہ قافلہ جہاں بھی قیام کرتا بادشاہ کے حکم سے وہیں رفاہ عامہ کی غرض سے ایک کنواں تعمیر کروایا جاتا۔ اس طرح فرغانہ سے ملتان تک کئی کنوئیں عام لوگوں کی سفری سہولت کی غرض سے بن گئے۔ چنانچہ منزل بہ منزل یہ شاہی قافلہ ملتان کے قریب پہنچا تو حضرت خواجہ بہاؤ الدین کے خلفاء نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔

جس جگہ شاہی قافلہ کا استقبال کیا گیا' وہاں شہنشاہ نے جگہ خرید کر مکانات تعمیر کروائے۔ ایک کنواں کھدوایا اور پھر بادشاہ نے حضرت خواجہ بہاؤ الدین کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت مانگی۔ اجازت مل گئی۔ تو اس نے زرو جواہر سے بھرا ہوا ایک تھال حضرت کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کیا۔

حضرت اس وقت اپنے حجرے میں مصروف عبادت تھے۔ آپ جب عبادت سے فارغ ہوئے تو بادشاہ کے خادموں کو نذرانے کے ساتھ کھڑے پایا۔ بادشاہ ایک جانب سر جھکائے کھڑا تھا۔ حضرت نے کوئی توجہ نہ فرمائی اور مصلیٰ کا ایک کنارہ اٹھا کر فرمایا۔ "ذرا ادھر توجہ فرمائیے"۔

فرغانہ کے بادشاہ نے جب دیکھا تو حیران رہ گیا کہ مصلیٰ کے نیچے زر و جواہرات کا ایک خزانہ ہے جو دریا کی طرح ٹھاٹھیں مار رہے ہے۔ سلطان بڑا نادم ہوا۔ اور خادموں

کو تھال واپس لے جانے کا اشارہ فرمایا۔ خادم اشارہ پاتے ہی واپس چلے گئے۔

بادشاہ پر اس منظر کا اس قدر اثر ہوا کہ وہ آج کوئی بات کئے بغیر واپس چلا گیا۔

دوسرے دن پھر ملاقات کی اجازت چاہی۔ باہمی گفتگو ہوئی۔ اور اس قدر اسرار و رموز سے حضرت نے پردے اٹھائے کہ سلطان حضرت کے عقیدت مندوں میں شامل ہوگیا۔

عشاء کی نماز کے بعد حسب معمول حضرتؒ کے اکابر خلفاء اور تمام فرزند حلقہ بنا کر دوزانو بیٹھے ہوئے دیکھے تو سلطان نے عرض کیا۔

"حضور! اس خادم کی ایک عاجزہ ہے اپنی اولاد میں سے کوئی مخدوم زادہ مرحمت فرمایئے تاکہ اسے ان کی غلامی میں دے سکوں"۔

حضرت بہاؤ الدین زکریا رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا۔ "میرے تمام لڑکے اس جگہ موجود ہیں۔ جس کو آپ اپنے فرزندی میں لینا چاہیں آپ مختار ہیں۔"

سلطان نے حضرت صدر الدین عارف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عرض کیا۔

"ان کی خدمت کرنے کے لئے میری بیٹی خوش رہے گی"۔

حضرت نے اپنے بیٹے خواجہ صدر الدین عارف کو اپنے پاس بلایا اور پوچھا کہ صدر الدین کیا آپ کو شہنشاہ فرغانہ کی بیٹی کا رشتہ منظور ہے؟ صدرالدین اسی وقت حضرت، خواجہ کے قدموں پر جھک گئے۔ قدموں کو بوسہ دیا اور سر کو جھکا کر عرض کیا میں آپ کی مرضی پر خوش ہوں۔

دونوں طرف مسرت و انبساط کی ایک لہر دوڑ گئی۔ حضرت نے سلطان کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "مبارک ہو"۔ خدام سے فرمایا۔ "جاؤ مٹھائی لے آؤ" پھر اس مجلس میں رسم نکاح بھی ادا کی ایجاب و قبول ہوا۔ حضرت خواجہ نے خود ہی خطبہ تلاوت فرمایا۔

اس وقت ظاہر و باطن کی دنیا سے تہنیت اور مبارک مبارک کی صدائیں بلند

ہوئیں اس کے بعد سلطان جمال الدین نے شہزادی کا ہاتھ حضرت شیخ الاسلام کے دست مبارک میں دے کر فرمایا۔

"من ایں عاجزہ را مسلمان را روز قیامت مسلمان میخواہم"۔

حضرت خواجہ بہاؤ الدین زکریا رحمتہ اللہ علیہ نے بی بی صاحبہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔

"ایں فرزند من است انشاء اللہ مسلمان خواہد بود"۔

اس کے بعد سلطان نے اجازت چاہی اور اپنے وطن کو واپس روانہ ہوگیا۔

اور وہ نور جو شہزادی راستی نے دیکھا تھا اور وہ کمال ہستی جس کا اندازہ اس نے اپنے نور بصیرت سے لگایا تھا' وہ حضرت قطب الاقطاب حضرت شاہ رکن عالم ملتانی رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت ہے۔ جو حضرت خواجہ صدرالدین عارف کے صاحبزادے اور حضرت بہاؤ الدین زکریا کے پوتے ہیں۔

حوالہ کے لئے:۔

اولیائے ملتان

اردو انسائیکلو پیڈیا' مطبوعہ فیروز سنز' لاہور

ماہنامہ نور اسلام' مئی ۱۹۹۲ء

خارش

★ جب وقت کے حکمران غریبوں کے قتل و خون پر توجہ نہیں دیتے تو قتال کا شغل اختیار کرنے والوں کی تلواریں ہر وقت خون کی پیاسی رہتی ہیں۔

★ حکمرانوں کی کوتاہیاں عوام کے سر پر عذاب بن کر نازل ہوتی ہیں۔

★ جو شخص بیماری سے تنگ آ جائے وہ مرجانا چاہتا ہے۔

★ ولی کامل (حضرت سہل بن عبداللہ تستری) ستر دن کے بعد صرف ایک بادام کھاتے ہیں۔

★ فقیر اور امیر تو بس مخلوق خدا کے آرام و سکون کے لئے ہیں۔

★ ولی کامل نے فرمایا دعا اس کے حق میں اثر انداز ہوتی ہے ، جو تائب ہو چکا ہو۔

★ ولی اللہ نے دعا مانگ کر بیمار پر پھونک ماری بیماری اسی دم سے کافور ہونے لگی۔

جب وقت کے حکمران غریبوں کے قتل و خون پر توجہ نہیں دیتے تو قتال کا شغل اختیار کرنے والوں کی تلواریں ہر وقت خون کی پیاسی رہتی ہیں۔ اور خون بہاتے وقت وہ کسی امیر اور غریب میں امتیاز نہیں کرتیں پھر تو ان تلوار

اٹھانے والوں کے قدموں کو شاہی محلوں کی دیواروں تک کو پھاندنا کوئی زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔

عباسی حکمرانوں میں سے چودھویں حکمران المہتدی باللہ نے تخت حکومت سنبھالا تو باوجود عابد و زاہد، شجاع اور ذی فہم ہونے کے غیر ذمہ دار مشیروں کے ہتھے چڑھ گیا، شورشوں نے ایسا جنم لیا کہ اس کے تخت و تاج کو استحکام نہ مل سکا اور اسے صرف گیارہ ماہ پندرہ دن کے بعد موسیٰ بن بغا نے ایک عبرت ناک سزا (خصیے دبا کر) دے کر موت کے منہ میں دھکیل دیا۔

اب المتعمد علی اللہ کو لوگوں نے جیل سے نکال کر تخت حکومت پر بٹھا دیا۔ مگر یہ حکومت کرنے کی بجائے لہو ولعب میں منہمک ہو گیا عوام کے آرام و سکون کو اپنی آرام پسندی کے داؤ پر لگا دیا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف زنگیوں نے بصرہ اور اس کے گرد و نواح میں لوٹ مار شروع کر دی اور قرب و جوار کے شہروں کو تباہ و برباد کر کے ان میں آگ لگا دی اور ہر طرف قتل و غارت گری کر کے تباہی مچا دی تو دوسری طرف ایران کے صفاریہ خاندان کے بانی یعقوب بن لیث نے خراساں، سیستان، فارس، کرمان، ہرات اور بلخ کو فتح کر کے خلافت بغداد کو زبردست زک پہنچائی اس صفاریہ حکومت کا صدر مقام سیستان تھا۔

حکمرانوں کی کوتاہیاں عوام کے سر پر عذاب بن کے نازل ہوئیں، مقتول کی لاش پر جس نے نوحہ کیا وہ بھی قتل کر دیا گیا اور جس نے قتل کرنے والوں کا ساتھ دیا وہ بھی بعد میں مار دیا گیا۔ صفاریہ خاندان والوں میں ایک بادشاہ عمرو بن اللیث بھی سیستان کے تخت پر متمکن ہوا مگر اس کے ہاتھ میں خون کی پیاسی تلوار تھی، جس نے بھی سلطنت بغداد کی تعریف میں ایک جملہ

کہا عمرو کی تلوار نے اس کی زبان کو کاٹ کر رکھ دیا، معمولی معمولی باتوں پر لوگوں کو جیلوں میں ٹھونسنا شروع کر دیا لوگوں مین خوف و ہراس پھیل گیا وہ گھروں میں ہی قید ہو کے رہ گئے۔

چنانچہ ۲۶۶ ھ (۸۸۰ء) میں جب رومی دندناتے ہوئے آئے اور خانہ کعبہ کے قیمتی زریں پردوں کو لوٹنا شروع کیا تو کوئی بھی ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بنا۔

قدرت نے یہ بے حسی دیکھی تو حجاز، عراق اور بلخ کو قحط سالی میں مبتلا کر دیا اور گندم کی ایک بوری (اڑھائی من کے قریب) ۱۵۰ دینار (موجودہ پاکستانی سکہ ۱۴۰۰۰ روپے) میں بکنے لگی لوگوں پر فاقے آنے لگے زنگیوں کے سردار (سپہ سالار) بہبود نامی نے نبوت کا دعوی کر دیا تو حکومت نے اس دعوی نبوت پر بھی کوئی توجہ نہ دی، ختم نبوت پر عقیدہ رکھنے والے خود ہی دیوانوں کی طرح ایک دیوار بن گئے۔ اور ایک لاکھ پچاس ہزار نوجوانوں نے اپنے سروں کا نذرانہ بارگاہ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں پیش کر دیا ان نعرہ رسالت لگانے والوں نے دن رات یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پکارا اور اس وقت تک دم نہیں لیا جب تک بہبود جھوٹے نبی کا سر کاٹ نہیں لیا، سر کاٹا تو پھر نیزے کی انیوں پر اس کی نمائش کی گئی اور ہر زمانے میں آنے والے ایسے جھوٹے مدعیان نبوت پر واضح کیا گیا کہ مسلمان ناموس رسالت کی حفاظت یوں کیا کرتے ہیں۔

مگر لہو لعب اختیار کرنے والے حکمرانوں کے باعث جو عذاب مسلمانوں پر آ رہے تھے۔ وہ ابھی تھمے نہیں اچانک عراق کی راجدھانی میں ہیضہ کی وباء پھوٹ پڑی اور ۲۵۶ ھ سے ۲۷۰ ھ تک (۸۷۰ء تا ۸۸۴ء) میں جس قدر

لوگ جنگوں میں مرے ان سے بھی زیادہ لوگ اس وباء کے باعث موت کے منہ میں چلے گئے۔

کیا مسلمانوں کا مرنا اب ختم ہو گیا تھا؟ نہیں ابھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی فصلوں کو ویران کرنا تھا ان کے مویشیوں کو بھوکے مارنا تھا۔ ۲۷۸ھ بمطابق ۸۹۲ ء کا آغاز ہوا تو دریائے نیل کا پانی خشک ہو گیا کہیں تری کا نام و نشان تک باقی نہ رہا خشک سالی نے بھی اپنے اثرات دکھانے شروع کر دیئے جس کی وجہ سے قحط پڑ گیا۔

اتنے لوگ مرتے رہے مگر وقت کے حکمرانوں نے اپنی عیاشیوں کے حصار سے باہر نکلنا پسند نہیں کیا اب مسلمانوں نے اذانیں دینی شروع کر دیں ان کے سجدوں میں انکساریاں عود کر آئیں لوگ اپنے خالق کے دربار میں گڑگڑانے لگے، جہاں وہ اپنے گناہوں کی معافیاں مانگتے وہیں عیش پرست حکمرانوں سے نجات کی دعائیں بھی مانگتے۔

خداوند کریم کو ان لوگوں کی بھیگی ہوئی آنکھیں پسند آ گئیں ان کے گڑگڑانے میں عاجزی ہی عاجزی دکھائی دی ان کے سجدوں میں خلوص نظر آیا ۲۷۹ھ (۸۹۳ء) میں المعتمد علی اللہ کے لئے زہر کا پیالہ تیار کروایا اور تنگ آنے والوں نے اس کے حلق میں اتارنے کے لئے ایک کثیر رقم محافظ کو ادا کی اور اسے ابدی نیند سلا دیا، بعض کہتے ہیں اسے گلا دبا کر ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا گیا اور ادھر عمرو بن اللیث کو بیمار کر دیا اسے خارش نے جکڑ لیا سارا جسم متورم ہو گیا، پھپھولے پھوٹنے لگے، خارش ہوتی تو اپنے ہی ہاتھوں سے زخم چھیل دیتا خون اور پیپ ہر وقت رستا رہتا کوئی شخص اس کے پاس بیٹھنے کو تیار نہ تھا اس کے اپنے بیوی بچے اس سے دور رہتے تعفن بدبو اور

کراہت کے علاوہ انہوں نے سن رکھا تھا کہ خارش اچھوت کی بیماری ہے خارش ایک جسم سے دوسرے جسم کو لگ جاتی ہے لہٰذا وہ اس کے قریب نہ آتے۔

شاہی محل کا ایک کمرہ اس کے لئے مخصوص کر دیا گیا وہ وہیں پڑا رہتا نوکروں کو آواز دیتا تو وہ بھی اکثر اوقات اس کی بات سنی ان سنی کر دیتے۔

حکیم اور طبیب آئے انہوں نے اپنے سارے نسخے آزما لئے مگر آرام نہیں آنا تھا، نہ آیا۔ ایک دن کسی ظریف الطبع نوجوان نے کہا کہ بادشاہ کو گندے پانی میں نہلاؤ خارش سے آرام آ جائے گا یہ بات آہستہ آہستہ بادشاہ کے کانوں تک پہنچ گئی۔ ایک رات بادشاہ رات کے اندھیرے میں اٹھا اور گندے چھپڑ میں داخل ہو گیا خوب ڈبکیاں لگا لگا کر نہایا پھر اسی طرح لتھڑے جسم کے ساتھ ادھر ادھر پھرتا رہا صبح کے وقت پانی گرم کر کے دوبارہ نہایا کپڑے تبدیل کئے۔ یہ عمل نہ جانے اس نے کتنے دن تک کیا مگر افاقہ اب بھی نہیں ہوا، آخر جسم گلنے لگا کرموں نے سر نکالے تو چیخ اٹھا۔

لوگو! میں مرجانا چاہتا ہوں۔ آؤ میرا گلا دبا دو یا میرا گلا کاٹ دو میں اس اذیت ناک زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ اگر اس دنیا میں میرا کوئی مسیحا نہیں ہے تو کوئی عزرائیل ہی بن کے آ جائے اور مجھے اس عذابِ زندگی سے چھٹکارا دلائے۔

روحانی دنیا میں یہ دور حضرت سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، آپ کا مقام صوفیائے کرام میں بہت بلند ہے۔ اگر انہیں مقتدائے صوفیاء کہا جائے تو یقیناً، بے جا نہ ہو گا آپ فاقہ کش اور شب زندہ دار ولی تھے آپ فرمایا کرتے تھے کہ جس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ یعنی کیا میں تمہارا

رب نہیں ہوں؟ ------ اس وقت میں نے جو جواب دیا مجھے اب بھی یاد ہے یعنی میں نے کہا تھا "بلیٰ"

آپ کی ابتدائی تربیت آپ کے ماموں حضرت محمد بن سمار نے فرمائی جو بذات خود بھی ایک درویش اور ولی کامل تھے آپ کی غذا ستر شبانہ روز کے بعد صرف ایک بادام ہوا کرتی تھی، کسی نے آپ کے اس بغیر کھانے پینے کے گزارہ کرنے کے بارے میں پوچھا۔

فرمایا شروع شروع میں مجھے نہ کھانے سے نقاہت ہوتی اور کھانے سے قوت محسوس ہوتی تھی مگر اب اس کے بالکل خلاف ہوتا ہے کھاتا ہوں تو نقاہت ہوتی ہے، نہیں کھاتا ہوں تو قوت ملتی ہے۔

آپ نے پیدل حج فرمایا حج کے دوران میں حضرت ذوالنون مصری سے بیعت ہوئے اور واپس آ گئے وہ لوگوں سے کوئی سوال نہ کرتے تھے اور نہ ہی لوگوں کے کسی سوال کا جواب دیتے تھے، بس دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے رہتے تھے۔

ایک دن خلاف معمول فرمایا لوگو! آؤ مجھ سے جو پوچھنا چاہتے ہو پوچھو۔

لوگوں کا ایک جم غفیر اکٹھا ہو گیا اپنا سوال کئے بغیر سب نے یک زبان ہو کر پوچھا کہ پہلے آپ کسی کے سوال کا جواب نہ دیتے تھے آج آپ نے سب کچھ بتا دینے کا دعوی کیسے کر لیا؟

فرمایا لوگو! تم شاید نہیں جانتے تھے آج سے پہلے میرے استاد حضرت ذوالنون مصری حیات تھے ان کی زندگی میں مجھے جرات نہ تھی کہ میں کسی کو کچھ بتاؤں چونکہ آج ان کا وصال ہو گیا ہے۔ لہذا میں ان لوگوں کو محروم نہیں رکھنا چاہتا جو کوئی علمی مسائل دریافت کرنا چاہتے ہیں لہذا ایسے لوگوں کو

میں خود دعوت دے رہا ہوں۔

لوگوں کو اس بات پر یقین نہ آیا اور ان کی اس بات کو ایک مجذوب کی بات سے زیادہ اہمیت نہ دی تاہم بعض لوگوں نے یہ دن اور تاریخ نوٹ کر لی اور تحقیق کرنے لگے جلد ہی ان لوگوں کو پتہ چل گیا کہ حضرت سہل بن عبداللہ تستری کی بات درست تھی۔ واقعتاً حضرت ذوالنون مصری وصال فرما گئے تھے پھر تو لوگوں کا ایک جمگٹا آپ کے گرد رہنے لگا، جو شخص جس قسم کی حاجت لے کر آتا آپ کے فیض کرم سے مالا مال ہو کے جاتا۔

یہ خبر کشاں کشاں سیستان کے بادشاہ عمرو بن اللیث تک بھی پہنچ گئی۔ کسی خادم سے کہا جاؤ حضرت سہل بن عبداللہ تستری کو بلا لاؤ خادم نے عرض کیا حضور وہ فقیر آدمی ہیں، انہوں نے حاجتوں سے منہ موڑ رکھا ہے وہ کیونکر آپ کے ہاں تشریف لائیں گے؟ آپ کو خود ہی ان کے ہاں جانا ہو گا۔

مگر میں اس تکلیف دہ بیماری کے باعث کیسے جاؤں میری سزا کا اشتہار تو پہلے ہی لگا ہوا ہے اب مجھے مزید رسوا نہ کرو جاؤ کہہ کے تو دیکھو شاید آ جائیں۔

بادشاہ کا نوکر حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا بادشاہ کی بیماری کا ذکر کیا اور بلائے جانے کا پیغام دیا مگر حضرت صاحب نے اس کی کسی بات پر توجہ نہیں دی، آپ لوگوں میں فیوض و برکات بانٹتے رہے کچھ ہجوم کم ہوا تو نوکر نے پھر آگے بڑھ کر اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔

آپ نے فرمایا نوجوان! فقیر کو امراء کے ہاں جانا پسند نہیں ہے اس معاملے میں مجھے مجبور سمجھیں۔

نوکر نے جا کر بادشاہ سے ساری حقیقت بیان کر دی۔

بادشاہ نے کہا ہاں واقعی بے نیازی کی دولت سے مالا مال ہیں ہم احتیاج والے ہیں۔ ہمیں ہی ان کے ہاں جانا چاہیے۔

جا کر دوسرے خدام کو بلا لاؤ اور مجھے وہاں ان کی بارگاہ میں لے چلو۔

اب بادشاہ کے لباس کو تبدیل کیا گیا اور چارپائی پر لٹا کر بالکل مردوں کی حیثیت میں آپ کے پاس لے جایا گیا۔

لوگوں نے بادشاہ کو اس حالت میں دیکھا تو توبہ توبہ کرنے لگے وہ بادشاہ جس کو قتل کا حکم دیتے ہوئے ذرا بھر خوف خدا نہ آتا تھا آج کس قدر بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں کرموں کی خوراک بن رہا ہے، گویا ایک ایک کرم مخلوق خدا پر روا رکھے گئے۔ ظلموں کا بدلہ لے رہا ہے اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے قطرے تیر رہے تھے اس کے لبوں پر سے مسکراہٹیں چھین لی گئیں تھیں، اس کے جسم کی حرکتیں مفلوج ہو گئی تھیں اس کی زبان بات کرتے ہوئے لڑکھڑاتی تھی۔

حضرت صاحب اس وقت ایک گزر گاہ کے کنارے بیٹھے فیض عام کا لنگر بانٹ رہے تھے۔

لوگوں نے حضرت صاحب کو بتایا کہ بادشاہ کی چارپائی آ رہی ہے کیا خبر وہ مرگیا ہو بیچارہ کئی دنوں سے بیمار تھا۔ آپ نے فرمایا۔

ہاں وہ بیمار ہے مگر اسے ابھی مرنا نہیں ہے، اس کی زندگی عبرت گاہ جہان بنی ہے۔

تھوڑی ہی دیر بعد بادشاہ کی چارپائی شارع عام میں رکھ دی گئی ہر گزرنے والے نے اسے دیکھا جو لوگ بادشاہ تک فریاد لے جانے میں بے بس تھے اب بادشاہ ان کی راہوں میں پڑا تھا۔

سیستان کے پورے شہر میں خبر پھیل گئی کہ بادشاہ عمرو بن اللیث کو حضرت سہل بن عبداللہ تستری کی خدمت میں لایا گیا ہے۔ وہ بھاگ بھاگ کر آنے لگے وہ بادشاہ کو دیکھتے اور بادشاہ بھی ہر آنے والے کو دیکھتا ان دیکھنے والوں میں وہ بچے بھی دکھائی دیئے جو ان کی تلوار سے یتیم ہو گئے تھے۔ ان بوڑھوں کو بھی دیکھا جن کے بڑھاپے کے سہاروں کو چھین لیا گیا تھا ان دیکھنے والوں میں وہ عورتیں بھی آئیں جن کے سہاگ بادشاہ نے لوٹ لئے تھے اور اگر نہیں آئے تو وہ لوگ بادشاہ کو دیکھنے نہیں آئے تھے جو اس کی جیلوں میں بند پڑے تھے۔ اور ان کی بہو بیٹیاں فاقوں کی زندگی گزارنے پر مجبور ہو چکی تھیں۔

اب حضرت صاحب نے بادشاہ کے کارندوں سے فرمایا ذرا اس ہجوم کو ایک طرف کر دو تو بادشاہ کو مجھ سے اور میری بادشاہ سے بات ہو۔

بادشاہ کے کارندوں نے بازو پکڑ کر ایک حلقہ بنا دیا جس میں بادشاہ کی چارپائی رکھی تھی۔

حضرت صاحب نے پوچھا عمرو! کیا بات ہے ایک بوریہ نشین فقیر کے ہاں آپ کی آمد کس لئے ہے۔؟

بادشاہ نے نحیف و ناتواں آواز میں عرض کیا حضور، مرنے کے قریب ہوں بس جلدی سے مار دیجئے۔

نہیں مرنے کی تمنا درست نہیں ہے، موت کو یاد رکھو مرنے کی خواہش نہ کرو۔ **لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ** (اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے) فقیر اور امیر تو مخلوق خدا کے آرام و سکون کے لئے ہیں اگر یہ مایوس ہو جائیں اور مرنے کی تمنا کرنے لگیں تو مظلوم کو ظلم کے پنجوں سے کون

بچائے گا۔ مخلوق ہونے کے اعتبار سے ہم سب برابر ہیں۔ خالق کائنات کی
زمین پر جس طرح ایک بادشاہ اور شہنشاہ کو زندہ رہنے کا حق ہے اسی طرح
ایک غریب اور نادار کو بھی ہے' ایک شخص دوسرے کے حقوق کا محافظ تو ہے
حقوق کو سلب کرنے یا چھیننے کا حق کسی کو نہیں ہے۔

بادشاہ نے عرض کیا جب لوگ کسی سے نفرت کرنے لگیں تو پھر اس کے
زندہ رہنے کا کیا فائدہ ہے؟

مگر نفرت کئے جانے سے پہلے اس نے لوگوں کے دل کیوں نہ جیتے؟ اس
نے محبت اور پیار کیوں نہ بانٹا؟ اس نے نفرتوں کا بیج کیوں بویا؟

مگر حضرت صاحب میں تو بیمار ہوں میری بیماری نے ہی مجھے قابل نفرت
بنا دیا ہے' اب تو مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی ہے۔

عمرو! جانتے ہو یہ بیماری تمہیں کس نے لگائی؟

بادشاہ اس سوال پر چپ رہا آپ نے فرمایا۔

ہاں ہاں بیماریاں اور صحتیں اس رب کی طرف سے ہیں جو خیر و شر کا
مالک ہے۔ جو روشنی اور تاریکی کا خالق ہے' جو ظالم کو تائب ہونے کی مہلت
دیتا ہے اور مظلوم کو ظلم برداشت کرنے کے حوصلے۔ اے عمرو صحت و جوانی
اور اقتدار کے نشے میں تم نے لوگوں پر جو زیادتیاں کی ہیں ان پر نادم ہو جاؤ
سچے دل سے توبہ کر لو اور اپنے رب سے وعدہ کرو کہ آئندہ اس کی مخلوق کو
اپنے ظلموں کا تختہ مشق نہیں بناؤ گے تو اس کی رحمت کے نظارے دیکھنا وہ
بڑی جلدی توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔

آپ میرے لئے دعا فرمائیں اللہ تعالیٰ مجھے اس تکلیف سے نجات عطا
فرمائے۔

میں نے عرض کیا نا دعا اس کے حق میں اثر انداز ہوتی ہے جو تائب ہو
چکا ہو لہٰذا تم پہلے توبہ کر کے ان قیدیوں کو رہا کرو جو تم نے بغیر کسی وجہ کے
قید خانوں میں ڈال رکھے ہیں اور ان قیدیوں سے معافی مانگو جن کا قصور فقط یہ
ہے کہ انہوں نے آپ کی غلط بات میں ہاں میں ہاں نہیں ملائی یا جنہوں نے
غیر اسلامی حرکتوں پر اتفاق نہیں کیا۔

حضور! میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایسے تمام قیدیوں کے لئے
دروازے کھول دوں گا۔

نہیں ابھی جیل خانہ جات کے نگران اعلیٰ کے نام حکم نامہ لکھو پھر آپ
کے حق میں دعا کروں گا۔

بادشاہ نے اسی وقت میر منشی کو طلب کیا اور حضرت صاحب کی خواہش
کے مطابق تمام قیدیوں کی رہائی کے احکام لکھوا دیئے۔

اب آپ نے بادشاہ کے حق میں دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے عرض کیا۔

بار الٰہا! جس طرح تو نے اپنی نافرمانی کی ذلت اس کو عطا کی اسی طرح
میری عبادت کی عظمت بھی اس کو دکھا دے تاکہ اس پر واضح ہو جائے کہ
مجھے نافرمانوں کی نسبت فرمانبرداروں سے زیادہ تعلق ہے' اپنے نبی پاک صلی
اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں اسے صحت عطا فرمائیں چاہتا ہوں چارپائی پر
آیا ہے اب خود چل کر اپنے گھر میں جائے۔

اگرچہ لوگوں کو ایسا ہونا مشکل دکھائی دے رہا ہے۔ مگر تو عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ
قَدِیْرٌ ہے۔ تیرے لئے کیا مشکل ہے۔

آپ نے اپنے ہاتھ منہ پر پھیرے پھر بادشاہ کے جسم پر پھونک ماری
بادشاہ اسی وقت صحت یاب ہونا شروع ہو گیا کرم معدوم ہو گئے۔ خارش کے

زخم ہر آن مندمل ہونے لگے، کھجلی کی تکلیف یکدم رفع ہو گئی بادشاہ کو سکون ملنے لگا۔

لوگوں نے پہلے یہی کچھ دیکھا تھا کہ تکلیف آنے میں دیر نہیں لگتی جانے میں دیر لگتی ہے، مگر حضرت سہل بن عبداللہ تستری کی یہ کرامت تھی کہ تکلیف کے جانے کی رفتار تکلیف کے آنے کی نسبت زیادہ تھی۔ بادشاہ ہر لمحے صحت یاب ہوتا گیا بالآخر اٹھ بیٹھا اور حضرت صاحب کے قدموں میں گر گیا اور ایک خطیر رقم کا نذرانہ حضرت صاحب کی خدمت میں پیش کیا مگر آپ نے قبول نہیں فرمایا، کہنے لگے۔

ہمیں آپ کے مال و دولت کی ضرورت نہیں ہے یہ جن کا حق ہے انہیں دو یا غربا میں بانٹ دو۔

بادشاہ چلا گیا آپ کا ایک مرید آگے بڑھا عرض کیا حضور! آپ کے علم میں ہے کہ میں مقروض ہوں آپ بادشاہ کا نذرانہ قبول فرما کر مجھے دے دیتے تاکہ میرا قرض ادا ہو جاتا۔

آپ نے فرمایا ہمیں ان بادشاہوں کے مال و دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو غریبوں کا نچوڑا ہوا خون ہے آؤ میرے قریب آؤ میں آپ کو مال و دولت دکھاؤں آپ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا فرمایا اپنے گردوپیش میں دیکھو تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے؟

مرید کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں پکار اٹھا۔

حضور! ہر ایک چیز سونے کی ہے۔

فرمایا بتاؤ ہم نے بادشاہوں کے مال و دولت کو کیا کرنا ہے؟ لے لو جتنا سونا چاہتے ہو تاکہ تمہارا قرض ادا ہو جائے۔

حضور! میں تو دیکھ کر ہی مالا مال ہو گیا ہوں، ایک رتی بھر سونا اٹھانے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے۔

اب آپ نے اپنے اس مرید کو اتنا مال دے دیا جس سے اس کا قرض ادا ہو گیا۔ ایک دو دن کے بعد بادشاہ نے غسل صحت کیا اور ایک جشن کا اہتمام کیا حضرت صاحب کو بھی اسی میں شمولیت کی دعوت دی مگر آپ نہیں گئے، بادشاہ ہمیشہ کے لئے آپ کے عقیدت مندوں میں شامل ہو گیا۔ آپ کی خدمت میں اکثر حاضر ہوتا رہتا اور کاروبار سلطنت سے متعلق مشورے لیتا رہتا۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری کے وصال کے بعد آپ کی قبر مبارک سے کافی عرصے تک یہ آواز آتی رہی۔

خدا کے سوا نہ کوئی معبود ہے نہ اس کا کوئی شریک۔

حوالہ کے لئے

امدادی کتب

تذکرہ الاولیاء از حضرت شیخ فرید الدین عطار

تاریخ الخلفا از امام جلال الدین سیوطی

انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ترجمہ مولانا غلام رسول مہر

فیروز سنز، اردو انسائیکلوپیڈیا

جامع اللغات از خواجہ عبدالمجید بی اے

نور اسلام، شرقپور شریف جنوری ۱۹۹۶ء

ہدیٰ اسلامی ڈائجسٹ نئی دہلی مئی ۱۹۹۶ء

شکار

☆ خلق خدا کی خدمت بہت بڑی خدمت ہے۔

☆ مرد کامل کا حکم جانور بھی مانتے ہیں۔

☆ حضرت سرمست رحمتہ اللہ علیہ کی ایک کرامت

☆ حافظ آباد کی بنیاد اور نام کی وجہ تسمیہ۔

ایسے لگتا ہے کہ انسان کے زمین پر آنے سے پہلے جنگلی مخلوق آ گئی تھی۔ کیونکہ ایک طرف اس مخلوق نے انسان کا استقبال کرنا تھا اور دوسری طرف اس کے دسترخوان پر اپنا گوشت پیش کرنا تھا۔ انسان کی باربرداری کے کام بھی کرنے تھے اور اس اشرف المخلوقات پر قربان بھی ہونا تھا اور پھر ان جانوروں کی وفاداری دیکھو کہ انسان جوں جوں زمین کو آباد کرتا چلا جاتا ہے، یہ جانور خود بخود آبادیوں سے دور چلے جاتے ہیں اور اس کے کام آنے کے لئے اپنی نسل میں اضافہ کر کے اسے پروان چڑھاتے رہتے ہیں۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ زمین پر رنگین مناظر کھڑے کرنے والا انسان جنگلوں میں ان جانوروں کو ابھی تک تلاش کرتا پھرتا ہے۔ ان جانوروں میں ہرن بڑا خوبصورت جانور ہے جب یہ چوکڑیاں بھرتا ہوا بھاگتا ہے تو انسان کے تیز رفتار گھوڑے اس کی گرد تک کو نہیں پہنچ سکتے۔ امراء اس کے شکار کے لئے اچھی نسل کے گھوڑے پالتے ہیں، پھر ان کے پیچھے پہروں گھوڑے

دوڑاتے ہیں یہ ان کے تیروں کی زد سے نکل کر ایسے بھاگتے ہیں کہ شکاری شہزادے ہانپتے رہ جاتے ہیں۔

جہاں اب شیخوپورہ آباد ہے یہ کسی زمانے میں ہرنوں کی خاص شکار گاہ تھی۔ نورالدین جہانگیر جو شیخوبابا کے نام سے مشہور تھا اسی شکار گاہ میں ہرن کا شکار کھیلا کرتا تھا اسی شکار گاہ سے اسے ایک ایسا ہرن ہاتھ لگا جو اسے بے حد پیارا تھا اور شاید قدرت نے اسے جہانگیر کے لئے ہی پیدا کیا تھا۔ اس نے اس ہرن کا نام منس راج رکھا، منس راج سے جہانگیر کو جنون کی حد تک عشق ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب منس راج بیمار ہو کر اچانک مرگیا تو جہانگیر کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اور پھر اس نے اسے چیلوں کوؤں اور کتوں کے حوالے نہیں کیا اور نہ ہی اس کی لاش کو چلچلاتی دھوپ میں گلنے سڑنے کے لئے پھینکا بلکہ اسے انسانوں کی طرح کی قبر بنا کر دفن کیا اور پھر اس سے اپنی محبت کا اظہار یوں کیا کہ اس کی قبر پر ایک مینار بنایا اور اس کے قریب بہت بڑا تالاب تعمیر کیا یہ مینار اور تالاب اب تک شیخوپورہ سے چار کلومیٹر کے فاصلے پر موجود ہیں۔ اسے اولا" ہرن مزار کہا گیا مگر بعد میں ہرن مینار کے نام سے اس نے شہرت پائی۔

یہ ہرن مینار بننے سے کچھ عرصہ پہلے جہانگیر کا باپ جلال الدین اکبر بھی ہرن کا شکار کھیلنے کے لئے آیا تھا۔ یہاں اس نے خیمے لگائے تو جنگل میں ایک شہر آباد ہو گیا۔ چند دن کے بعد جب سفر کی تھکاوٹ دور ہوئی تو ایک شام بادشاہ نے نوکروں کو حکم دیا کہ کل صبح ہم شکار کو جائیں گے، گھوڑوں پر شکار سے متعلق ضروری سامان باندھ کر گھوڑوں کو تیار کر دیا جائے اور جن امراء کو اس نے ساتھ لینا تھا انہیں بھی تیار رہنے کا حکم دے دیا۔

ابھی سورج کی پہلی کرنوں نے درختوں کی چوٹیوں کو چوما نہیں تھا کہ وہ اپنے خیموں سے کافی دور نکل گئے تھے کہ اچانک بادشاہ کے آدمیوں نے ہرنوں کے پاؤں کے بے شمار تازہ نشانات دیکھے، جو اس بات کے غماز تھے کہ وہ ہرنوں کی قیام گاہ کے قریب پہنچ گئے ہیں اور گذرنے والے ہرن کوئی زیادہ دور بھی نہیں ہوں گے۔ ان کے آگے بے ترتیب گھنی جھاڑیاں اور آسمان سے باتیں کرنے والے اونچے اونچے درخت تھے۔ بادشاہ نے ساتھیوں کو دور تک پھیلا دیا اور احتیاط اور چوکنے ہو کر چلنے کو کہا اور تیر اور کمان بھی ہاتھوں میں کر لینے کا حکم دیا۔ اس طرح وہ بمشکل سو قدم چلے ہوں گے کہ ہرنوں کا ایک غول چوکڑیاں بھرتا ہوا بھاگ کھڑا ہوا بس پھر کیا شکاریوں کے گھوڑے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

مگر ہرن چونکہ جنگل کے راستوں سے واقف تھے وہ ان پیچدار راستوں سے گذرتے ہوئے آگے نکل گئے جھاڑیوں اور درختوں نے قدم قدم پر انہیں روکا بھی اور پناہ بھی دی آخر یہ ہرن منتشر ہو گئے اور جس ہرن کو جدھر رستہ ملا وہ ادھر ہی بھاگنے لگا۔ ہر شکاری ایک ایک ہرن کے پیچھے تھا۔

اکبر بادشاہ بھی ایک ہرن کے پیچھے اپنا گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ اسے اپنے دائیں بائیں اور پیچھے کوئی ساتھی، دکھائی نہیں دے رہا تھا، بارہا اسے خیال آیا کہ وہ ہرن کو چھوڑ کر واپس چلا جائے۔ مگر جونہی وہ سوچتا کہ اگر اس کے دوسرے ساتھی ہرن شکار کر کے لے گئے اور وہ خالی ہاتھوں رہ گیا تو شرمندگی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ وہ برابر اس ہرن کا پیچھا کرتا چلا گیا۔ آخر وہ اس علاقے تک پہنچ گیا جہاں اس وقت حافظ آباد کا خوبصورت شہر آباد ہے۔

یہ علاقہ بڑا زرخیز تھا سبز اور لمبی گھاس اگی ہوئی تھی جونہی ہرن اس

علاقے میں داخل ہوا، وہ یکدم رک گیا اور بڑے اطمینان کے ساتھ گھاس کھانے لگا۔ اسے قطعاً" اس بات کا خوف نہ رہا کہ کوئی شکاری اس کا پیچھا کر رہا ہے۔

بادشاہ نے جب ہرن کو اس حالت میں دیکھا کہ وہ بڑی بے فکری سے گھاس کھا رہا ہے تو وہ بھی حیران ہوا۔ اور فوراً" گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ اور آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ وہ کمان میں تیر جوڑتا اور اس خیال سے تیر نہ چلاتا کہ شاید ہرن نے ہار مان لی ہے اور وہ شہنشاہ ہند کا مطیع بن کر زندہ رہنا چاہتا ہے۔

ہرن نے بادشاہ کو دیکھا اور کلیلیں بھرنے لگا پھر بھاگا اور دور جا کر چرنے لگا۔ بادشاہ کے دل میں جو خیال آیا تھا اسے غلط لگنے لگا لیکن اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ہرن اس کے تیروں کے خوف سے بے نیاز کیوں ہو گیا ہے اسے اپنی موت کی فکر کیوں نہیں ہے۔ وہ کیوں اس قدر مطمئن ہے، کہ بادشاہ کے ہاتھوں سے بچ نکلے گا۔

اس دوران میں بادشاہ کو پیاس نے ستانا شروع کر دیا اس کے ہونٹ اور گلا بالکل خشک ہوتا جا رہا تھا۔ ہرن کی نسبت پانی کی ضرورت کا احساس زیادہ ہونے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے پانی ملے پانی کے بغیر اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔ اس نے ارد گرد دور تک دیکھا مگر پانی کے آثار اسے دکھائی نہ دیئے تاہم دور درختوں کے ایک جھنڈ میں سے اسے دھواں اٹھتا ہوا نظر آیا۔ اس نے ہرن کو چھوڑا اور اٹھتے ہوئے دھوئیں کی طرف چلنے لگا۔

بادشاہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ہرن کچھ فاصلے پر اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ بادشاہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ معاملہ کیا ہے جب میں ہرن کے

پیچھے بھاگ رہا تھا تو ہرن میرے قابو میں نہ آیا اب جبکہ میں نے اس کا خیال ترک کر دیا ہے تو وہ اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا ہے۔

وہ انہیں خیالوں میں گم چلا جا رہا تھا اور اس جگہ کے قریب پہنچ گیا جہاں آگ دھواں بنا رہی تھی۔ بادشاہ نے دیکھا تو اس کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ پندرہ بیس آدمی ایک اللہ والے کے ساتھ محو ذکر و فکر ہیں۔

اس مرد کامل کا نام سرمست تھا۔ ان کا مزار حافظ آباد کے مشرقی حصہ میں ابھی تک مرجع خلائق ہے۔ عقیدت مندوں کا اکثر ہجوم رہتا ہے۔

بادشاہ آگے بڑھا تو ارادت مندوں میں سے کوئی بھی بادشاہ کے استقبال کو آگے نہ بڑھا اور نہ ہی تعظیم کے لئے کوئی کھڑا ہوا۔ وہ بادشاہ جو لوگوں سے سجدہ کروایا کرتا تھا آج کس قدر بے بس بنا ہوا ہے۔

یہ حضرت سرمست رحمتہ اللہ علیہ کی تعلیم کا اثر تھا کہ انسان ساری مخلوقات سے افضل ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات سب سے افضل ہے۔ انسان کا جھکنا اور سجدہ کرنا بس خدا کے لئے ہے یہ بات اکبر بھی سمجھتا تھا مگر اپنے حواریوں کی صحبت سے اس نے کافرانہ روش اختیار کر رکھی تھی۔

بادشاہ کے ضمیر نے اسے جھنجھوڑا وہ سراپا نیاز بن گیا، اس کی اکڑی ہوئی گردن میں خم آ گیا، اس نے ادب کا دامن تھام لیا اس نے غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ لئے ، آگے بڑھا اور جہاں جگہ ملی مؤدب ہو کر بیٹھ گیا۔

عرض کیا حضور، میں پیاسا ہوں اگر پانی کا ایک گھونٹ مل جائے تو میری جان میں جان آئے۔

حضرت صاحب نے دریافت فرمایا اے نووارد تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟

حضور میں شہنشاہ ہند ہوں ، دہلی سے آیا ہوں ۔ مجھے اکبر کہا جاتا ہے۔

میاں! اکبر تو اللہ کی ذات ہے ، کوئی انسان اکبر نہیں۔ عاجز بن کے رہو گے تو لوگوں کے دلوں پر حکومت کرو گے۔ خدا بن کے سجدہ کرواؤ گے تو ذلیل ہو کے مرو گے۔

حضور! میرے ہونٹ خشک ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر پانی مل جائے تو میری جان بچ سکتی ہے۔ میں تو مرا جا رہا ہوں۔

میاں پانی کے خزانے تو زمین کے نیچے ہیں۔ یہ خزانے ان کے ہاتھ لگتے ہیں جو دوسروں کی پیاس کا احساس کریں---- دریاؤں میں یہ پانی اپنی روانیوں کے ساتھ بہہ رہا ہے۔ اب اس کا رخ نہروں کی صورت میں آبادیوں کی طرف موڑو، آبادیوں کی پیاس بجھے گی لوگ آپ کے لئے جام بھر بھر کے لائیں گے۔

حضور! جیسا آپ فرمائیں گے ویسا ہی کروں گا مگر اس وقت میری پیاس کا کچھ کریں۔

آؤ۔ ادھر آؤ۔ میرے قریب آ جاؤ۔ آپ پانی مانگ رہے ہیں نا۔ میں آپ کو ہرنیوں کا دودھ پلاتا ہوں۔

حضور! ہرنیاں کہاں قابو آئیں گی میں تو صبح سے ایک ہرن کے پیچھے بھاگتا ہوا یہاں تک آ گیا ہوں ، مگر وہ ہرن میرے قابو میں نہیں آیا۔

آپ ہرنیوں کا دودھ فرما رہے ہیں ، وہ کیسے یہاں تو کوئی ہرنی مجھے نظر نہیں آتی۔

ہرن اور ہرنیاں یہاں بہت زیادہ ہیں شکاریوں کے تیروں کے خوف سے یہاں ہمارے ہاں آ جاتی ہیں، جو ایک بار یہاں آ جائے جانے کا نام نہیں لیتا۔

وہ ہرن جو بادشاہ کو یہاں تک لے آیا تھا حضرت صاحب کی جھونپڑی کے قریب چر رہا تھا۔ حضرت صاحب نے اسے چمکارا، وہ گردن نیچی کر کے قریب آگیا' حضرت صاحب نے ایک رقعہ لکھ کر اس کے گلے میں ڈالا کہ وہ ہرنیوں کو بلا لائے۔

تھوڑی دیر کے بعد اس ہرن کے پیچھے ہرنیوں کی ایک لمبی قطار آ گئی۔ حضرت صاحب کے ایک خادم نے ہرنیوں کا دودھ دوہا اور ایک کٹورا بھر کر بادشاہ کو دیا۔ بادشاہ تو پہلے ہی پیاس سے مرا جا رہا تھا۔ وہ ایک ہی سانس میں سارا کٹورا خالی کر گیا' اس کی للچائی ہوئی نظریں اور دودھ مانگ رہی تھیں ـــــ اسے ایک اور کٹورا مل گیا۔ بادشاہ نے خوب سیر ہو کے دودھ پیا۔ چہرے پر سے تھکن اور پیاس کے آثار ختم ہوئے۔ بادشاہ خوش ہو گیا، عرض کیا حضور! مجھے کوئی خدمت فرمائیں۔

میاں خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔

حضور بجا فرمایا آپ نے، مجھے عوام کی خدمت کرنے کے لئے اللہ نے چنا ہے۔ میں عوام کی خدمت کہاں نہیں کر رہا آپ میری توجہ اس طرف مبذول فرمائیں؟

دیکھو میاں! اگر تم خلق خدا کے کام آنا چاہتے ہو تو اس جگہ ایک بستی آباد کرو تاکہ میرے مریدوں اور میرے ہاں آنے جانے والوں کو خورد و نوش کی چیزیں آسانی سے مل سکیں۔

اکبر نے عرض کیا حضور! یہاں ایک بستی ضرور آباد ہو گی۔

اکبر کو جانے کی اجازت مل گئی اور شام کے قریب بغیر شکار کے واپس اپنے خیموں میں آگیا۔ ادھر ہر شکاری ایک ایک ہرن لے کر آیا تھا۔ مگر اکبر

کے ساتھ کوئی شکار کا ہرن نہ تھا۔ وہ شرمندہ ہو رہا تھا، مگر حقیقت میں وہ خود شکار ہو کے آیا تھا۔

اس نے اپنے ایک منظور نظر درباری میر حافظ کو بلایا اور کہا کہ وہ حضرت سرمست رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں جائے اور ان کی ہدایت کے مطابق ایک بستی آباد کرے۔ اور اس بستی کا نام اکبر آباد رکھا جائے۔

دوسرے ہی دن میر حافظ اشرفیوں کے توڑے بھر کر حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت صاحب نے چند ضروری ہدایات دیں اور بستی بننے کا کام شروع ہو گیا۔ جو لوگ اس بستی کا نام پوچھتے میر حافظ ' اکبر آباد بتاتا۔ مگر جب اس بستی کے نام کی خبر حضرت صاحب تک پہنچی کہ بستی کا نام اکبر آباد ہو گا۔ آپ نے فرمایا اکبر آباد نہیں' حافظ آباد ہو گا۔ میر حافظ کے نام کی مناسبت سے۔

چنانچہ اس بستی کا وہ نام شہرت نہ پا سکا جس کا پرچار شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر نے کیا تھا۔ مگر اس نام کو استحکام ملا جو ایک فقیر نے رکھا تھا۔

حضرت سرمست رحمتہ اللہ علیہ کا مزار حافظ آباد کے مشرقی حصہ میں موجود ہے۔

بھٹی قبائل چونکہ اکبر کے خلاف تھے۔ ولا بھٹی ان قبائل کا سرخیل تھا اس نے تمام عمر مغلوں کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا اور اکبر اعظم اپنی تمام تر فوجی قوت کے باوجود اسے مطیع نہ کر سکا۔

مغلوں اور بھٹیوں کی معرکہ آرائیوں کے باعث اکبر نے حافظ آباد کی حفاظت کی خاطر فوجی نوعیت کے خاص انتظامات بھی کئے۔ مثلاً" ایک پختہ قلعہ تعمیر کیا گیا۔ سکھوں کے دور حکومت میں اس شہر کو کچھ نقصان پہنچا مگر

چار ہی سال میں یہ نئے رنگ و روپ کے ساتھ پھر آباد ہوا اور اس کے بعد سے اب تک ہر طرح کی آفات سے محفوظ ہے۔ آج اسے ضلع کا درجہ حاصل ہے۔ اور اس حوالے سے اسے ہر قسم کی سہولتیں ہسپتال، سکول، کالج، تھانہ، عدالت وغیرہ حاصل ہیں۔

یقیناً یہ حفاظت اس ولی کامل کے صدقے میں ہے۔

حوالہ کے لئے:

رسالہ "مہک" گوجرانوالہ نمبر گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ

امدادی کتب:

تاریخ پاکستان و ہند از مستنصر باللہ، اردو انسائیکلوپیڈیا فیروز سنز

نور اسلام، شرقپور شریف ستمبر ۱۹۹۳ء

ندائے انصار لاہور۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء

سفارش

- ★ باہر کی دنیا گھر کی نسبت زیادہ غیر محفوظ ہے۔
- ★ اولیاء اللہ کی نگاہ بندوں کے باطن پر ہوتی ہے۔
- ★ اولیاء اللہ کے ہاں جاؤ تو ان کے ادب آداب کا خیال رکھو۔
- ★ مرد کامل نے فرمایا لوگوں کی خدمت کرو اور ان کی دعائیں لو۔
- ★ حکومت کی مضبوطی کا راز عوام کی خدمت میں ہے۔

ریاست اودھ کے کڑہ کے محل میں دونوں میاں بیوی بڑی پرسکون زندگی گزار رہے تھے کہ ایک رات یہ سکون بے سکونی میں بدل گیا--- اس بے سکونی کی وجہ جو بات بنی وہ بالکل معمولی تھی۔ بیگم نے اپنے میاں سے صرف اتنا پوچھا۔

آپ اتنی رات بیت جانے تک کہاں رہے ہیں؟

میاں نے کہا۔ تم کون ہو مجھ سے ایسا سوال کرنے والی؟

بیگم مسکرا دی اور قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

جان من! میں آپ کی بیوی ہوں۔ بیوی کو یہ حق بہرحال ملتا ہے کہ وہ اپنے سرتاج سے ایسے سوال کر سکے۔

آخر کیوں؟

چار ہی سال میں یہ نئے رنگ و روپ کے ساتھ پھر آباد ہوا اور اس کے بعد سے اب تک ہر طرح کی آفات سے محفوظ ہے۔ آج اسے ضلع کا درجہ حاصل ہے۔ اور اس حوالے سے اسے ہر قسم کی سہولتیں ہسپتال، سکول، کالج، تھانہ، عدالت وغیرہ حاصل ہیں۔

یقیناً یہ حفاظت اس ولی کامل کے صدقے میں ہے۔

حوالہ کے لئے:

رسالہ "مہک" گوجرانوالہ نمبر گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ

امدادی کتب:

تاریخ پاکستان و ہند از مستنصر باللہ، اردو انسائیکلوپیڈیا فیروز سنز

نور اسلام، شرقپور شریف ستمبر ۱۹۹۳ء

ندائے انصار لاہور۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء

سفارش

- باہر کی دنیا گھر کی نسبت زیادہ غیر محفوظ ہے۔
- اولیاء اللہ کی نگاہ بندوں کے باطن پر ہوتی ہے۔
- اولیاء اللہ کے ہاں جاؤ تو ان کے ادب آداب کا خیال رکھو۔
- مرد کامل نے فرمایا لوگوں کی خدمت کرو اور ان کی دعائیں لو۔
- حکومت کی مضبوطی کا راز عوام کی خدمت میں ہے۔

ریاست اودھ کے کڑہ کے محل میں دونوں میاں بیوی بڑی پر سکون زندگی گزار رہے تھے کہ ایک رات یہ سکون بے سکونی میں بدل گیا—— اس بے سکونی کی وجہ جو بات بنی وہ بالکل معمولی تھی۔ بیگم نے اپنے میاں سے صرف اتنا پوچھا۔

آپ اتنی رات بیت جانے تک کہاں رہے ہیں؟

میاں نے کہا۔ تم کون ہو مجھ سے ایسا سوال کرنے والی؟

بیگم مسکرا دی اور قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

جان من! میں آپ کی بیوی ہوں۔ بیوی کو یہ حق بہر حال ملتا ہے کہ وہ اپنے سرتاج سے ایسے سوال کر سکے۔

آخر کیوں؟

اس لئے کہ باہر کی دنیا گھر کی نسبت غیر محفوظ ہے۔

کیا کڑہ کے حاکم کے لئے بھی باہر کا ماحول خطرناک ہے؟

ہاں میرے سرتاج۔

نوجوان کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر غصے کی دنیا آباد ہو گئی۔ پھر اس نے غصیلے لہجے میں کہا باہر کی دنیا میں میرے لئے زیادہ دلچسپیاں ہیں۔

یہ تم کیا کہہ رہے ہو سرتاج! —— میں نے گھر کو دلچسپ بنانے میں کون سی کسر چھوڑی ہے؟ آپ تو بڑے خوش قسمت ہیں کہ آپ ایک خوبصورت شہزادی کے شوہر ہیں۔ آپ کے سسر پورے ہندوستان کے بادشاہ ہیں اور پھر انہی کی وجہ سے آپ کڑہ کے حاکم بھی ہیں۔

اچھا کڑہ کا حاکم مجھے آپ کے باپ نے بنایا ہے؟ گویا کہ مجھ میں حاکم بننے کی خوبیاں قطعاً" نہیں تھیں۔

میرے باپ نے آپ کو حاکم نہیں بنایا۔ حاکم تو آپ کو اس خدا نے بنایا ہے جس نے میرے باپ کو شہنشاہ ہند بنایا ہے۔ مگر ظاہری اسباب بھی تو کوئی چیز ہوتے ہیں۔ ان سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔

میں انکار نہیں کر رہا بلکہ حقیقت حال کو بے نقاب کر رہا ہوں۔

کیا مطلب؟

یہی کہ چونکہ مجھے کڑہ کا حاکم بننا تھا اس لئے آپ کے باپ نے آپ کو میرے ساتھ بیاہ دیا۔ واقعی اس لحاظ سے آپ کے ابو بڑے سیانے ہیں۔

یہ اپنی اپنی سوچ کی بات ہے میرے سرتاج۔ میں اسی بات کو یوں بھی کہہ سکتی ہوں کہ چونکہ بادشاہ کی بیٹی آپ کی بیوی تھی اس لئے بادشاہ نے اپنے داماد کو ایک علاقے کا حکمران بنا دیا۔ یقین جانیں، اگر آپ جلال الدین

خلجی کے داماد نہ ہوتے تو کڑہ کا حاکم کوئی اور ہوتا۔ علاؤ الدین خلجی بس اپنے باپ کے کھیتوں میں کام کر رہا ہوتا۔ میرے باپ نے تمہیں یہ اعزاز بخشا کہ تم کڑہ کے حاکم ہو۔ تمہیں تو ممنون احسان ہونا چاہئے۔ مگر آپ تو احسان فراموشی کی حد کر رہے ہیں۔ آپ کو ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے بلکہ احسان فراموشی کی میل دل سے نکال دینی چاہئے۔

بس؛ بس احسان مندی اور احسان فراموشی کے سبق کسی اور کو پڑھانا۔

یہ نوجوان علاؤ الدین خلجی تھا جو جلال الدین خلجی کا بھتیجا اور داماد تھا۔ بہادر اور دلیر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ارادے کا پکا تھا۔ جیسا ارادہ کر لیتا اسے بہر حال پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ ارادہ خواہ غلط ہوتا یا درست، جو فیصلہ کر لیتا اس پر ڈٹ جاتا۔

آج بیگم کی باتوں میں اسے کڑہ کی حکمرانی خیرات میں ملی ہوئی دکھائی دینے لگی، یہ بات اس کے لئے ایک طعنہ تھی۔ وہ یہ بات زندگی کے کسی مقام پر بھی سننا پسند نہ کرتا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ لحہ بہ لحہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور وہ بیگم کے اس خیال کو اس کے دل و دماغ سے محو کر دینا چاہتا تھا کہ علاؤ الدین خلجی اپنے سسر کے بادشاہ ہونے کے باعث حکمران ہے۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ پورے ہندوستان کے تخت کا مالک بنے مگر کیسے؟ یہ ایک سوال تھا جس کا جواب اسے ابھی تک نہیں ملا تھا۔ وہ اس سوچ میں دن رات گم رہنے لگا۔ رات کو سوتا تو قسمت کے ستاروں کو ملانے والے راستوں کو تلاش کرتا رہتا۔

اسے خواب بھی کچھ ایسے ہی آتے کہ دربار دہلی کے امراء و وزراء اس

کے استقبال میں کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر دن کے وقت اسے محسوس ہوتا کہ تخت دہلی تک پہنچنے میں بڑی دقتیں ہیں۔

انہی دنوں جلال الدین خلجی کی نظریں دکن میں واقع دیوگری پر مرکوز تھیں۔ وہ اسے ہر حال میں فتح کرنا چاہتا تھا۔ دیوگری کی دولت اس کے لئے بڑی کشش پیدا کر رہی تھی۔ اس نے اپنے سارے جرنیلوں کا جائزہ لیا، مگر سب کو پست ہمت پایا۔ آخر قرعہ فال علاؤ الدین خلجی کے نام نکلا۔

علاؤالدین خلجی کو شاہی فرمان پہنچا کہ وہ جلدی سے جلدی ایک آزمودہ کار لشکر لے کر دیوگری پر حملہ کر دے۔ مزید تازہ دم کمک بڑی جلدی اس کی فوجوں میں شامل ہو جائے گی۔

شاہی فرمان پاتے ہی علاؤ الدین خلجی نکل کھڑا ہوا اور منزلیں مارتا ہوا دیو گری کے قلعے کے قریب جا پہنچا۔

دیوگری کا راجہ رام چندر کوئی مٹی کا مادھو نہیں تھا، وہ بہادر اور دلیر تھا۔ اگر ادھر علاؤ الدین خلجی دیوگری کے قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دینے کے ارادے لے کر آیا تھا تو ادھر راجہ بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی اہلیت رکھتا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا علاؤ الدین خلجی جس مہم پر ۱۲۹۴ء میں نکلا تھا اس میں کامیابی اسے ۱۲۹۶ء میں ہوئی۔ دو سال تک راجہ کی سپاہ نے ڈٹ کر علاؤ الدین خلجی کا مقابلہ کیا۔ آخر کار راجہ گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور ہو گیا۔ علاؤ الدین خلجی کو فتح نصیب ہوئی۔ اسے بے پناہ دولت، ہیرے اور جواہرات کے علاوہ ایلچ پور کا سارا علاقہ بھی حدود سلطنت میں وسعت کے لئے ملا۔

جلال الدین خلجی فتح کی یہ خوش خبری سن کر علاؤ الدین خلجی کے استقبال میں آیا۔ ایک لمبے چوڑے رقبہ پر جلال الدین خلجی کے امراء کے خیمے لگے

ہوئے تھے۔ ادھر علاؤ الدین خلجی خوشی و مسرت کے شادیانے بجاتا ہوا آ رہا تھا۔

ایک وسیع پنڈال میں بادشاہ نے اپنے جرنیل کا استقبال کرنا تھا۔ جونہی چچا بھتیجا، داماد اور سسر اور بادشاہ اور جرنیل (جلال الدین خلجی اور علاؤ الدین خلجی) باہم بغل گیر ہوئے تو فوراً ہی جلال الدین خلجی کے پیٹ میں ایک چھرا گھونپ دیا گیا۔ خون کا ایک فوارہ پھوٹ نکلا۔ دونوں کے کپڑے سرخ ہو گئے۔ ابھی علاؤ الدین خلجی پیچھے ہٹا ہی تھا کہ جلال الدین خلجی دھڑام سے نیچے آ گرا۔ علاؤ الدین خلجی کے ہاتھ میں خون آلود چھرا تھا۔ اس نے ہی اسے اپنے سسر کے پیٹ میں پیوست کیا تھا۔ بادشاہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔

چوبدار آگے بڑھے، انہوں نے علاؤ الدین خلجی کو گھیرے میں لے لیا مگر اس کی سپاہ نے اس گھیرے کو توڑ دیا۔ اسے گھوڑے پر بٹھا کر لے گئے۔ ازاں بعد امراء نے علاؤالدین خلجی کی بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ افواج اور گورنروں کو جلال الدین کی موت اور علاؤ الدین خلجی کی تخت نشینی کی اطلاع بھیج دی گئی۔

تاہم دہلی کی فضا علاؤ الدین خلجی کے حق میں نہیں تھی۔ بغاوت کا خدشہ تھا۔ علاؤ الدین نے تخت پر بیٹھتے ہی جلال الدین کے خاندان کے سارے افراد کو تہہ تیغ کر دیا۔ مخالفین اور جلال الدین کے ہمنوا سہم سے گئے اور یوں محسوس ہونے لگا کہ پوری رعایا مطیع اور سرنگوں ہو گئی ہے۔ مگر بادشاہ پھر بھی ایسے حالات کے باوجود مطمئن نہیں تھا۔ اس کی عقل کہتی تھی کہ مخالفت نے صرف خاموشی اختیار کی ہے، دبی نہیں ہے۔ جونہی

حالات اس کے موافق ہوں گے یہ دوبارہ سر نکال سکتی ہے۔ اس مخالفت اور نفرت کو محبت میں تبدیل کرنے کے لئے اس نے خزانے کا منہ کھول دیا۔ امراء اور وزراء کو خوب رشوتیں دیں تاکہ وہ جگہ جگہ بادشاہ کی قصیدہ خوانی کرنے لگیں اور عام لوگوں میں بھی دل کھول کر روپیہ تقسیم کیا تاکہ لوگ بادشاہ اور اس کے خاندان کے قتل کو بھول جائیں اور اس کے وفادار بن جائیں۔

یہ نسخہ بڑا کار آمد رہا۔ ایک طرف اس کی سختی نے مخالفت کو دبا دیا تو دوسری طرف رشوتوں نے لوگوں کے منہ بند کر دیئے۔

اب بادشاہ کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ وہ ایک لمبے عرصے تک تخت دہلی پر متمکن رہے۔

علاؤالدین خلجی کے دور حکومت میں حضرت محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ دہلی میں اور حضرت شرف الدین بو علی قلندر رحمتہ اللہ علیہ پانی پت میں رونق افروز تھے۔ بادشاہ کو ان دونوں بزرگوں سے گہری عقیدت تھی۔ اس کی عقیدت نے مجبور کیا کہ جب تک حضرت شرف الدین پانی پتی اس کی حکومت کے لئے دعا نہیں فرمائیں گے اس وقت تک اس کے دور میں انتشار ضرور رہے گا اور اس انتشار کے نتیجے میں اس کی زندگی کی ڈوری کاٹی بھی جا سکتی ہے۔

بادشاہ نے آپ کی خدمت میں سفارت بھیجنے کا پروگرام بنایا۔ اس کے لئے روپوں کی تھیلیاں بھری گئیں۔ تحائف اکٹھے کئے گئے مگر جب سفارت کو بھیجنے کا وقت آیا تو بادشاہ پریشان ہو گیا کہ یہ سفارت کس کی قیادت میں بھیجی جائے کیونکہ آپ کے اجلال اور ہیبت کے باعث وہاں کوئی دم نہیں مار سکتا

تھا۔ بادشاہ جس امیر یا وزیر کو اس کام کے لئے منتخب کرتا وہ یہ کہہ کر انکار کر دیتا۔

حضور! اولیاء اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ انسان کے باطن کی اصلاح کا باعث بن سکتا ہے۔ وہ اپنے مرشد کے ہاں جاتے وقت کوئی امر پوشیدہ نہیں رکھیں گے اور منکرات سے ڈرتے رہیں گے۔ کیونکہ یہ خوف ہر وقت دامن گیر رہے گا کہ مرشد ڈانٹ پلائے گا۔

بادشاہ دن رات پریشان رہنے لگا۔ اس کا دل کہتا تھا کہ اگر اس نے کسی ولی اللہ سے استحکام حکومت کی دعا نہ منگوائی تو یہ حکومت اس کے ہاتھوں سے جلدی نکل سکتی ہے۔

ایک دن بادشاہ انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ حضرت امیر خسرو نے بارگاہ شہنشاہیت میں حاضر ہونے کی اجازت طلب کی۔ حضرت امیر خسرو ان دنوں بادشاہ کے ملازمین میں سے تھے۔

جونہی بادشاہ نے حضرت امیر خسرو کا نام سنا اس کے چہرے پر بشاشت مچلنے لگی بادشاہ نے اولا" حضرت امیر خسرو سے آنے کا سبب دریافت کیا۔ پھر فرمایا خسرو تم نے بڑا اچھا کیا جو تشریف لائے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم پانی پت میں حضرت قبلہ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی رحمتہ اللہ علیہ کے ہاں ایک سفارت لے کر جاؤ۔ اور حضرت صاحب سے عرض کرو کہ وہ تخت دہلی کی حفاظت کے لئے دعا فرمائیں چونکہ سارے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں اس لئے تم کل ہی چلے جاؤ۔

حضرت امیر خسرو نے سر جھکا دیا۔ عرض کیا حضور! میں آپ کا ملازم ہوں۔ دن رات آپ کی خدمت کرنا میرے فرائض میں داخل ہے مگر شاید

آپ کو یاد ہو۔ میں نے آپ کی ملازمت اختیار کرتے وقت یہ عہد لیا تھا کہ میں پہلے ہی کسی کا نوکر ہوں جونہی میری ملازمت اس نوکری پر اثر انداز ہو گی میں فوراً" ملازمت چھوڑ دوں گا اور آپ نے قول دیا تھا کہ ہاں تم (امیر خسرو) حضرت خواجہ محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء کی خدمت اور چاکری میں فرق نہ آنے دینا۔

لٰہذا عرض کروں گا اس سلسلے میں شہنشاہ وقت کا حکم ہی کافی نہیں بلکہ شہنشاہ عرفان حضرت محبوب الٰہی کی اجازت بھی ضروری ہے اگر آپ اجازت لے دیں تو میں جانے کو تیار ہوں ورنہ معذرت خواہ ہوں۔

تو جاؤ اجازت مانگ لو۔ بادشاہ نے کہا۔

میں حضرت محبوب الٰہی کی آنکھوں سے دور ہونے کی اجازت خود مانگوں، ایسا ہرگز مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی بادشاہ سلامت میں عرض کر دوں۔ حضرت صاحب (حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء) سے اجازت پا کر مجھے بھیجنا آپ کے فائدے میں ہے۔ کیونکہ اس طرح سفارت کے ساتھ سفارش کی قوت بھی مجتمع ہو جائے گی۔

بادشاہ کے ذہن میں یہ بات آ گئی چنانچہ علاؤ الدین خلجی خود ایک دن حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔

خادم نے جا کر حضرت صاحب سے عرض کیا کہ شہنشاہ وقت علاؤ الدین خلجی آنحضور سے ملنے کی درخواست کرتا ہے۔

حضور نے فرمایا ہاں آنے دو۔

بادشاہ کا خیال تھا کہ جونہی اس کے آنے کی اطلاع حضور پائیں گے، بھاگے آئیں گے۔ مگر جواب اس کی توقع کے خلاف آیا۔

بادشاہ اپنے چوبداروں کی ہمراہی میں اندر جانے لگا تو خدام نے زائد لوگوں کو روک لیا۔ صرف بادشاہ کو جانے کی اجازت ملی۔

حضور اوراد وظائف میں مصروف تھے۔ بادشاہ سر جھکا کر چٹائی پر بیٹھ گیا۔

حضرت صاحب کے حکم سے ایک مٹی کے پیالے میں پانی پیش کیا گیا۔

بادشاہ تعمیل ارشاد کے طور پر صرف چند گھونٹ پانی پینا چاہتا تھا مگر جونہی بادشاہ نے پیالہ منہ سے لگایا تو وہ اسے ہونٹوں سے جدا نہ کر سکا۔ بادشاہ کہتا ہے کہ اس پانی جیسا پانی اس نے آج تک نہیں پیا تھا۔

بہرحال حضور اوراد سے فارغ ہوئے تو پوچھا۔

علاؤالدین آج فقیر کے ہاں کیسے آنا ہوا؟

حضور! امیر خسرو کو مانگنے کے لئے آیا۔

اسے تو ہم نے خود اپنے لئے خدا سے مانگا ہے۔

حضور! مستقل نہیں، میں اسے سفیر بنا کر حضرت خواجہ شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی کے ہاں پانی پت میں بھیجنا چاہتا ہوں۔ بس چند دن کے بعد واپس آ جائے گا۔

حضور نے امیر خسرو کو بلایا۔ فرمایا۔ دیکھو! اگر آپ کے پانی پت میں جانے سے بادشاہ کا کوئی اٹکا ہوا کام ہوتا ہے تو یہ سفری تکلیف برداشت کر لیں، اللہ خیر کرے گا۔

امیر خسرو نے سر جھکا دیا۔ عرض کیا حضور! جیسے حکم فرمائیں بندہ بجا لانے کے لئے تیار ہے۔ حضرت خواجہ محبوب الٰہی نظام الدین اولیاء نے اجازت دے دی اور چلتے وقت امیر خسرو کو بہت کچھ نصیحت فرمائی کہ جس طرح عاشق الٰہی حضرت شرف الدین بو علی قلندر قدس سرہ فرمائیں اسی طرح

اپنی سعادت جان کر عمل کرنا اور کسی طرح روگردانی نہ کرنا اور دل و جان سے تسلیم کرنا۔

المختصر حضرت امیر خسرو دہلوی بادشاہ علاؤ الدین خلجی کی خواہش کے مطابق مع تحائف کے پانی پت پہنچے۔ خادموں نے امیر خسرو کے آنے کی اطلاع دی اور کہا کہ امیر خسرو دہلوی سلطان علاؤ الدین خلجی اور حضرت سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین قدس سرہ دہلوی کی طرف سے آپ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوا ہے۔

آپ نے آنے کی اجازت دے دی۔

حضرت صاحب امیر خسرو کی تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے۔ پوچھا خواجہ صاحب کا کیا حال ہے؟

الحمد للہ خیریت سے ہیں۔ سلام عرض کرتے تھے۔

فرمائیے کیسے آنا ہوا؟

شہنشاہ دہلی سلطان علاؤالدین خلجی نے یہ چند تحفے آپ کی خدمت میں نذر کئے ہیں اور استحکام حکومت کی دعا فرمانے کو عرض کیا ہے۔

فرمایا۔ خسرو یہ چیزیں میرے کس کام کی؟ مجھے تو اپنی پہچان نہیں ہے اور نہ دنیا کے دھندوں سے واقف ہوں۔ یہ چیزیں تو اس کے کام کی ہیں جو دنیا کے دھندوں میں پڑا ہوا ہے۔ یہ بادشاہ کو واپس کر دو یا خود ہی یہاں کے غرباءمیں بانٹ دو۔ رہی استحکام حکومت کی دعا، وہ (بادشاہ) لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے لوگ اس کے لئے دعائیں مانگیں گے۔

حضرت امیر خسرو نے یہاں تین دن تک قیام فرمایا۔ واپس آنے لگے تو ایک رقعہ بادشاہ کے نام اس عبارت کا دیا۔

باسمہ تعالیٰ

"علاؤ الدین خلجی فوطہ دار دہلی مکرر جانے کہ خدا تعالیٰ کے بندوں کے ساتھ زندگانی اچھی طرح گزارے۔"

حضرت امیر خسرو دہلی واپس پہنچے تو سب سے پہلے آپ اپنے پیرو مرشد حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیاء کی بارگاہ میں حاضر ہوئے۔ یہیں سے بادشاہ کو پیغام بھیجا کہ امیر خسرو تشریف لے آئے ہیں۔

یہ خبر سن کر بادشاہ کی بے قراری میں اضافہ ہو گیا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس کی سفارش کس قدر کامیاب ہوئی ہے۔

امیر خسرو جب بادشاہ کی جانب گیا تو اسے استقبال کرنے کے لئے سراپا منتظر پایا۔

امیر خسرو نے عاشق الٰہی حضرت شرف الدین بو علی قلندر پانی پتی کا رقعہ بادشاہ کی خدمت میں پیش فرمایا۔

بادشاہ کی خوشیوں میں اضافہ ہو گیا۔ اسے استحکام حکومت کی نوید مل گئی تھی۔ حکومت مضبوط بنانے کا راز مل گیا تھا کہ عوام کے مال و جان کی حفاظت کرو، عوام کے خادم بن کے رہو۔ چنانچہ تاریخ شاہد ہے کہ علاؤالدین خلجی نے ۲۰ سال تک بڑے کامیاب طریقے سے حکومت کی۔

اس نے پورے ملک میں اعلان کر دیا کہ کوئی شخص رات کو گھروں کو تالے نہ لگائے۔ اگر کسی کی چوری ہو گئی تو اس کا ازالہ شاہی خزانہ سے کیا جائے گا۔ یہ بھی کہا کہ اگر کسی نے ناپ تول میں کمی کی تو اس کا گوشت کاٹ کر چیز کا وزن پورا کیا جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ایک بنیا نے ایک شخص کو دال کم تول کے دی۔ گاہک نے قاضی کے ہاں جا کر شکایت کی۔ قاضی

آیا۔ بنئے کی ران سے گوشت کاٹا۔ جتنے وزن کی دال کم تھی ، اتنا گوشت ڈال دیا۔ بنیا بڑا چیخا چلایا کہ حضور میں دگنے وزن کی دال دینے کو تیار ہوں، مگر قاضی نے کہا نہیں اب نہیں۔ تم نے وزن میں کمی کیوں کی ہے ؟ اپ تو اس کمی کو گوشت ہی پورا کرے گا۔

حوالہ کے لئے ماہنامہ سلسبیل لاہور، مارچ ۱۹۷۰ء

امدادی کتب 'فیروز سنز اردو انسائیکلوپیڈیا' ---- تاریخ پاک و ہند

نور اسلام دسمبر ۱۹۹۴ء

شہنشاہ ہند کی پیدائش

☆ ولی کامل کی نگاہ لوح محفوظ کے فیصلوں کو پڑھ لیتی ہے۔

☆ اولیاء کو قطعاً" پسند نہیں ہے کہ بندوں کے آگے بندے سرنگوں ہوں۔

☆ اکبر اپنے ابتدائی دور میں اولیاء و صوفیاؒ کا معتقد تھا۔

☆ اکبر نے جہانگیر کو سلیم چشتی سے مانگ کر لیا۔

شیخ الہند حضرت شیخ سلیم چشتی رحمتہ اللہ علیہ آنجناب حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر رحمتہ اللہ علیہ کی اولاد میں سے تھے۔ آپ کے اباؤ اجداد اجودھن سے ترک سکونت کر کے لدھیانہ میں چلے آئے اور دہلی میں اقامت اختیار کی۔ ازاں بعد آپ کے والد ماجد حضرت بہاؤالدین رحمتہ اللہ علیہ دہلی کو چھوڑ کر فتح پور سیکری میں آگئے۔ آپ کی ولادت ۸۹۷ھ میں سکندر لودھی کے عہد میں ہوئی۔ ۹۷۱ھ میں آپ حج کے لئے تشریف لے گئے اس دوران آپ نے ممالک اسلامیہ عرب و عجم ، خراسان، عراق، بصرہ اور شام کی سیاحت کی۔ پھر عرب سے ہوتے ہوئے آپ ہندوستان میں واپس آئے اور فتح پور سیکری میں مستقل رہائش اختیار کی۔

۲۹ رمضان المبارک ۹۷۹ھ میں جلال الدین محمد اکبر کے عہد میں وفات پائی۔ آپ کا مزار شریف آپ کی اپنی ہی خانقاہ میں ہے ، جو مرجع خاص و عام

ہے۔ امراء حضرات کے علاوہ سلاطین بھی آپ کے عقیدت مند ہیں۔

جلال الدین محمد اکبر کی زندگی کے دو دور ہیں۔ ایک دور وہ جب کہ وہ اولیاء و صوفیاء کا عقیدت مند تھا، یہ دور اس کی زندگی کا ابتدائی دور ہے اور دوسرا دور اس کے کفر و الحاد کا دور ہے۔ ہم اس کے ابتدائی دور کی بات کر رہے ہیں۔

۹۵۱ ھ میں شاہ ایران طہماسپ صفوی اور ہمایوں کی ملاقات ہوئی۔ اس وقت ہمایوں جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا، شاہ ایران نے اس عظیم الشان مہمان کے شایان شان خاطر تواضع کی۔ ایک دن گفتگو کے دوران میں شاہ طہماسپ نے ہمایوں سے پوچھا۔

"آپ جیسے بادشاہ پر کمزور دشمن کے غالب آنے کا سبب کیا ہے؟"

ہمایوں نے کہا "بھائیوں میں نفاق۔"

شاہ ایران نے کہا "جو سلوک آپ نے اپنے بھائیوں سے کیا وہ مناسب نہ تھا۔" اس کے بعد دسترخوان بچھا دیا گیا۔ شاہ ایران کا بھائی بہرام مرزا بھی وہاں دست بستہ کھڑا تھا چنانچہ وہ آیا اور طشت لے کر شاہ کے ہاتھ دھلانے لگا۔ اس کے بعد وہ ملازمین کی طرح کام کرنے لگا۔ شاہ ایران نے ہمایوں سے کہا "بھائیوں کو اس طرح رکھنا چاہئے۔"

شاہ ایران نے اس بات سے گویا ہمایوں کی تربیت کی کہ اسے اپنے امراء و وزراء کو پیار سے بھی اور سختی سے بھی اعتماد میں لینا چاہئے۔ ------- ہمایوں نے تو اپنا وقت جیسے تیسے ہو سکا گزارا مگر اپنے بیٹے جلال الدین محمد اکبر کی تربیت ضرور ان خطوط پر کرنے کی کوشش کی کہ وہ رعایا کے ہر شخص کے لئے ہر دلعزیز بن سکے اور پھر مزید یہ کہ بیرم خان نے

جو کہ اکبر کا اتالیق تھا ہمایوں کے مرنے کے بعد اکبر کی تربیت میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کر دیں۔ ہمایوں جب مرا تو اکبر کی عمر اس وقت تیرہ چودہ سال کی تھی۔ ------ اس طرح تاریخ میں اکبر نے وہ مقام پایا کہ مؤرخین اسے اکبر اعظم کہنے پر مجبور ہو گئے۔ اور واقعتاً اکبر کا شمار ہندوستان کے ان شہنشاہوں میں ہوتا ہے، جو صدیوں کے وقت کو لمحوں میں سمیٹ لیتے ہیں اور ایسے ایسے کارنامے کر جاتے ہیں جن کے نقوش برس ہا برس تک صفحہ ہستی پر باقی رہتے ہیں۔

۱۴ فروری ۱۵۵۶ء کو اکبر کی تاجپوشی کلانور کے باغ میں کی گئی اور اکبر کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔ مگر اکبر نے سلطنت کے سیاہ سفید کا سارا انتظام بیرم خان کو دے دیا۔ اس نے ملکی مشکلات کو حل کرنے کے لئے خود کو وقف کر دیا اور ماحول پر پوری نظر رکھی ----- اکبر نے راجپوتوں کے خاندانوں میں شادیاں کیں۔ اس طرح ان کا داماد بن کے ان کے خاندانوں میں نہ صرف باعزت بن گیا بلکہ وہ خاندان بھی ان خاندانوں کے مخالف بن گئے، جو اکبر کے خلاف برسرپیکار رہے۔

اکبر شہنشاہ ہند ہونے کے ناطے سے بڑا خوش قسمت تھا۔ پورے ملک میں اس کا دبدبہ تھا۔ جس ریاست نے بھی بغاوت یا سرکشی کے لئے سر اٹھایا اکبر نے اسے کچل کے رکھ دیا۔ وہ جو چاہتا تھا اس کی خواہش کے عین مطابق ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی مرضی کے خلاف کچھ برداشت نہیں کرتا تھا۔ پورے ہندوستان میں اس کا سکہ چلتا تھا اور اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا۔

مگر ایک کام اس کی مرضی کے بالکل خلاف تھا۔ اس کی خواہش اور تمنا

کے خلاف تھا۔ اس کے ہاں اولاد نرینہ نہ تھی۔ ۲۷، ۲۸ سال کی عمر تھی
بچے ہوتے مگر مر جاتے تھے۔ اکبر ابھی تک لا ولد تھا۔ جونہی اسے خیال آتا کہ
اس کے تخت کا وارث کوئی نہیں ہے تو وہ سہم کے رہ جاتا۔ یہ ایک غم تھا
جو اس کی جان کو مستقل طور پر لگ چکا تھا۔ اور اسے اندر ہی اندر کھائے جا
رہا تھا۔ وید، جوتشی اور شاہی طبیب اس کے علاج میں اپنے سارے نسخے آزما
چکے تھے۔

اکبر ابتدائی دور میں پختہ سنی العقیدہ مسلمان تھا۔ اس کی ماں حمیدہ بانو
مشہور صوفی اور شاعر شیخ احمد خان ژندہ پیل کی اولاد میں سے تھی۔ اکبر اس
قدر پختہ عقیدہ رکھتا تھا کہ سنی عقیدہ کے مخالفین کو برداشت نہ کرتا تھا۔
اولیاء اور صوفیاء سے اسے خاص رغبت تھی۔ اجمیر شریف میں حضرت خواجہ
معین الدین چشتی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار شریف پر کئی بار پا پیادہ گیا تھا۔
سالانہ حاضری اس کا معمول بن چکی تھی۔ حضرت بابا فرید الدین مسعود گنج شکر
کے مزار اقدس پر پاک پتن میں حاضری اور سلامی دی۔ اس کے علاوہ اجمیر
شریف میں سید حسین جنگ سوار اور ہانسی میں حضرت قطب جمال کے
مزارات پر جا کر فاتحہ خوانی کرنے کا شرف بھی اسے حاصل ہوا وہ ان
مزارات میں جا کر گھنٹوں مراقبے میں بیٹھا رہتا۔ قوالی سنتا اور قوالوں پر
اشرفیاں نچھاور کرتا، وہ جو کچھ ان آستانوں پر دعا کرتا اسے اس سے بھی زیادہ
ملتا مگر اولاد کی خواہش یہاں بھی پوری نہ ہوئی۔ اس کی مایوسیوں میں اضافہ
ہی ہوتا چلا گیا۔

انہی دنوں فتح پور سیکری میں ایک ولی کامل کا بڑا شہرہ تھا۔ شیر شاہ سوری
اور سلیم شاہ سوری آپ کے بڑے معتقد تھے۔ اور نہایت خلوص و محبت اور

تعظیم و تکریم سے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ حضرت شیخ محمد
بخاری اور حکیم عین الملک نے شیخ موصوف کے اوصاف اکبر سے بیان کئے
اسے بھی آپ سے عقیدت ہو گئی۔

۹۷۱ھ میں حضرت چشتی حج کر کے دوبارہ ہندوستان میں تشریف لائے اور
آگرہ کے قریب ۱۲ کوس پر سیکری نامی گاؤں میں آپ نے رہنا شروع کر دیا۔
جلال الدین اکبر کا آگرہ میں اور اجمیر شریف میں آنا جانا تھا۔ اولاد کی خواہش
اسے کشاں کشاں ایک دن حضرت سلیم چشتی کی بارگاہ میں لے آئی۔ مگر
شہنشاہ ہند کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک عام آدمی کی حیثیت سے۔ لوگوں نے
شور مچایا کہ حضرت جی اکبر آیا ہے۔ آپ نے فرمایا آنے دو۔ اس کی تعظیم
کرنے کی ضرورت نہیں اسے جہاں جگہ ملے وہیں بیٹھنے دو۔ اکبر آیا تو
قربت میں بیٹھنے کی تمنا کا اظہار کیا۔ حضرت نے اس کی اس خواہش کو پورا
فرمایا۔ اکبر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ عاجزی اور انکساری
اس کے چہرے سے ٹپک رہی تھی۔ اور جلال الدین اکبر کا جلال شاہی بالکل
کافور تھا۔ اکبر بیٹھ گیا اور دیر تک بیٹھا رہا۔

پھر آپ نے پوچھا "کہیے اکبر کیسے آنا ہوا غریب کی کٹیا میں؟ یہاں تو کوئی
ڈھب کی چیز بھی نہیں ہے۔ میں آپ کے کس کام آ سکتا ہوں۔"

اکبر رونے لگ گیا۔ سر قدموں میں رکھ دیا اور گڑگڑاتے ہوئے عرض
کرنے لگا۔ "حضرت جی اولاد کا غم مجھے کھوکھلا کئے جا رہا ہے لا ولد ہوں۔ دعا
کیجئے ہندوستان کے تخت کا وارث مل جائے۔"

حضرت جی نے اکبر کا سر اپنے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور فرمایا
اکبر بندے بندوں کے آگے یوں سر نہیں جھکایا کرتے۔ سنبھل کر بیٹھو۔"

اکبر قدرے جم کے بیٹھا مگر اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

حضرت صاحب نے آسمان کی طرف دیکھا اور کافی دیر تک دیکھتے رہے۔

فرمایا "اکبر آپ کی قسمت میں کوئی بیٹا نہیں ہے۔"

اکبر کی تو چیخ نکل گئی۔

"نہ حضرت جی ایسا نہ فرمائیے۔ مجھے اتنا مایوس کر کے نہ لوٹائیں۔"

اکبر نے پھر اپنا سر آپ کے گھٹنوں پر رکھ دیا اور گڑگڑانے لگا۔

حضرت نے اکبر کا سر اوپر کیا اور آسمان کی جانب پھر دیکھنے لگے۔

"اکبر! نہیں آپ کی قسمت میں مجھے کوئی بیٹا نظر نہیں آتا۔"

"حضرت جی! آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے۔ اگر میری قسمت میں کوئی بیٹا ہوتا تو میری گود یقیناً ہری ہو چکی ہوتی میں تو آپ کے پاس اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ مجھے خالی نہ لوٹائیں۔"

اب کے تیسری بار حضرت صاحب نے آسمان کو دیکھنا شروع کیا اور پھر جواب دے دیا۔

"حضرت جی! میں دھرنا مار کر بیٹھا ہوں خالی ہاتھ نہیں جاؤں گا،

اب کے آپ نے مراقبے میں سر رکھا اور دیر تک مراقبے میں رہے۔ آپ نے سر اٹھایا تو چہرہ کھلا ہوا تھا۔ مسکراہٹوں کی بے شمار لہریں چہرے پر جلوہ گر تھیں۔

پھر تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد فرمایا۔

"اے اکبر! کل اپنی بیگم کو میری بیوی کے پاس بھیج دینا۔"

اکبر اپنے حرم میں واپس آ گیا مگر تذبذب میں رہا۔ میں اپنی بیگم کو کاہے کو حضرت صاحب کی خدمت میں لے کر جاؤں۔ کیا آپ اس کا علاج

کریں گے مگر کس کا علاج؟ کیا میرے حرم میں میری ساری بیویاں بیمار ہیں یا میں بذات خود بیمار ہوں؟ میرے بیمار ہونے کی صورت میں بیگم کے علاج کا کیا فائدہ ——— پھر اس کا ذہن اس طرف بھی جاتا کہ چونکہ حضرت صاحب نے فرمایا ہے ضرور کوئی حکمت ہو گی۔ اور اس کا یہ خیال یقین کی حدوں کو چھو لیتا کہ اس کے ہاں اب ضرور کوئی بیٹا ہو گا۔ جو اس کے تخت کا وارث بنے گا جو میری طرح شہنشاہ ہند کہلائے گا۔ مگر پھر ایک بالکل نئے خیال نے اس کے ذہن میں جنم لیا کہ وہ لڑکا جو اس کے ہاں پیدا ہو گا وہ کس بیگم کے بطن سے پیدا ہو گا۔

وہ چاہتا تھا کہ اس کا یہ بیٹا ایک ذہین ماں کا بیٹا ہو تاکہ وہ بھی ذہین بنے۔ ایک خوبصورت ماں اسے جنے تاکہ وہ بھی خوبصورت ہو۔ ایک بہادر ماں اسے دودھ پلائے تاکہ وہ اپنے دادا ہمایوں اور پڑدادا بابر کے نقش قدم پر چل سکے۔ ——— اور وہ کسی دل جیتنے والی ماں کا سپوت ہو تاکہ وہ پورے ہندوستان کا ہر دلعزیز بن سکے۔

اس کے حرم میں کتنی عورتوں کو اکبر کی بیوی ہونے کا شرف حاصل تھا؟ تاریخ اس معاملے میں خاموش ہے تاہم اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ وہ متعدد بیویوں اور کنیزوں کی آنکھوں کا تارا تھا ——— اتنی بڑی تعداد میں سے اپنے بیٹے کی ماں کا انتخاب کرنا اس کے لئے بڑا مشکل تھا۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی ——— اس نے ایک خادمہ کے ہاتھ ساری عورتوں کو کہلا بھیجا کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر زرق برق لباس پہن کر اور زیور لگا کر تیار ہو کر میرے پاس آئیں۔

جونہی یہ پیغام بیگمات کے گوش گزار ہوا سب حیران ہو گئیں۔ آج یہ

انوکھا پیغام واقعتاً حیران ہی کرنے والا تھا۔ اس سے پہلے ایسا پیغام سب کے لئے کبھی نہ آیا تھا بلکہ کسی ایک ملکہ کے مقدر کا حصہ ایسا پیغام ضرور بنا کرتا تھا۔ مگر آج سب کی قسمت کا ستارا کیسے چمکنے لگا۔ بوڑھی کھونسٹ عورتوں نے اس پیغام کو کوئی اہمیت نہ دی۔ کیونکہ مدتوں سے انہیں بادشاہ کی خواب گاہ میں طلب نہیں کیا جاتا تھا۔ ----- بادشاہ کی ایسی ہی ایک بیوی نے اس خادمہ سے پوچھا کہ۔

"کیا ہم اس پیغام سے مستثنیٰ ہیں۔؟"

خادمہ مسکرا دی اور پھر قدرے شرم سے عرض کیا۔

"شہنشاہ معظم نے اپنے پیغام میں کوئی امتیاز نہیں فرمایا۔ پیغام سب کے لئے ہے۔"

بہرحال پیغام کو سر آنکھوں پر رکھا گیا اور ہر بیگم نے واتن ، سرمہ اور غازے کو اولیت دی اور اس کے بعد زرق برق لباس زیب تن کئے اور زیورات کو سجانے میں جتنی جلدی وہ کر سکتی تھیں، کی۔

وقت معینہ سے پہلے ہی ساری بیگمات اور کنیزیں بن سنور کر بادشاہ کے روبرو آن کھڑی ہوئیں۔

اکبر ہر ایک چہرہ بڑی توجہ سے دیکھتے چلا جا رہا تھا۔ انہیں قطاروں میں خاندیش کے حاکم مبارک شاہ کی بیٹی آنکھوں میں حیا لئے کھڑی تھی۔

بیکانیر کے راجہ رائے کلیاں کی خوبصورت بیٹی بھی سر جھکائے کھڑی تھی۔

گونڈ دانہ کی رانی درگاوتی کی بہن کملاوتی ماتھے پر قشقہ لگائے کھڑی تھی۔

راجہ بھاڑا مل کی بیٹی مریم زمانی بیگم ایک پر جلال چہرہ لئے کھڑی تھی۔

جیسلمیر کے راجہ کی نوجوان بیٹی بھی اکبر کی نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔

میواڑ کے راجہ کی بیٹی بھی انہیں قطاروں میں گردن اٹھائے کھڑی تھی۔

----- اور

دائیں قطار کے آخری کونے پر خدیجۃ الزمانی سلیمہ سلطان بیگم اپنے بڑھاپے کا حسن لئے شرما رہی تھی۔

اکبر ایک ایک رانی کے پاس گیا، ہر ایک کے چہرے کے خدوخال دیکھے اور دیکھتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک وہ ایک رانی کے پاس کھڑا ہو گیا۔ اسے سر سے لے کر پاؤں تک دیکھا اور جی بھر کے دیکھا۔ ایسے لگ رہا تھا کہ وہ اسے دوبارہ پسند کر کے زوجیت میں لینا چاہتا ہے ----- یہ رانی مریم زمانی تھی، جو راجہ بھاڑا مل کی بیٹی، مان سنگھ کی پھوپھی اور راجہ بھگوان داس کی بہن تھی۔ ۹۷۱ھ میں اکبر نے اس سے شادی کی تھی۔

اکبر نے اس کے آگے سر جھکا دیا۔

رانی کو اس پر رشک آنے لگا۔

اکبر نے کہا۔ "مریم زمانی بیگم! کل صبح اسی طرح تیار ہو کے تم میرے ساتھ چلو گی"

"شہنشاہ معظم! آپ کی یہ کنیز حکم بجا لانے میں کوئی دیر نہیں کرے گی۔ ----- مگر میرے آقا کہاں جانے کا ارادہ ہے۔"

"تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ----- جو کچھ میں نے کہا ہے اس کی فکر کرو"

دوسرے دن جب بادشاہ کی بیگم فتح پور سیکری میں آئی اور حضرت سلیم چشتی کی بارگاہ میں شرف باریابی پایا۔ تو آپ نے اسے ایک چٹائی پر بیٹھنے کو کہا ــــــ قالینوں اور غالیچوں پر چلنے، بیٹھنے والی رانی نے گھاس پھوس کی چٹائی پر بیٹھنے میں کچھ ہچکچاہٹ محسوس کی ـــــ چونکہ ایک طرف بادشاہ کا حکم تھا اور دوسری طرف خواجہ سلیم چشتی کا ارشاد۔ اس لئے بیٹھ گئی۔

اب حضرت صاحب نے اپنی بیوی کو اندر سے آواز دی۔ وہ تشریف لائیں تو آپ نے بادشاہ زادی کی پشت کے ساتھ پشت لگا کر بیٹھنے کو کہا۔ ــــــ اب حضرت صاحب نے اپنی چادر دونوں مستورات پر ڈال دی۔ پھر اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ اپنا ہونے والا فرزند رانی کو دے دو ــــــ اس کے بعد اہلیہ محترمہ اندر چلی گئیں اور ملکہ بادشاہ کے ہمراہ اپنے محلوں میں واپس چلی گئی۔

چند دنوں کے بعد اس ملکہ کے حمل قرار پایا اور مقررہ مدت کے بعد فتح پور سیکری میں ہی اس کے ہاں ایک چاند سا بچہ پیدا ہوا۔ ـــــ حضرت سلیم چشتی کو اطلاع دی گئی آپ نے اس بچے کا نام اپنے نام کی مناسبت سے شہزادہ سلیم رکھا ـــــ اکبر اسے شیخو بابا کہا کرتا تھا ـــــ یہی شیخو بابا اکبر کی وفات کے بعد جہانگیر کے لقب سے ہندوستان کے تخت پر بیٹھا۔

شہزادہ سلیم کی پیدائش پر اکبر نے حضرت سلیم چشتی کے خادموں اور مستحق لوگوں کو مٹھیاں بھر بھر کر اشرفیاں تقسیم کیں ـــــ اکبر نے فتح پور سیکری میں ایک بلند دروازہ تعمیر کروایا۔جو سڑک کی سطح سے ۱۷۶ فٹ بلند ہے اور برصغیر پاک و ہند میں سب سے بلند دروازہ ہے۔ اس میں چینی پچی کاری کے نقش و نگار اور قرآنی آیات کندہ ہیں۔

حضرت سلیم چشتی رحمۃ اللہ علیہ کا مقبرہ خالص سنگ مرمر سے تعمیر کروایا۔ اس کے ستون اور بریکٹ نفاست اور کاریگری کے لحاظ سے بے نظیر ہیں۔

اسی قصبہ میں اکبر نے اپنی بیوی سلیمہ سلطان بیگم کا محل بنوایا۔ جو سنگ سرخ پر مینا کاری کا ایک لاثانی نمونہ ہے۔ ـــــ اکبر نے جس وقت اپنی سلطنت کی زمین کی پیمائش کر کے مربعوں اور ایکڑوں میں حد بندی کرنے کا پروگرام بنایا تو اس کے لئے یہ بات ایک معمہ بن گئی کہ وہ اس کام کا آغاز کہاں سے کرے؟ آخر فتح پور سیکری سے اس کی یہی محبت اور عقیدت غالب آئی اور اس کام کا نقطہ آغاز فتح پور سیکری کو بنایا۔

حوالہ کے لئے دیگر امدادی کتب

چشتی خانقاہیں اور سربراہان برصغیر — از میاں محمد دین کلیم

تاریخ فرشتہ — از محمد قاسم فرشتہ

دربار اکبری — از محمد حسین آزاد

عہد مغلیہ مع دستاویزات — از صفدر حیات صفدر

ماہنامہ نور اسلامؒ اکتوبر ۱۹۹۰ء شرق پور شریف

اسلامی ڈائجسٹ

نئی دہلی (بھارت) اپریل ۱۹۹۶ء

”نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں“

☆ مرد کامل کی بارگاہ میں حاضری سے رسوائیاں خوش بختی میں بدل جاتی ہیں۔

☆ علامہ اقبال کی زندگی کا ایک روشن پہلو۔

☆ مرد کامل بعض اوقات اشتیاق میں شدت پیدا کرنے کے لئے ملاقات سے انکار کر دیتا ہے۔

☆ علامہ اقبال مرد قلندر کی بارگاہ میں آنے کے بعد مرد قلندر بنا۔

ایسے لگتا ہے جو بات فضائے عالم میں کر دی جائے وہ ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہو کر دور دور کے لوگوں کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے، لوگوں کے کان اسے محفوظ بھی رکھتے ہیں اور اس کے اثرات دیکھنے کے منتظر بھی رہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ لوگ اپنی اپنی قیاس آرائیوں کی بناء پر مختلف مطلب بھی اخذ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ ایسی آواز سے خائف رہتے ہیں اور بات کرتے وقت بڑی احتیاط بھی کرتے ہیں۔

یہ اپریل ۱۹۱۱ء کی بات ہے انجمن حمایت اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ ہو رہا تھا۔ کہ ایک تیس پینتیس سالہ نوجوان سٹیج پر ٹہلتے ٹہلتے بڑی خوش الحانی کے ساتھ ایک نظم سنا رہا تھا۔ پنڈال میں حد نگاہ تک لوگ ہی لوگ تھے۔ پورے مجمع پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ کیا مجال کہ سوئی گرے اور اس کی آواز سنائی

نہ دے۔ لوگوں پر ایک محویت کا عالم تھا وہ ایک ایک شعر پر جھوم رہے تھے اور سبحان اللہ، سبحان اللہ کی آوازیں کہیں کہیں سنائی دے رہی تھیں۔

پانچ چھ شعر پڑھنے کے بعد شاعر نے ذرا مسکرا کے کہا۔

اے خدا! شکوہ ارباب وفا بھی سن لے
خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

لوگوں نے کان کھڑے کئے کہ وہ بھی تو وہ شکوہ سنیں جو اقبال خدائے اعلیٰ و برتر کو سنانا چاہتا ہے۔ شاعر نے قبل از اسلام کا منظر پیش کیا۔ پھر اشاعت اسلام کی بات کی۔ اور عروج اسلام کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

صفحہ دہر سے باطل کو مٹایا ہم نے
نوع انسان کو غلامی سے چھڑایا ہم نے

تیرے کعبے کو جبینوں سے بسایا ہم نے
تیرے قرآن کو سینوں سے لگایا ہم نے

پھر بھی یہ گلا ہے کہ ہم وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں، تو بھی تو دلدار نہیں

بس پھر شکوہ و شکایت شروع ہو گئی، اقبال بے باکی سے کہنے لگا۔

خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

قہر تو یہ ہے کہ کافر کو ملیں حور و قصور
اور بیچارے مسلماں کو فقط وعدہ حور

کبھی ہم سے، کبھی غیروں سے شناسائی ہے

بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے

پھر یہ آزردگی غیر سبب کیا معنی

اپنے شیدائیوں پہ یہ چشم غضب کیا معنی

اب لوگوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ بعض لوگوں نے ان اشعار کو پسند نہیں کیا ـــ جلسہ ختم ہو گیا۔ مگر لوگ منڈلیوں میں کھڑے ہو کر انہی اشعار کو زیر بحث لاتے رہے۔ پھر جلسے کے ایک دو دن بعد جمعہ تھا۔ خطیب منبر نے بھی ان ہی اشعار کا تذکرہ کیا، خوب کھل کر تنقید کی، لفظ و معانی کی بخیہ دری کی اور تان اس پر توڑی کہ یہ اشعار نہایت گستاخانہ ہیں۔ خدا کی ذات کے بارے میں ایسی گستاخی کرنے والا دائرہ اسلام سے خارج ہے اور اگلے لمحے علامہ اقبال پر کفر کا فتوی داغ دیا گیا۔ یہ فتوٰی لوگوں کی زبان پر آیا اور اخبارات میں بھی شاہ سرخیوں کے ساتھ چھپ گیا۔

علامہ اقبال کے ہمنواؤں اور مخالفین میں خوب لے دے ہوئی۔ مخالفین نے علامہ اقبال کو دائرہ کفر میں پھانسنے پر خوب اصرار کیا اور موافقین نے انہیں اس دائرے سے نکالنے کی کوشش کی۔

علامہ اقبال نے جب اس فتوے کو دیکھا اور مخالفین کی باتیں سنیں تو پسیج کر رہ گئے۔ انہوں نے بڑا کہا کہ اشعار سے جو مطلب آپ لوگوں نے نکالا ہے وہ درست نہیں ہے۔ لہذا کفر کا فتوٰی بھی مناسب نہیں۔ مگر ایک لہر تھی جس میں پڑھے لکھے لوگ بھی بہے جا رہے تھے۔

تقریباً" ایک سال کے بعد ۱۹۱۲ء میں موچی دروازہ میں ایک جلسہ عام میں حضرت علامہ اقبال نے اپنی ایک دوسری نظم اسی بحر اور زمین میں پیش کی یہ نظم اس پہلی نظم کا جواب تھی۔ وہ شکوہ تھا یہ جواب شکوہ۔ وہ ایک

سوال تھا یہ اس کا جواب تھا۔ شاعر نے اس نظم میں ایک ایک جزو کا جواب دینے کی کوشش کی تھی یہ نظم سن کر بھی لوگ خوب جھومے تھے۔ واہ واہ کے ڈونگرے برسائے تھے۔ اکثر لوگوں کی اس نظم سے تسلی ہو گئی۔ اب ایک معترض کے سامنے تین چار آدمی جواب دینے کے لئے تیار ہو جاتے تھے۔ مگر محراب و منبر کے امین حضرات نے علامہ اقبال کو معاف نہ کیا اور نہ ہی ان پر لگایا گیا فتوٰی واپس لیا۔

اس طرح ۱۹۲۶ء میں جب علامہ اقبال نے صوبائی مجلس قانون ساز کے انتخابات کے لئے اپنی انتخابی مہم کا آغاز کیا تو انہیں اپنے انتخابی جلسوں میں لوگوں کی جو باتیں سننا پڑیں، انہوں نے علامہ اقبال کو بے حد پریشان کر دیا۔ مثلاً" موچی دروازہ میں ایک انتخابی جلسہ میں جب علامہ اقبال تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوئے تو لوگوں نے ان کی تقریر سننے سے انکار کر دیا ایک طرف سے آواز آئی علامہ اقبال اپنے عقیدے کا اظہار کریں، دوسری طرف سے ایک شخص بولا اپنے مذہب کی وضاحت کیجئے، تیسری طرف سے آواز آئی یہ سیٹ مسلمانوں کے لئے ہے کافر کے لئے نہیں۔

علامہ اقبال کا رنگ متغیر ہو گیا، ان کی آواز بھرا گئی، آج وہ اپنے دلائل کھل کر نہ دے سکے جلسے کا رنگ پھیکا رہ گیا۔ علامہ اقبال کو اپنے اکثر انتخابی جلسوں میں ایسے ہی حالات کا سامنا رہتا۔ تاہم خدا کو ان کی کامیابی منظور تھی۔ ۲۳ نومبر ۱۹۲۶ء انتخاب کا دن تھا۔ انہوں نے واضح اکثریت حاصل کی وہ کامیاب ہوئے مگر کفر کا فتوٰی جوں کا توں قائم تھا چودہ پندرہ سال گزر جانے کے باوجود ہوا نے اس فتوٰی کو محفوظ رکھا تھا علامہ اقبال کو ایک گھن لگ گیا تھا وہ اندر ہی اندر سے کھائے جا رہا تھا اور انہیں اکثر پریشان

رہتے تھے۔

علامہ اقبال کے ہاں شعرو سخن کی ایک محفل تقریباً" روزانہ منعقد ہوتی تھی۔ اس محفل میں پڑھے لکھے لوگوں کے علاوہ بعض ان پڑھ قسم کے لوگ بھی اپنا شوق لے کر حاضر ہوا کرتے تھے' ایسے لوگوں میں شیخوپورہ سے حاجی معراج دین (جو اس وقت حاجی نہیں تھے) اپنے چھ دوستوں کے ساتھ اپنی سائیکلوں پر آتے اور اس محفل میں آکر لطف اٹھاتے تھے۔

(حاجی معراج دین ابھی تک بقید حیات ہیں۔ اور [illegible] سال کی عمر کے باوجود صحت مند ہیں، ان کا جسم بڑا مضبوط ہے، ابھی تک وہ سیدھی کمر رکھ کے چلتے ہیں، ذرا خم نہیں آیا۔ جنڈیالہ روڈ شیخوپورہ میں ان کی رہائش ہے۔)

ایک دن علامہ اقبال نے ان نوجوانوں سے پوچھا کہ بیٹا! تم کہاں سے آتے ہو، تم بس ہماری ہی باتوں کو سنتے رہتے ہو اپنی بات تم نے کبھی نہیں سنائی؟

ہمیں بس آپ کے شعر سننے کا شوق ہے، ہم سائیکلوں پر شیخوپورہ سے آتے ہیں اور سائیکلوں پر ہی واپس چلے جاتے ہیں۔ ایک نوجوان نے کہا۔

آپ شیخوپورہ سے آتے ہیں؟ اس شیخوپورہ سے جسے شہزادہ سلیم (شیخوبابا) نے آباد کیا اور جس کے قریب ہرن منار بھی ہے؟علامہ اقبال نے فرمایا۔

جی! جی! بالکل وہی شیخوپورہ۔ نوجوان نے جواب میں عرض کیا۔

اگر میں آپ کے پاس آؤں تو تم میری کیا مدد کرو گے؟ اقبال نے کہا۔

ہم دل و جان آپ پر نچھاور کر دیں گے۔

دیکھو نوجوانو! میں یہاں شہری آبادی سے بے حد پریشان ہوں۔ چاہتا ہوں کہ کسی ویرانے میں جا کر چند دن گزاروں، دن رات روتا رہوں۔

نہیں میاں جی!ہم آپ کو رونے نہیں دیں گے۔ آپ کی خوب سیوا خدمت کریں گے، آپ ہمیں اپنے عمدہ عمدہ شعر سنائیں گے نا۔ ایک نوجوان نے کہا۔

ضرور سناؤں گا۔

دن تاریخ طے ہو گیا اور علامہ اقبال مقررہ تاریخ پر بذریعہ ٹرین شیخوپورہ میں پہنچے۔ یہ ساتوں نوجوان ان کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ انہوں نے علامہ صاحب کو ایک تانگے میں بٹھالیا اور کھانے کا سامان بھی رکھ لیا۔ پھر ان کی خواہش کے مطابق انہیں ہرن مینار تک لے گئے۔

تالاب کے اندر والی عمارت کی آخری منزل پر علامہ اقبال نے پانچ دن قیام فرمایا۔ آپ نے یہ پانچوں دن سجدہ ریزی اور رونے میں گزارے۔ پانچویں دن علامہ صاحب نے ان نوجوانوں کا شکریہ ادا کرنے کے لئے اپنے پاس بلایا اور فرمایا۔

نوجوانو! آپ نے میری بڑی خدمت کی ہے، آپ کا بڑا بڑا شکریہ، اب میں پھر واپس اپنی پریشانیوں کے دیس میں جانا چاہتا ہوں۔

میاں جی آپ تو بڑے خوشحال ہیں۔ پریشانیاں آپ کو کیسے لاحق ہو گئیں؟

ہاں بیٹا! میں سخت پریشان ہوں اور شاید مرنے تک پریشان رہوں۔

آخر آپ پریشان کیوں ہیں؟ آپ تو پڑھے لکھے ہیں، آپ جیسے لوگ تو دوسروں کی پریشانیاں دور کیا کرتے ہیں۔

ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ مگر پریشانیاں جن لوگوں کا مقدر بن جائیں ان
کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔

میاں جی! آخر آپ کو پریشانی ہے کیا؟ اپنی پریشانی کا اظہار تو کریں۔ ہم
سات نوجوان یقیناً" آپ کی پریشانی کا بوجھ ہلکا کر دیں گے۔ آپ کی پریشانی ہم
آپس میں بانٹ لیں گے۔

پیارے نوجوانو! پریشانی کسی سے بانٹی جانے والی نہیں ہے۔

میاں جی کچھ بتائیں تو سہی۔

دیکھو نوجوانو! میں جب دوسرے لوگوں سے اپنا مقابلہ کرتا ہوں تو اکثر کی
نسبت اپنے میں کم برائیاں پاتا ہوں۔ جس کی بنا پر اپنے آپ کو ان لوگوں
سے بہتر سمجھتا ہوں۔ مگر جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اچھے برے لوگوں میں
امتیاز کرنے کی صلاحیت دی ہے انہوں نے مجھے کافر کہہ دیا ہے۔

کافر کہہ دیا ہے؟ کیوں۔ کس لئے نہیں نہیں میاں جی آپ کافر کیسے بن
گئے۔ کس نے آپ کو کافر کہا، کب کہا؟

جنہیں اللہ نے دین کی سمجھ دی ہے انہوں نے آج سے چودہ پندرہ سال
پہلے مجھ پر کفر کا فتوٰی لگا دیا ہے اور وہ کفر کا فتوٰی اب تک قائم ہے۔ اسی
بات نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ سوچتا ہوں۔ میرے پاس تو پوری دنیا کے
مسلمانوں کو بیدار کرنے کا پروگرام ہے۔ چاہتا ہوں ان میں اتحاد پیدا ہو، انہیں
ان کی منزل دکھاؤں، ان کے سفر کی سمت متعین کروں۔

اگر میں کافر رہا تو مجھ کافر کی باتوں پر کون یقین کرے گا۔ میں مر گیا تو
مجھے کس قبرستان میں دفن کیا جائے گا۔ مسلمانوں کے قبرستان میں یا کافروں
کے قبرستان میں؟ یہی پریشانیاں مجھے اندر سے کھائے جا رہی ہیں۔

میاں جی! آپ ایسا کریں، شرق پور شریف میں جائیں۔ وہاں ایک ولی
اللہ ہے، میاں شیر محمد صاحب ان کا نام ہے۔ مرد کامل ہیں۔ جو بات فرما دیں
اللہ اسے پوری کر دیتا ہے۔

ہاں میں نے ان کا نام سن رکھا ہے۔ واقعتاً" وہ ایسے ہی بزرگ ہیں مگر
ان کی خدمت میں جانے کا مجھے شرف حاصل نہیں ہوا۔ میں انشاء اللہ ضرور
ان کی خدمت میں حاضری دوں گا۔ (یہ ۱۹۲۷ء کی بات ہے۔)

علامہ اقبال گھر گئے۔ دوست احباب ملنے کے لئے آئے ان میں آپ
کے بڑے گہرے دوست سر محمد شفیع بھی تھے۔

سر محمد شفیع اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری کے خالہ زاد
بھائی تھے۔ انہیں آپ (علامہ اقبال) تخلئے میں لے گئے۔ فرمایا۔ میاں
صاحب! آپ کے بھائی حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری شرق پور
شریف میں رہتے ہیں، ان کے ہاں جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ ملنے کی اجازت
لے دیں تو زہے قسمت۔

سر محمد شفیع وقت نکال کر ایک دن حضرت میاں صاحب کی خدمت میں
حاضر ہوئے۔ عرض کیا کہ ان کے دوست علامہ اقبال آپ کی خدمت میں
قدم بوسی کا شرف چاہتے ہیں اگر اجازت مل جائے تو میں انہیں کسی وقت
لے آؤں۔

وہ بھی آپ کی طرح بے ریش ہوں گے۔ آپ نے میری رشتہ داری
سے کیا اثر قبول کیا ہے کہ آپ کے دوست یہاں آکر میری بات مانیں گے؟
نہ لائیں انہیں یہاں میرے پاس۔

جب سر محمد شفیع صاحب لاہور چلے گئے اور علامہ اقبال سے ملاقات

ہوئی تو علامہ صاحب نے ملاقات کی اجازت کے بارے میں دریافت کیا۔

سر محمد شفیع نے انہیں بتایا کہ یہ اجازت نہیں مل سکی۔ علامہ صاحب اسی وقت رونے لگ گئے۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی عرض کیا۔

دیکھو میرے دوست گنہگار کدھر جائیں آپ ان کے بھائی ہیں کوئی رشتہ داری کا حق جتائیں، کوئی منت سماجت کریں، کوئی واسطہ دیں، مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو ناکام واپس نہیں لوٹائیں گے۔

سر محمد شفیع ہفتے عشرے کے بعد دوبارہ حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور علامہ اقبال کی بے قراری کا ذکر کیا بڑی لجاجت اور انکساری سے ان کے لئے آپ سے پھر اجازت مانگی۔

آپ نے تھوڑی دیر مراقبہ فرمایا پھر کہا اچھا لے آؤ۔

سر محمد شفیع کا چہرہ کھل گیا مسرت کھیلنے لگی وہ خوشی خوشی سیدھے علامہ صاحب کے ہاں پہنچے اور ملاقات کی اجازت کی نوید سنائی۔

علامہ اقبال کا سریکدم جھک گیا ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ہاں ہاں یہ خوشی کے آنسو تھے۔ وہ تو اسی وقت حضرت صاحب کی خدمت میں آنا چاہتے تھے مگر سر محمد شفیع کی مصروفیات نے دو تین دن کی مزید تاخیر کر دی۔

بہرحال ایک دن کوئی دس بجے کے قریب یہ دونوں حضرات شرق پور شریف میں تشریف لائے، علامہ اقبال کو ملکانہ گیٹ میں ملکاں والے ڈیرے میں کھڑا کیا گیا اور خود سر محمد شفیع اعلیٰ حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ علامہ اقبال صاحب آ گئے ہیں اگر اجازت ہو تو خدمت میں حاضر ہوں۔

آپ نے فرمایا۔ ہاں ٹھیک ہے آ جائیں۔

سر محمد شفیع علامہ صاحب کو لینے کے لئے چلے گئے اور آپ اوپر والی بیٹھک میں تشریف لے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ دونوں حضرات (سر محمد شفیع اور علامہ اقبال) بیٹھک میں آ کر بیٹھ گئے۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ حضرت صاحب کے نیچے اترنے کی آواز آئی یہ دونوں بے ساختہ دو زانوں ہو کر بیٹھ گئے۔ حضرت صاحب تشریف لائے تو دونوں تعظیماً" کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے سر جھک گئے دونوں نے چپ سادھ لی۔

سر محمد شفیع کو اپنی حالت پہ قابو رہا مگر علامہ اقبال کی رقت بے قابو ہو گئی۔ ان کی آنکھوں نے ساون بھادوں کی جھڑی لگا دی۔

حضرت صاحب نے سر محمد شفیع سمیت سب لوگوں کو باہر نکال دیا۔ اقبال کے کاندھے پر پیار سے ہاتھ رکھا اقبال کو سکون مل گیا۔ عرض کیا حضور! گناہوں سے نفرت بجا ہے گنہگاروں سے ناروا۔ ہم لوگ تو پہلے ہی مایوسیوں کا شکار ہوتے ہیں اگر آپ بھی ٹھکرا دیں تو کدھر جائیں۔

حضرت صاحب نے بازو کھینچ کر اپنے قریب کر لیا۔

ہاں آپ ٹھیک کہتے ہیں گنہگار سے نفرت نہیں کرنی چاہئے۔ کہئے کیسے آنا ہوا ہم فقیروں کے پاس؟

اقبال کی آنکھیں پھر ڈبڈبا گئیں۔ رندھی ہوئی آواز میں عرض کیا کافر بنا

دیا گیا ہوں۔ مسلمانوں کے زمرے میں داخل فرما دیجئے۔

اقبال! خدا کی رحمت رونے والوں کو بے حد پسند کرتی ہے۔ گھبرائیں نہیں آپ مسلمان ہیں، مسلمان ہی رہیں گے۔ آپ کو کافر کہنے والے تمہارا نام عزت سے لیں گے، منبروں پر تمہارے اشعار پڑھیں گے، تمہارے جن شعروں کی وجہ سے تم پر فتویٰ تکفیر لگا ہے وہ خود انہیں اکثر گنگناتے رہیں گے۔ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہئے۔

رحمت حق بہا نمی جوید
رحمت حق بہانہ می جوید

اب اقبال کو لنگر کا کھانا پیش کیا گیا۔ سر محمد شفیع کو بھی بلایا گیا۔ دونوں نے ماحضر بڑے شوق سے تناول فرمایا۔ حضرت صاحب نے دعا فرمائی اور دونوں کو رخصت فرما دیا۔

اس حاضری کے بعد علامہ اقبال کی توقیر میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ علامہ اقبال کا یہ شعر

نگاہ مرد مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
جو ہو ذوق یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اس واقعہ کی عکاسی کرتا ہے اور "مرد مومن" سے مراد اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب رحمتہ اللہ علیہ شرقپوری ہیں۔

علامہ اقبال ۱۹۲۷ء میں حضرت میاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ۱۹۲۸ء میں حضرت صاحبؒ کا وصال ہو گیا۔ اقبال اکثر اپنے دوستوں سے کہتے کہ کاش میں بہت پہلے حضرت میاں صاحب کی بارگاہ میں حاضر ہوا ہوتا۔

یہ بات سچ ثابت ہوئی کہ اس حاضری کے بعد کسی بھی زبان پہ یہ لفظ نہیں آیا کہ علامہ اقبال کافر ہے اور یہ بات بھی ثبوت کو پہنچی کہ ہر مکتبہ فکر کے لوگ آج علامہ اقبال کے اشعار اپنی سٹیجوں پر جھوم جھوم کر پڑھتے ہیں اور اپنے بیان کو مزین اور پر زور بناتے ہیں۔

حوالہ کے لئے:

روایت حاجی معراج دین جنڈیالہ روڈ شیخوپورہ

مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتب بھی پیش نظر ہیں۔

اقبالیات بی اے	علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد
منبع انوار	صاحبزادہ میاں جلیل احمد شرقپوری
رسالہ مہک	(اقبال نمبر) گورنمنٹ کالج گوجرانوالہ
	نور اسلام شرقپور شریف اکتوبر ۱۹۹۳ء

سنگ زمرد کا متلاشی

☆ مرید و مرشد کی عقیدت کی ایک حقیقی جھلک

☆ ولی کامل کی نگاہ میں فاصلے اور رکاوٹیں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

☆ زمرد کی تلاش مرشد کے دروازے تک لے آئی۔

☆ حضرت بری امام پاک کی ایک کرامت۔

☆ اورنگ زیب کو وقت سے پہلے تخت حکومت کی خوش خبری۔

حضرت بری امام ۱۰۲۶ھ بمطابق ۱۶۱۷ء میں جہانگیر کے عہد میں تولد ہوئے آپ کے والد ماجد موضع باغ کلاں میں کرسال سے ہجرت کر کے آ گئے، ابتداءً آپ مویشی چرایا کرتے تھے اس دوران غار میں چھپ کر اللہ کی عبادت کرتے اور سلوک کی منزلیں طے کرتے رہے۔ آپ نے سخی حیات المیر زندہ پیر کے دست حق پرست پر بیعت فرمائی۔

آپ نے نصف زندگی عالم ہوش میں گزاری اور باقی نصف زندگی جذب میں، آپ نے علوم ظاہری و باطنی کی تکمیل کی اور نور پور شاہاں میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ قائم کیا۔ آپ بڑے صاحب کرامت ولی اللہ تھے۔

خاندان مغلیہ کا چشم و چراغ شہزادہ حسین دہلی میں اپنا محل بنانے میں مصروف تھا کہ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ کیوں نہ اس محل کی تعمیر میں زمرد

کا قیمتی پتھر استعمال کرے۔ مگر یہ زمرد کہاں سے آئے؟وہ زمرد کی کانوں سے بالکل ناآشنا تھا۔ ایک دن اس نے اپنی ایک نجی محفل میں اہل دانش کو بلایا اور زمرد کی کانوں کے بارے میں پوچھا مگر زمرد کی کانیں چونکہ اس وقت دریافت نہیں ہوئی تھیں، اس لئے ان لوگوں نے لاعلمی کا اظہار کیا مگر شہزادے کے دل و دماغ میں اس قیمتی پتھر کو محل میں استعمال کرنے کی دھن سمائی ہوئی تھی۔ اس لئے وہ زمرد کی تلاش میں خود کچھ لوگوں کی ایک جماعت ہمراہ لے کر چل کھڑا ہوا۔

وہ پہاڑوں کی بلندیوں تک گیا، خطرناک غاروں کے اندھیروں میں اس نے جھانک جھانک کر دیکھا اور شور مچاتی ہوئی ندیوں کے کناروں پر ڈھلے ہوئے پتھروں کو اٹھا اٹھا کر دیکھتا رہا مگر وہ جستجو میں ہر جگہ ناکام رہا۔ یہاں تک کہ وہ چلتے چلتے ہزارہ کے پہاڑوں تک آ گیا۔وہ دیوانہ وار اس مہم میں سرگرداں تھا ہر صبح اس کی امید اسے نئے نئے راستوں پر گامزن کر دیتی کبھی وہ اپنے ساتھیوں سے اس قدر آگے نکل جاتا کہ اسے ساتھیوں کی آواز تک نہ آتی اور ساتھیوں کو زمرد کی بجائے شہزادے کی تلاش دامن گیر ہو جاتی مگر ہر شام نتیجہ امید کے خلاف نکلتا۔

شہزادے کے ساتھی تو پہلے ہی دن سے کچھ بد دل تھے صرف حق نمک کی خاطر انہماک کا اظہار کر رہے تھے آخر ایک دن شہزادہ بھی دل شکستہ ہو گیا اور ساتھیوں سے یہ کہتے ہوئے عازم دہلی ہونے کا اظہار کیا کہ ایک سال ہم نے پہاڑوں کے دامن کی تلاشی لی ہے، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیوں پر قدم کے نشان بنائے ہیں، غاروں میں جھانکا ہے مگر ہر بار خالی رہے آؤ واپس چلیں جو لوگ زمرد کا پتھر اپنے گھروں میں استعمال نہیں کرتے

کیا انہیں رات کو نیند نہیں آتی۔

شہزادے نے ایک پہاڑی کے دامن میں اپنے دوستوں کی آخری دعوت کی اور پھر حکم دیا کہ کل ہمیں دہلی کی طرف واپس جانا ہے آج سارا دن آرام کرو کسی چشمے کے پانی سے اپنے کپڑوں کو دھو لو اور نہا کر اپنی تھکن دور کرو۔

شہزادہ حسین بزرگان دین اور اولیاء سے ایک خاص عقیدت رکھتا تھا وہ چاہتا تھا کہ اگر یہاں کوئی اللہ کا دوست ہو تو اسے ملتے جانا چاہئے۔ علاقے کے لوگوں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ راولپنڈی کے نواح میں ایک ولی حضرت سید عبدالطیف بری امام پاک ہیں، وہ روحانی چشمے جاری کئے ہوئے ہیں اور فیوض و برکات کے تحفے بانٹ رہے ہیں، ان کے نام کا شہرہ دور دور تک ہے خالی دامن لوگ آتے ہیں اور جھولیاں بھر کے جاتے ہیں، ان کی مرادیں پوری ہوتی ہیں، روتے ہوئے آتے ہیں ہنستے ہوئے جاتے ہیں۔

شہزادے کے بعض دوستوں کے دلوں میں گھر میں بیوی بچوں کے ہاں دہلی میں جانے کی جو اچانک خوشی پیدا ہوئی تھی، وہ یکدم کافور ہو گئی، انہوں نے اوپرے لفظوں سے شہزادے کی ہاں میں ہاں ملائی۔

بہرحال ہفتے عشرے کے بعد یہ قافلہ سید پور سے تین میل کے فاصلے پر کہاہوت کے پرگنے میں پہنچا، کہاہوت حضرت بری امام کی پرانی قیام گاہ ہے۔ آپ نے اس کہاہوت کو نور پور شاہاں کا نام دیا چنانچہ آج تک یہی نام چلا آ رہا ہے۔

شہزادہ آتے ہی بری امام کے قدموں میں گر پڑا اور رونے لگا۔

حضرت صاحب نے پوچھا نوجوان! تمہیں کیا مشکل درپیش ہے تم اس

قدر ویران حال کیوں؟ تم روتے کیوں ہو؟ کچھ تو کہو——

آپ نے شہزادے کے سر کو اوپر اٹھایا، اس کے آنسو پونچھے پانی کا ایک پیالہ پیش کیا —— شہزادے نے یہ ٹھنڈا اور شیریں پانی پیا تو اس کی جان میں جان آئی اسے سکون ملا۔ اس میں بات کرنے کی سکت آئی۔

حضرت صاحب نے دوبارہ پوچھا۔ بیٹا! کیا بات ہے تمہیں کس چیز کی تلاش ہے! تم کون ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟

میں دہلی کا مغل شہزادہ ہوں، حسین میرا نام ہے۔

تم شہزادے ہو کر ایک غریب کی کٹیا میں! تخت و تاج والے شہزادے کی مدد فقیر کی گدڑی کیا کرے گی؟

میں چاہتا تھا کہ زمرد کی سبز سبز سلیں میرے مکان کی زینت بنیں۔ میں نے ایک سال انہیں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے مگر ناکام رہا ہوں۔

اللہ والوں کی نگاہیں روشن ہوتی ہیں وہ زمین کے پاتال تک دیکھ سکتی ہیں۔ مشرق و مغرب کے فاصلے ان کے ہاں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ آپ میری مدد فرمائیں۔

آپ نے فرمایا بیٹا! ایک بار پھر انہی پہاڑوں میں جاؤ جن کے دامن میں تم نے بیٹھ کر کھانا کھایا تھا، وہیں آپ کو ایک چٹان ملے گی اس پر قدیم زبان میں کچھ عبارت کندہ ہے اس چٹان کو اکھاڑ کر دیکھو، تمہارا مقصد پورا ہو جائے گا۔

اب شہزادہ پھر ہزارہ کی پہاڑیوں کی جانب چل دیا اس کے قدموں میں اب کوئی تھکاوٹ نہیں تھی۔ بلکہ تازگی اور تیزی تھی وہ بہت دنوں کے بعد منزل مقصود تک پہنچ گیا، اسے وہ چٹان مل گئی جس کی نشاندہی حضرت صاحب

نے فرمائی تھی۔

جونہی چٹان کو اکھاڑا گیا نیچے زمرد کی کان کا ایک راستہ تھا زمرد اور ہیروں کے ٹکڑے پھولوں کی پتیوں کی طرح بکھرے پڑے تھے، جن کی چمک نے شہزادے کی آنکھوں کو خیرہ کر دیا۔ شہزادے کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی اس نے جلدی سے ایک تھال ہیروں سے بھر لیا اور منزلیں طے کرتا ہوا پھر حضرت بری امام کی خدمت میں پہنچا اور یہ تھال آپ کے سامنے رکھ دیا۔

آپ اس وقت ندی کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے آپ مسکرائے اس تھال کو پکڑ کر اس سے مختلف رنگوں کے رومالوں کو ہٹایا تو ہیروں کی شکل میں بے پناہ دولت دیکھی، آپ نے وہ سارے ہیرے ندی کے پانی میں الٹ کر بہا دیئے۔

شہزادہ حیران ہو گیا ـــــ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر زبان اس کے لفظوں کو قبول نہیں کرتی تھی۔ وہ بالکل ایک تصویر بنا کھڑا رہا۔

حضرت نے فرمایا شہزادے تم چپ کیوں ہو گئے؟

کانپتے کانپتے لفظ شہزادے کی زبان پر آئے۔

حضور! صرف یہی عرض کروں گا کہ اتنے قیمتی پتھروں کو آپ نے یوں ضائع کر دیا۔

ہاں یقیناً" یہ قیمتی پتھر تھے مگر آپ کے لئے میرے لئے ان ہیروں کی کوئی قیمت نہیں ہے، میرے نزدیک یہ ہیرے محض سنگ ریزے ہیں اگر تم ان پتھروں کے ضائع کرنے پر زیاں محسوس کرتے ہو تو ذرا اپنی آنکھیں بند کرو۔ تم ان سے بھی زیادہ قیمتی پتھر دیکھ سکو گے۔

شہزادے نے آپ کے حکم کے مطابق جونہی آنکھیں بند کیں اس کی

حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی شاہ صاحب کے اس احاطہ میں لاتعداد زمرد اور ہیرے بکھرے پڑے تھے، جن پر آنکھیں نہیں ٹھہرتی تھیں۔

آنکھیں کھولیں تو شاہ صاحب پیوند لگی گدڑی لئے بیٹھے تھے شہزادہ آپ کے قدموں پر گر پڑا عرض کیا حضور مجھے اپنے قدموں میں جگہ دے دیں میں آپ کی خدمت میں اپنی باقی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ آپ کی خانقاہ میں بس ایک جاروب کش کی حیثیت سے رہنا چاہتا ہوں۔

حضور نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا، توجہ فرمائی اور روحانی عظمت سے اس کے ظاہر و باطن کو روشن کر دیا۔

شہزادے نے اپنے ساتھیوں کو گھر جانے کی اجازت دے دی اور خود وہیں کا ہو کے رہ گیا۔

شہزادے نے آپ سے طریقت اور سلوک کے سبق لئے۔ ذکر الٰہی کے طریقے سیکھے اور ایک لمحہ بھی آپ کے دامن سے الگ نہ ہوا۔ شہزادے کی عقیدت اور انہماک آپ کو بے حد پسند آیا، آپ نے اس پر ہمیشہ توجہ رکھی اور مقامات سلوک کی منزلیں طے کراتے چلے گئے، ہمیشہ اس سے محبت اور انسیت کا اظہار کیا اس کو ہمیشہ اپنے نزدیک جگہ دیتے اور یہ حال ہو گیا کہ

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تاکس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم . تو دیگری

آخر یہی شہزادہ حضرت بری امام کا منظور نظر خلیفہ بن گیا خلافت اور اجازت اس کو سونپ دی گئی مگر مرشد کا دل نہ چاہا کہ اسے اپنے سے جدا کرے اور نہ ہی مرید نے پسند کیا کہ وہ کسی اور جگہ پر جا کر مرشد سے دور رہے، دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی رکھتے تھے۔

مگر حضرت صاحب کے ساتھ شہزادے کا یہ قرب حاسدین کو پسند نہ آیا وہ شہزادے کو نقصان پہنچانے کی تاک میں رہنے لگے۔ وہ جو بھی حربہ کام میں لاتے ناکام رہتا مگر ایک دن شاید حضرت صاحب کی کرامت کا اظہار ہونا تھا حضرت صاحب نے موقعہ دے دیا کہ حاسدین اپنے حسد کی آگ کو ٹھنڈا کرلیں، شہزادہ حسین اکیلے میں ذکر و فکر میں مشغول تھا کہ حاسدین نے ان پر مہلک وار کر دیا اور اپنے زعم میں ان کا سر تن سے جدا کر دیا۔

ادھر حضرت صاحب کے دل میں سخت بے چینی پیدا ہوئی وہ جائے واردات پر پہنچے، شہزادے کے خون کے ایک ایک قطرے نے قتل بے گناہ کی گواہی دی، آپ نے اس خون کو اپنے ہاتھوں پر مل لیا پھر بارگاہ رب العزت میں یہی ہاتھ بلند کر دیئے دعا کی اے میرے مالک! حسین کے حاسدوں نے حسین کو مجھ سے چھیننے کی کوشش کی ہے۔ یہ جدائی کا صدمہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتا تو حسین کو دوبارہ زندگی عطا فرما تاکہ لوگ دیکھ لیں کہ تو عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ہے۔

حضرت کی دعا مقبول بارگاہ ہوئی، شہزادہ حسین کو نئی زندگی ملی اور انہی طبعی زندگی پوری کرنے کے بعد وفات پائی اس طرح دشمنوں اور حاسدوں کے منہ کالے ہو گئے۔

اس شہزادے کی وفات حضرت صاحب کی زندگی میں ہوئی تو حضرت صاحب نے اپنے قرب میں دفن کرا دیا۔ آپ روزانہ قبر پر جاتے اور اس کی مغفرت کی دعا کرتے تھے۔

آج اگر آپ حضرت امام بری پاک کے مزار پر حاضری کے لئے جائیں تو مزار کے دائیں جانب حضرت صاحب کے احاطہ میں ایک سادہ مزار ہے یہ

مزار اس شہزادے کا ہے۔ لوح مزار پر یہ عبارت مرقوم ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت سخی شاہ حسین رحمتہ اللہ علیہ

طالب

بری امام رحمتہ اللہ علیہ

یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ حضرت بری امام پاک کی زیارت کرنے والا پہلے اس شہزادے (شاہ حسین) کے مزار پر حاضری دے، پھر بری امام پاک کی بارگاہ میں آئے یہاں سے فارغ ہو کر دوبارہ اس شہزادے کی بارگاہ میں حاضری دے۔

۲

ایک بار جب شاہ جہاں بادشاہ کسی اہم سلسلے میں ہزارہ کے دورہ پر آیا تو حضرت بری امام پاک کے مخالفوں نے حضرت کی بڑھتی ہوئی مقبولیت کو مغل حکومت کے لئے ایک خطرہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بادشاہ لوگوں کی باتوں میں آ گیا، حضرت صاحب کو گرفتار کرنے کے لئے ایک لشکر تیار کیا اور اورنگ زیب کو اس لشکر کا نگران مقرر کیا اور نور پور شاہاں کی طرف روانہ کیا۔

اورنگ زیب جب حضرت صاحب کی خانقاہ میں پہنچا تو آپ اس وقت درس و تدریس میں مشغول تھے آپ نے اورنگ زیب اور اس کے لشکر کی کچھ پرواہ نہ کی اور بڑے اطمینان کے ساتھ تدریس کے کام میں مصروف رہے، آپ کا یہ طرز عمل اورنگ زیب کو متاثر کر گیا۔ اسے یقین ہو گیا کہ حضرت صاحب واقعی ایک درویش صفت بزرگ ہیں۔

اس نے تدریسی اسباق پر کان دھرے۔ اس وقت حضرت ایک آیت کی

تشریح فرما رہے تھے۔ کہ اللہ کے ولی کسی بھی حزن و ملال سے نہیں ڈرتے اس دوران شہزادہ اورنگ زیب نے بھی قرآن پاک کی ایک آیت تلاوت کی جس کا ترجمہ یہ تھا کہ اللہ ، اس کے رسول اور حاکم وقت کی اطاعت کرو۔

حضرت صاحب نے اس آیت کو سنا، فرمایا میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں غرق ہوں امیر کی پرواہ کس طرح کروں۔

اورنگ زیب دل و جان سے حضرت صاحب کا گرویدہ ہو گیا۔ عرض کیا کہ حضرت صاحب میرے لئے دعا فرمائیں ۔ آپ نے دعا کی اہمیت بتاتے ہوئے فرمایا۔ جو شخص حلال روزی کھاتا ہے اس کی دعا مقبول ہوتی ہے۔

آپ نے اورنگ زیب کے حق میں دعا فرمائی اور فرمایا کہ اے اورنگ زیب، جب تم بادشاہ بنو تو حلال روزی کا خیال رکھنا۔ مزید فرمایا کہ رعایا کے ساتھ محبت اور شفقت کا سلوک کرنا، رعایا آپ کے لئے دعا گو رہے گی۔

اورنگ زیب کو وقت سے پہلے بادشاہت کی خوشخبری مل گئی۔ اورنگ زیب واقعتاً" نیک دل بادشاہ ثابت ہوا۔ وہ قرآن پاک کی کتابت کر کے گھر کے اخراجات چلایا کرتا تھا۔

حوالہ کے لئے امدادی کتب

سیارہ ڈائجسٹ — اولیائے کرام نمبر
شاہ لطیف بری — از منظور الحق صدیقی
اولیائے پاکستان — از عالم فقری
حیات بری امام ، مولانا محمد قاسم راجوردی
نورِ اسلام بشر تپور شریف اگست ۱۹۹۲ء

جہنمی اور جنتی

☆ عورت کی ہمیشہ سے خواہش رہی ہے کہ وہ مرد کے دل پر حکومت کرے۔
☆ علماء کا مرتبہ شہنشاہوں سے زیادہ بلند ہے۔
☆ ایک اللہ والے نے جنتی اور جہنمی کا مسئلہ حل کر دیا۔
☆ زبیدہ خاتون اور ہارون کے نزاع کا بر سر دربار فیصلہ
☆ شکستہ دلوں کے جڑنے کی ایک تاریخی داستان
☆ قصد گناہ کے بعد جو شخص خوف خدا سے رک گیا اس کا ٹھکانہ جنت۔

عورت کی ہمیشہ خواہش رہی ہے کہ وہ مرد کے دل پر حکومت کرے۔ اچھے مردوں نے عورت کی اس خواہش کا احترام ہمیشہ دل و جان سے کیا ہے۔ جیسے ملکہ مصر قلوپطرہ جو جولیس سیزر کی بیوی تھی، جہانگیر کی ملکہ نورجہاں اور شاہ جہاں کی ملکہ ممتاز بیگم ---- ہارون الرشید کی بیوی زبیدہ خاتون بھی ایسی ہی عورتوں میں شمار ہوتی ہے۔ زبیدہ ہارون کی چہیتی بیوی تھی۔ اس کا حسن ، اس کی ادا، اس کی عقل ، اس کی معاملہ فہمی اور اس کی زیرکی نے مل کر اس کی شخصیت کو بڑا پر کشش بنا دیا تھا اور ہارون الرشید اس کے ہاتھ کا

کھلونا بن گیا تھا۔

مگر یہ کھلونا ایسا نہیں تھا کہ جب چاہا اس سے کھیل لیا، جب چاہا اسے پھینک دیا، بلکہ دونوں میں ایک محبت تھی اور ایک لگاؤ تھا۔ زبیدہ جب اس کھلونے سے دل بہلاتی تو وہ زمانے بھر کی عورتوں سے اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتی اور ایسے ہی جب ہارون الرشید اس کے ہاتھوں کا کھلونا بنا ہوتا تو اس کی زندگی بھی راحتوں کا ایک گہوارہ بن جاتی۔

مگر ایک دن کشش و محبت کے اس جوڑے کو نہ جانے کیا ہوا کہ جب ہارون الرشید دیر تک گھر نہ آیا تو زبیدہ کے دل میں طرح طرح کے خیال جنم لینے لگے۔ ہارون صبح سے شکار کھیلنے کے لئے گیا ہوا تھا مگر ابھی تک گھر نہ آیا تھا۔ زبیدہ بار بار چھت پر جا کر دور دور تک دیکھتی۔ چاروں طرف دیکھتی تاکہ خلیفہ اور وزیروں کے گھوڑوں کو دیکھ سکے یا ان کے ٹاپوں کی آہٹ سن پائے مگر ہر بار نہ تو اس کی آنکھیں ان شکاریوں کو دیکھ پاتیں اور نہ ہی اس کے کان کسی آواز کو سن پاتے۔ وہ بار بار کے اس عمل سے تھک سی گئی، پھر اچانک اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ وہ سسکیاں بھرتی ہوئی اپنی سیج پر جا گری۔ نہ جانے وہ کب تک روتی رہی اور روتے روتے نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔ اسے کچھ پتہ نہ چل سکا کہ ہارون الرشید کب محلوں میں آیا اور کب وہ اپنی خوابگاہ میں چلا گیا۔ ہارون بھی کافی دیر تک اس انتظار میں رہا کہ زبیدہ اسکے، ہاں آکر دیر سے آنے اور شکار کے ملنے یا نہ ملنے کے بارے میں ضرور دریافت کرے گی۔

مگر زبیدہ تو اس وقت گہری نیند میں سوئی ہوئی تھی۔ اگر وہ جاگتی بھی ہوتی تو بھی اس کے دل میں ہارون الرشید کے بارے میں ناراضگی پیدا ہو چکی

تھی۔ اور شائد وہ نہ آتی۔ ادھر ہارون الرشید نے جب کافی دیر تک زبیدہ کا انتظار کیا تو اس کے دل میں میل سی آگئی، اس کی مردانہ حاکیت جاگ پڑی، اس کی سوچیں عجیب عجیب راہوں پر چل نکلیں۔

زبیدہ میرے دم سے ملکہ بنی ہے۔ اگر میں اسے اپنے عقد میں نہ لاتا تو اس کی یہ شان کیسے ہوتی۔؟

میں نے جو اسے سر پر اتنا چڑھا لیا ہے یہ سب اسی کا نتیجہ ہے کہ اس نے آج میری کچھ پروا نہیں کی۔

ہم عورتوں کی اداؤں پر مرمٹتے ہیں۔ ان کی مسکراہٹوں پر دل و جان نچھاور کر دیتے ہیں ملکوں کے حاکم ہوتے ہوئے بھی ان کی حاکیت قبول کر لیتے ہیں۔ مگر یہ عورتیں اپنی ضد کی اس قدر پکی ہیں کہ ان کا مزاج اوپر چڑھ جائے تو نیچے آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔

وہ بار بار سوچتا رہا کہ زبیدہ کی وہ کون سی خواہش ہوگی جو میں نے پوری نہیں کی؟ پھر وہ کیوں اس طرح مجھ سے کھنچ کے رہتی ہے۔ ٹھیک ہے اگر وہ اس غرور اور تکبر کی پینگ میں بیٹھ گئی ہے تو ہم بھی اپنی غیرت و انا کے مالک ہیں۔

اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "ہارون! بھول جاؤ اس زبیدہ کو۔ کسی اور کو زبیدہ بنا لو۔ مت بولو اس متکبر زبیدہ سے۔ اب اس سے بہتر کئی عورتیں حلقہ زوجیت میں آکر تیری زندگی کو گلشن لیل و نہار بنا سکتی ہیں۔ ہاں ہاں اس کی زندگی میں ایسا انقلاب لاکر عام لوگوں کو دکھایا جا سکتا ہے کہ وہ بھی عورت کی بے جا حکمرانی کو قبول نہ کریں اور متکبر عورت کی پرستش چھوڑ دیں۔

ہارون الرشید اس طرح کے الٹے سیدھے خیالات کی دنیا میں کھو کر اپنی سیج پر کروٹیں بدلنے لگا۔ اس طرح بیقراری میں رات بسر ہونے لگی۔ آخر جب ہارون الرشید نماز تہجد کے لئے اٹھا تو اسے زبیدہ کے کمرے سے سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ وہ وضو کئے بغیر ہی دبے پاؤں زبیدہ کی خواب گاہ کی طرف چل دیا۔ کمرے میں جھانک کر دیکھا تو اندر ہلکی ہلکی سی روشنی تھی اور زبیدہ کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ایسے لگتا تھا کہ وہ رات بھر روتی رہی ہے۔ مگر اس حالت کے باوجود زبیدہ بڑی حسین لگ رہی تھی۔ اس کی اداؤں میں اور ہی کشش جلوہ گر تھی۔

ہارون الرشید کی آنکھوں میں محبت کی نگاہیں سج گئیں۔ اسے زبیدہ کے انگ انگ سے بے گناہی کی التجائیں اٹھتی نظر آئیں۔ بس پھر کیا تھا؟ ہارون الرشید پھر وہی پہلا ہارون الرشید بن گیا۔ اس کے انتقام کے جذبے محبت میں بدل گئے۔ دوسرے ہی لمحے اس نے دستک دی۔ زبیدہ نے چونک کے دروازے کی طرف دیکھا۔

"کون؟"

"میں۔ ہارون الرشید ہوں۔"

"کیوں آئے ہو اب میری چوکھٹ پر۔ جاؤ جیسے تم نے رات گزاری ہے ویسے ہی اب جاگ کر صبح کا انتظار کرو۔"

"زبیدہ" دروازہ تو کھولو آخر تم اس قدر پریشان کیوں ہو۔ میں تم سے تمہارے رونے کی وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں مجھے رونے دو۔ ہم عورتیں رونے کے لئے ہی تو پیدا ہوئی ہیں۔

ہارون کا دل اور پسیج گیا۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا تو دروازہ خود

بخود کھل گیا۔ دروازہ تو پہلے ہی سے کھلا ہوا تھا اور رات بھر کھلا رہا تھا۔ شاید کسی کے انتظار میں۔

ہارون اندر چلا گیا۔ زبیدہ کی سسکیوں کی رفتار اب مزید بڑھ گئی۔ ہارون کے دل میں محبت کے جذبات کا ایک سیلاب آیا ہوا تھا وہ اس کے قریب ہوا۔اور زبیدہ تڑپ کر اٹھی کہا۔

"تم بڑے ظالم مرد ہو! تمہیں عورت ذات کو تڑپانا آتا ہے، اسے رلانا آتا ہے، بے قراری کی وادیوں میں دھکیلنا آتا ہے۔"

"زبیدہ" میری بات تو سنو! تم آخر اس قدر بیخ پا کیوں ہوتی جا رہی ہو۔؟ میرا قصور تو بتاؤ۔ میں نے کون سی تمہاری خواہش پوری نہیں کی؟ جانتی ہو میں نے تمہیں ملکہ بغداد بنا دیا ہے۔"

"ہاں جانتی ہوں۔ تم کون ہو مجھے ملکہ بنانے والے؟ میرے مقدر میں ملکہ بننا لکھا تھا اور میں ملکہ بن گئی۔ میں جس کے ساتھ بھی شادی کرتی وہ خلیفتہ المومنین ہوتا۔ میں تو کہتی ہوں تم میری وجہ سے خلیفہ بنے ہو۔ جانتے ہو جب میں نے تم سے شادی کی تھی تم اس وقت خلیفہ نہ تھے۔ میرے آنے کے بعد خلیفہ بنے۔"

ہارون الرشید زبیدہ کو منا رہا تھا مگر زبیدہ قابو میں نہیں آ رہی تھی۔ آخر ہارون الرشید غصے میں آگیا۔ کہنے لگا۔

"ہاں ہاں ہم مرد ظالم ہوتے ہیں، بے وفا ہوتے ہیں، احساس ذمہ داری ہم میں نہیں ہوتا۔"

"مان گئے نا اپنے ظلم کی کرتوتوں کو۔ اور یہ بھی خوب جانتے ہو کہ ظالم کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ تم جہنمی ہو۔" زبیدہ نے کہا۔

"ہاں ہاں۔ میں تم کو جہنمی کہہ رہی ہوں۔ ہارون الرشید کو جہنمی کہہ رہی ہوں۔"

"اچھا! تم اس قدر سخت کلامی پر اتر آئی ہو ـــ یاد رکھو زبیدہ! تم میری بیوی ہونے کے ساتھ ساتھ میری رعایا بھی ہو، میری محکوم بھی ہو، میری سلطنت کے دبدبے تو مشرق و مغرب تک مانے جاتے ہیں۔ تم کیا ہو۔"

"ہاں ہاں مجھے پہلے ہی علم تھا کہ میری اس گھر میں کوئی حیثیت نہیں۔ نکال دو مجھے اس گھر سے آزاد کر دو مجھے، طلاق دے دو، میں ایسے ظالم اور جہنمی خاوند سے تعلق نہیں رکھنا چاہتی۔" زبیدہ ایک ہی سانس میں بولے جا رہی تھی۔

ادھر ہارون کا غصہ بھی ہر آن بڑھتا جا رہا تھا۔ شیطان نے اس کی عقل کی باگیں تھام لی تھیں۔ وہ یکدم بولا۔

"دیکھو زبیدہ! تم نے مجھ پر بہت بڑا الزام لگایا ہے کہ میں جہنمی ہوں۔ اگر میں جہنمی ہوں تو میری تم سے علیحدگی ہے۔ جنتی اور جہنمی واقعتاً رشتہ ازدواج میں منسلک نہیں رہ سکتے۔ مگر یاد رکھو تمہارے کہنے سے میں جہنمی نہیں بن سکتا۔؟

"ہاں بذات خود تم جنتی بھی نہیں کہلا سکتے ہو۔ اگر تم اپنے آپ کو جنتی ثابت کر دو تو مجھے آپ کی خدمت بطور بیوی کرنے میں کوئی عذر نہ ہو گا۔ ورنہ میں آپ کے لئے ایسی ہوں جیسے ایک مطلقہ عورت۔"

ہارون غصے کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اس نے وضو کیا اور نوافل ادا کرنے شروع کر دیئے۔ ازاں بعد اس نے صبح کی نماز پڑھی اور پھر ہوا خوری کے لئے باغیچہ میں چلا گیا۔

چند دن ہی ہوئے تھے کہ دونوں کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ دونوں کے جذبات پر محبت کا غلبہ ہوا ۔ جدائی کی تکلیف ناقابل برداشت ہو گئی۔ بیتے دنوں کی یادیں تڑپانے لگیں۔ اپنی اپنی ذات اپنے لئے ہی قابل نفرین بن گئی۔ دونوں پچھتانے لگے۔ دونوں بہانے ڈھونڈنے لگے کہ دوریاں ختم ہو جائیں اور قربتیں میسر آ جائیں۔

صرف لڑائی جھگڑا ہوتا تو قربت کے سو بہانے بن سکتے تھے مگر یہاں معاملہ بڑا عجیب تھا کہ اگر ہارون الرشید جہنمی ہے تو زبیدہ کی حیثیت مطلقہ عورت کی ہے اور اگر جنتی ہے تو ہارون الرشید اور زبیدہ کے ازدواجی تعلقات قائم ہو سکتے ہیں۔

مگر ان دونوں صورتوں میں جنتی اور جہنمی کا علم تو صرف خدا کی ذات کو ہے۔ہارون کا خیال تھا کہ شاید علماء کے پاس اس کا کوئی حل موجود ہو گا۔ وہ مختلف علماء کی خدمت میں گیا ان میں حضرت العلام اصمعی رحمتہ اللہ علیہ بھی تھے جو ہارون الرشید کے بیٹوں کے استاد تھے۔ مشہور زمانہ واعظ مرہ بن سماک اور حضرت امام شافعی کے استاد ابراہیم بن ابی یحییٰ رحمتہ اللہ علیہم اجمعین بھی تھے۔

اتفاق کی بات ہے کہ جب ہارون الرشید ابراہیم بن ابی یحییٰ کے ہاں گیا تو امام شافعی بھی اپنے استاد محترم کے پاس بیٹھے تھے۔ امام شافعی ابھی امام کے نام سے زیادہ مشہور نہ ہوئے تھے۔ وہ تو بس ابھی انیس بیس سال کی عمر کے ایک نوجوان تھے۔

ہارون الرشید ، حضرت ابراہیم بن ابی یحییٰ کے پاس آیا اور زبیدہ سے اپنے نزاع کے متعلق ساری بات سنائی۔ استاد نے اپنے اس ہونہار شاگرد کی

طرف دیکھا اور فرمایا۔

"اے محمد! (حضرت امام شافعی کا اسم مبارک) کیا آپ اس معاملہ میں خلیفہ کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟"

"ہاں! مگر یہاں نہیں۔ یہ بات خلیفہ کے دربار میں کرنے والی ہے۔"

خلیفہ حیران ہو گیا۔ نہ جانے بھرے دربار میں کیا بات کر دی جائے۔ کہیں مجھے شرمندہ نہ کر دیا جائے۔ اور زبیدہ میرے ہاتھ سے ہی نکل جائے۔

"یہ علمی اور فقہی بات ہے اس کا تعلق دربار سے کیا ہے؟" خلیفہ نے عرض کیا۔

"دربار سے اس بات کا تعلق ہے، تبھی تو دربار میں بات کرنے کو کہا ہے۔ امام صاحب نے فرمایا۔

"جیسے آپ کی مرضی، ہم تو بس علماء کے خادم ہیں، کب تشریف لائیں گے آپ؟" خلیفہ نے عرض کیا۔

"جب آپ چاہیں دربار سجا دیں۔ میں استاد محترم کی معیت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"دربار تو ہر وقت سجا رہتا ہے، علمی سجاوٹ یقیناً آپ کے آنے سے ہو جائے گی۔ اگر آپ کے پاس فراغت ہو تو پرسوں دوشنبہ کا دن ٹھیک رہے گا۔"

"ہاں ٹھیک رہے گا۔ دوشنبہ کا دن بڑا مناسب رہے گا۔"

مقررہ تاریخ کو دربار کی سجاوٹ دیدنی تھی۔ امراء' وزراء سب کے سب دم بخود بیٹھے تھے۔ زبیدہ کو بھی دربار میں بلا لیا گیا تھا۔ کئی علماء بھی تشریف فرما تھے۔ اتنے میں حضرت امام شافعی اپنے استاد حضرت ابراہیم بن ابی یحییٰ

کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے آ گئے۔

حاضرین و سامعین احتراماً کھڑے ہو گئے۔ خلیفہ ہارون الرشید تخت پر رونق افروز تھا۔ جب سارے لوگ بیٹھ گئے تو حضرت امام شافعی نے خلیفہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"اے خلیفتہ المومنین! آج کے مسئلہ کی رو سے آپ کو میری ضرورت ہے یا مجھے آپ کی؟"

"خلیفہ نے اس کے جواب میں کہا۔ "مجھے آپ کی ضرورت ہے۔"

حضرت امام شافعی نے فرمایا کہ۔

"سچ کہتے ہو! اب تم تخت سے نیچے آ جاؤ کیونکہ علماء کا مرتبہ تم سے بلند ہے۔"

ہارون الرشید اس ارشاد پر تخت سے نیچے اتر آیا اور حضرت امام شافعی سے فرمایا۔ " آئیے آپ ہی اس تخت کے وارث ہیں۔ اس پر بیٹھنا آپ ہی کو زیبا ہے۔"

حضرت امام شافعی جلدی سے اٹھے اور جا کر تخت پر بیٹھ گئے۔ ہارون الرشید عام لوگوں کی نشستوں میں چلا گیا۔ کیا شان خداوندی تھی چند لمحوں میں کون تخت پر بیٹھا اور کون تخت سے اترا۔ اب حضرت امام شافعی نے سوال کیا۔

"اے خلیفتہ المومنین کیا تمہیں کبھی ایسا موقعہ بھی ملا ہے کہ گناہ پر قادر ہونے کے باوجود تم نے محض اس لئے گناہ نہ کیا کہ تم خوف الٰہی سے کانپ گئے ہو یا ڈر گئے ہو، اس احساس نے تم کو شدت سے جکڑ لیا ہو، تم نے اپنی حیثیت محض ایک تنکے کی سمجھ لی ہو، جس میں ہوا کے ایک ہلکے

جھونکے کے آگے ایک لمحہ بھی رکنے کی قوت نہ ہو؟"

ہارون الرشید نے سر جھکا لیا اور عرض کیا۔

"میں قسم کھا کر عرض کرتا ہوں کہ میری زندگی میں ایسے مواقع کئی بار آئے کہ میں تخلئے میں ہوں، گناہ کی دعوت میرے لئے عام ہوتی اور پھر اس گناہ میں بھی بڑی لذت اور مٹھاس بھری ہوتی۔ جذبات مجھے وہ گناہ کرنے کی اجازت دے رہے ہوتے کہ معاً" خوف الٰہی میرے دامن کو کھینچ کھینچ کر مجھے احساس دلاتا کہ ہارون کیا کر رہے ہو؟ کیا کرنے والے ہو؟ کیا میدان حشر میں برے لوگوں کی صف میں کھڑے ہونا گوارا کر لو گے، اس دن کی سختیاں برداشت کرنے کی ہمت تم میں ہو گی ؟ بتاؤ اپنا آپ کیسے بچاؤ گے۔ جب دنیا کے سارے اسباب و وسائل منقطع ہو جائیں گے اور اپنے نبی کے پاس کس منہ سے سفارش کی غرض سے جاؤ گے؟ اس وقت اے ابو عبداللہ (امام شافعی کی کنیت) میں کانپ جاتا۔ میرے پسینے چھوٹ جاتے۔ بے بسی مجھے ہر طرف سے گھیر لیتی میں محض اللہ کے فضل سے ہمت کر کے اس گناہ کے چنگل سے نکل جاتا۔ کئی کئی دن میرے جسم کے رونگٹے کھڑے رہتے۔ میں بالکل لاغر اور مضمحل رہتا۔"

حضرت امام شافعی نے فرمایا۔

"اے امیر المومنین اگر ایسا ہے تو آپ جنتی ہیں۔ آپ جنتی ہیں۔ آپ جنتی ہیں۔ جاؤ آپ کی زبیدہ آپ کو مبارک ہو۔"

ہارون الرشید نے سر جھکا لیا۔ سارا دربار حیران تھا کہ امام صاحب نے یہ کیا فرما دیا ہے۔ جنتی اور جہنمی کا فیصلہ تو میدان حشر میں ہو گا . اس دنیا میں کس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیا خبر آج کسی کے اعمال جنتیوں

والے ہوں۔ کل کو اس سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد ہو جائے اور وہ جہنمیوں کی فہرست میں شامل ہو جائے اور ایسے ہی آج ایک شخص کے اعمال جہنمیوں والے ہیں کل اس سے بہت بڑی نیکی ہو جائے اور وہ جنتیوں والے ٹولے کے ساتھ مل جائے۔

یہ ایک سوال تھا جو ہر ایک کی زبان پر جرات اظہار کا سہارا ڈھونڈ رہا تھا۔ ہر کوئی ایک دوسرے کے منہ کو دیکھنے لگا۔ امراء نے وزراء کی جانب دیکھا کم علم والوں نے زیادہ علم والوں کی طرف دیکھا اور عام لوگ تو بس علماء و صلحاء کو تک رہے تھے۔ کہ وہ یقیناً فتوٰی کی حجت طلب کریں گے۔ مگر کسی کو ہمت نہ ہوئی کہ امام وقت کی بات کی تردید کر سکے۔ کیونکہ ایک طرف امام شافعی فتوٰی دے رہے تھے۔ دوسری جانب ہارون الرشید خلیفتہ المومنین سر جھکائے کھڑا تھا۔ ہارون بذات خود اس بات کی حجت کیوں طلب کرے۔ فیصلہ تو اس کے حق میں ہوا تھا۔ خلاف ہوتا تو شاید کوئی بات کرتا۔

مگر پھر بھی توثیق کی خاطر اس نے علماء سے پوچھا کہ۔

"اے گروہ علماء! اس فیصلہ اور فتوٰی میں کیا کوئی شبہ والی بات ہے؟"

مرہ بن سماک اور اصمعی دونوں یک دم کھڑے ہو گئے۔ عرض کیا۔

"ہم ابو عبداللہ (امام شافعی کی کنیت) سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ انہوں نے کس حجت سے اپنے فیصلے کا استدلال کیا ہے؟"

ہارون الرشید نے امام شافعی کی بارگاہ میں جھکتے ہوئے عرض کیا۔

"لوگ آپ کے فتوٰی کا استدلال مانگتے ہیں۔"

امام صاحب نے فرمایا کہ۔

"ارشاد باری تعالٰی ہے (قصد گناہ کے بعد جو شخص خوف خدا سے رک

گیا اس کا ٹھکانا جنت ہے۔"

تمام علماء کی اس جواب سے زبانیں بند ہو گئیں۔ سب امام صاحب کو داد دینے لگے۔ ملکہ زبیدہ جو پردے کی اوٹ میں بیٹھی آج کے اجلاس کی گفتگو سن رہی تھی بڑی خوش ہونے لگی کہ اس کا خاوند اسے واپس مل گیا ہے۔

ازاں بعد شاہی دربار کی طرف سے ایک پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا اور ہارون نے کچھ لمحے امام شافعی کے ساتھ گذارے۔ پھر دینار و درہم کی ایک تھیلی پیش کی مگر امام صاحب نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔ فرمایا۔
"ہم علم کو بیچا نہیں کرتے۔ یہ رقم غرباء میں بانٹ دو۔" چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

حوالہ کے لئے:

تذکرہ اولیاء از حضرت فرید الدین عطار رحمۃ اللہ علیہ

امدادی کتب:

تاریخ خلفاء از علامہ امام [illegible] الدین سیوطی

ترجمان السنہ جلد اول از مولانا محمد بدر عالم میرٹھی۔

اردو انسائیکلوپیڈیا' فیروز سنز لاہور۔

نورِ اسلام شرقپور شریف

دسمبر ۱۹۹۳ء

"ابا جی"

☆ بیماری کا علاج تو محض ایک بہانہ ہے۔ شفاء منجانب اللہ ہوتی ہے۔
☆ لنگر کے ٹکڑے بیمار مویشیوں کا علاج بن گئے۔
☆ معالج کی شہرت اس کی ڈگریوں یا رجسٹریشن سے نہیں بلکہ اس کے کام اور اخلاص سے ہوتی ہے۔
☆ اس کی تمنا تھی کہ رات کو کوئی دکھی ہائے ہائے نہ کرے بس سکون سے سوئے اور سکون سے اٹھے۔
☆ دوائیں دی گئیں اور دعائیں لی گئیں۔

کوٹ رادھاکشن کے قریب بھائی پھیرو روڈ پر ایک قصبہ نما گاؤں نیتکے میں ۱۹۷۶ء میں یہ خبر کانوں کان سفر کرتے کرتے آناً فاناً پھیل گئی کہ "ابا جی" وفات پا گئے۔ یہ خبر سنتے ہی لوگوں کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ سب لوگوں نے اپنا کاروبار بند کر دیا۔ دکانوں کے شٹر گرا دیئے گئے۔ اور پورے گاؤں میں صف ماتم بچھ گئی۔ بچے بھی ابا جی کے سوگ میں بلبلا رہے تھے۔ جوان بھی مغموم تھے۔ عورتیں بھی رو رہی تھیں۔ سب ہائے ابا جی' ہائے ابا

جی کہہ رہے تھے۔ وہ شخص کتنا عظیم تھا! جسے پورے گاؤں کے لوگوں نے ابا
جی کا خطاب دے رکھا تھا۔

اس مرنے والے کو لوگ ابا جی ہی کہتے تھے۔ وہ جوانوں کے بھی
بوڑھوں کے بھی، بچوں کے بھی ' عورتوں کے بھی اور مردوں کے بھی ابا
تھے۔ اور پورا گاؤں ان کی اولاد تھا۔ ہر دل میں خیال پیدا ہوتا تھا کہ کیا وہ
اتنی عمر کا بابا تھا کہ پورا گاؤں اس کے بیٹوں' پوتوں ' پوتیوں اور نواسے
نواسیوں سے بھرا پڑا تھا۔ ہاں وہ ۸۵ سال کا بوڑھا بابا تھا۔ اُس کی آنکھوں
کے سامنے کئی بچے پیدا ہوئے اور جوان ہو کر بوڑھے ہو گئے۔ شاید اسی لئے
لوگ انہیں ابا جی کہتے تھے۔

لیکن نہیں یہ عمر کی بات نہ تھی۔ عمر میں تو اس سے بھی کئی زیادہ عمر
کے بوڑھے بابے تھے مگر انہیں کوئی ابا جی نہیں کہتا تھا۔ اس کے سینے میں
ایک باپ کا دل دھڑکتا تھا۔ اس کے دل میں محبت کی ایک دنیا آباد تھی۔ وہ
دوسروں کے دکھ درد اپنے دامن میں ڈال لیتا تھا۔ اسی وجہ سے وہ لوگوں کے
دلوں کی دھڑکن بن گیا۔ لوگوں کی آنکھوں کا تارا بن گیا اور لوگوں نے اسے
یہ خطاب دیا جس کے لئے لوگ عمر بھر ترستے رہتے ہیں۔ وہ خطاب تھا "ابا
جی"

یہ ابا جی! بابا حکیم جلال الدین تھے۔ بیماروں کے مسیحا' نبض دیکھ کے
دوائی دیتے۔ نہ دواؤں کے پیسے لیتے نہ کوئی انعام و اکرام کا لالچ۔ خیبر سے
کراچی تک کے لوگ آتے۔ آپ کی دعا اور دوا سے صحت یاب ہوتے۔ ان
کے مطب میں مریضوں کی بھیڑ لگی رہتی۔ دوسرے حکیموں اور ڈاکٹرں کے
پاس مریض جاتے ہی نہ تھے۔ وہ سارا دن بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے۔ سنا گیا

ہے ایک حکیم نے حکمت چھوڑ کر پرچون کی دکان کر لی۔ پوچھا گیا حکیم
صاحب یہ تنزلی کیوں؟

کہنے لگا۔ بابا جلال الدین سارے حکیموں'ڈاکٹروں کو لے ڈوبے گا۔ وہ
لوگوں کو مفت دوائی دیتا ہے۔ لوگ اتنے پاگل تو نہیں کہ ڈاکٹروں کی بھاری
فیسیں بھریں اور مہنگی دوائیں خریدیں پھر صحت یابی کا بھی یقین نہیں۔ بابا
جلال الدین نہ فیس لیتا ہے نہ دوائی کے پیسے لیتا ہے اور مریض کا اعتماد اور
یقین بھی پختہ ہے کہ اسے صحت ہو جائے گی۔ پتہ نہیں یہ گھر کے اخراجات
کیسے چلاتا ہے۔ تانبے' پارے' سونے اور چاندی کے قیمتی کشتے مفت بانٹے
جا رہے ہیں۔

ڈاکٹروں،حکیموں نے طبی بورڈ قصور کے صدر سے شکایت کی بابا جلال
الدین طبی لحاظ سے ایک ان پڑھ حکیم ہے۔ ویسے بھی یہ غیر رجسٹرڈ ہے۔
لوگوں کو کچے کشتے دیتا ہے جو صحت کی بجائے موت کا باعث بن سکتے ہیں۔

ان حاسدوں کی شکایت کی پذیرائی بڑی جلدی ہوئی۔ ۲۵ ڈاکٹروں اور
حکیموں کا ایک بورڈ بھاگا آیا۔ قصور کا میڈیکل آفیسر بھی ان میں شامل تھا۔
نینکے میں آ کر ان لوگوں نے جس بچے جوان بوڑھے سے جلال الدین کا
پتہ پوچھا، سب نے ابا جی کے حوالے سے تعارف کرایا۔ یہ لوگ حیران رہ
گئے کہ پورا گاؤں ان کی اولاد ہے۔ روحانی اولاد ہے۔ وہ ان لوگوں کے دلوں
میں بستا ہے۔ اگر ہم سے بابا جی کی شان میں کوئی گستاخی ہو گئی، تو یہ لوگ
ہمیں چھوڑیں گے نہیں۔ قدرتی طور پر ایک رعب سا ان لوگوں پر چھا گیا۔

بہرحال جب یہ وفد میاں جلال الدین کے مطب میں پہنچا تو کوئی
مریضوں کی دو لمبی قطاریں اپنی باری کا انتظار کر رہی تھیں۔

بابا جی کو اس وفد کی آمد کی اطلاع دی گئی، تو انہیں کسی قسم کا کوئی تردد نہ ہوا۔ چارپائیوں پر ان لوگوں کو بٹھوا دیا گیا اور مریضوں کو دوائی دینے میں مصروف رہے۔

جب آپ اس کام سے فارغ ہوئے، تو ان مہمانوں سے فرمایا۔

اگرچہ مہمان کی بڑی تکریم ہے، مگر اس تکریم کا احساس کیے بغیر میں اپنے کام میں مصروف رہا ہوں۔ یقیناً" میری یہ حرکت آپ کو پسند نہیں آئی ہو گی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ میں نے تندرست کی نسبت بیمار کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ آپ ماشاء اللہ خیریت سے ہیں۔ مگر بیمار بیچارے دکھوں کے مارے نہ جانے کس کس تکلیف میں مبتلا تھے۔ میں اس حرکت پر معذرت خواہ ہوں۔

اب ان کی شربت سے تواضع کی گئی۔ ازاں بعد پوچھا گیا کہ میرے غریب خانہ پر آپ نے کس غرض سے قدم رنجہ فرمایا ہے؟

ہمارے آنے کا مقصد یہ تحقیق کرنا ہے کہ کیا آپ رجسٹرڈ حکیم ہیں یا غیر رجسٹرڈ؟

بابا جی نے فرمایا! غیر رجسٹرڈ ہوں۔

کیا آپ کے علم میں یہ بات نہیں کہ حکومت غیر رجسٹرڈ حکماء کو مریضوں کی جانوں سے کھیلنے کی اجازت نہیں دیتی؟

بابا جی نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہوا کہ رجسٹرڈ حکمأ مریضوں کی جانوں سے کھیل سکتے ہیں۔ گویا کہ اس طرح رجسٹریشن سے صرف حکیم کو تحفظ ملتا ہے کہ اگر اس کے زیر علاج مریض کی زندگی کی ڈوری کٹ جاتی ہے تو حکومت اس سے نہیں پوچھے گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رجسٹریشن سے مریضوں کو کیا تحفظ ملا ہے۔

وفد کا لیڈر چپ ہو گیا۔ ---- بابا جی نے مزید فرمایا!

آپ مجھ سے امراض کی تشخیص کے بارے میں سوال کریں۔ ان امراض کی دواؤں کے بارے میں سوال کریں۔ اگر میں آپ کو مطمئن نہ کر سکوں، تو مجھے بے شک علاج معالجے سے روک دیا جائے۔ ویسے بھی آپ خوب جانتے ہیں کہ حکیم کی شہرت اس کی ڈگریوں یا رجسٹریشن سے نہیں ہوتی، بلکہ اس کے کام کے اخلاص سے ہوتی ہے۔ اس کے علاج سے صحت یاب ہونے والے مریض خود بخود اس کی شہرت کا اشتہار بن جاتے ہیں۔

وفد نے بابا جی سے سر درد کی وجوہات دریافت کیں۔ درد گردہ کے بارے میں بھی سوالات پوچھے۔ بابا جی نے انہیں تسلی بخش جواب دیئے۔ وفد کے ہر ممبر نے اپنی ہستی کی اہمیت جتانے کے لئے سوالوں کی بھرمار کر دی۔ بابا جی ہر ایک کو مطمئن کرتے رہے۔ آخر میں آپ نے فرمایا میں بھی آپ سے کوئی سوال کر سکتا ہوں؟

وفد کے لیڈر نے عرض کیا نہیں۔ ممتحن صرف امتحان لے سکتا ہے، امتحان دیا نہیں کرتا۔ لیڈر کو شاید علم ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھی یقیناً" بابا جی کے سوالوں کے جوابات نہیں دے سکیں گے۔ انہوں نے گفتگو کا رخ بدلا۔ اور ان کے مطب کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔

اثنائے گفتگو وفد نے پوچھا کہ آپ نے حکمت کس سے سیکھی ہے؟

بابا جی نے فرمایا۔ کیا حکمت سیکھنے والی کوئی چیز ہے۔؟ حکمت تو خدا کی دین ہے۔ جسے چاہے وہ دیدے۔

ہمارا مطلب حکمت بمعنی دانائی نہیں، بلکہ حکمت بمعنی علاج مریضاں ہے یعنی طب۔

بس میری تمنا تھی کہ کوئی دکھی انسان رات کو ہائے ہائے نہ کرے۔ سکون کے ساتھ سوئے اور سکون کے ساتھ اٹھے۔ میں نے حکمت کی کچھ کتابیں خریدیں اور معمولی قسم کی دوائیاں بنا کر لوگوں کو دینے لگا۔ چونکہ میری نیت اور جذبہ میں خلوص تھا، اس لئے قدم قدم پر میری پذیرائی ہوئی۔ اب میں چاہتا ہوں کہ بڑے امراض کا بھی علاج کروں مگر ڈرتا تھا کہ کہیں نیم حکیم خطرہ جان والا معاملہ نہ بن جائے۔

میں چونکہ شرق پور شریف میں اعلیٰ حضرت میاں شیر محمد صاحب شرقپوری کے برادر حقیقی حضرت میاں غلام اللہ صاحب ' ثانی لاثانی کی غلامی میں اپنے آپ کو دے چکا تھا، چاہتا تھا۔ کہ اپنے پیرو مرشد کے آگے اپنی تمنا کا اظہار کروں۔ مگر جرات نہ ہوتی تھی۔ غالباً" ۱۹۳۵ء کی بات ہے۔ تمناؤں اور آرزوؤں کے غنچے خود ہی پھول بن کر کھلنے کو بے قرار ہو گئے۔ میں حضور قبلہ ثانی صاحب کے پاس بیٹھا ہوا تھا کچھ تنہائی ملی تو ثانی صاحب خود ہی فرمانے لگے!

جلال الدین آج کیا بات ہے، اس قدر کیوں سہمے بیٹھے ہو؟

میں نے عرض کیا۔ حضور آپ جانتے ہیں میں حکمت کی دکان کرتا ہوں مگر کچھ مریض آس لے کر آتے ہیں، مگر میں انہیں نامراد واپس بھیج دیتا ہوں۔

کیوں؟ تم ان کا علاج کیوں نہیں کرتے؟

کیونکہ ان کے امراض پیچیدہ ہوتے ہیں۔ ان کے علاج بڑے بڑے حکماء کے پاس ہوتے ہیں۔

دیکھو جلال الدین علاج تو محض ایک بہانہ ہے۔ شفاء تو اللہ تعالیٰ نے

دینی ہوتی ہے۔ مریض آئے تو شرمایا نہ کرو۔ اپنے حساب کی دوا اسے دیدو۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے وہ شفاء پائے گا۔

اس دن سے حکمت کی کتابوں میں جن مرضوں کے لئے جو دوائیاں لکھی ہوتی ہیں میں انہیں استعمال میں لا رہا ہوں۔ جس کو دوائیں دیتا ہوں اس سے دعائیں لیتا ہوں۔

وفد نے جب بابا جلال الدین کی یہ باتیں سنیں تو دنگ رہ گئے۔ کہنے لگے۔

آپ کی حکمت کا انداز بالکل مختلف ہے۔ آپ کے پیچھے واقعتاً" اس ولی کامل کا ہاتھ ہے جس کی آپ غلامی میں ہیں جب تک ان کی نگاہ آپ کے حال پر ہے، یہ فیض جاری رہے گا۔

وفد چلا گیا۔ اس نے نہ جانے کس طرح کی رپورٹ تیار کی مگر بابا جلال الدین کو اس کے بعد کسی نے نہیں پوچھا۔

اب ایک دن ایسا آیا بابا جلال الدین کے پاس ایک شخص آیا کہنے لگا۔

ابا جی! میری بھینس بیمار ہو گئی ہے۔ اس کے لئے بھی کوئی دوائی عنایت فرمائیں۔

بابا جی نے فرمایا۔ کل آنا۔

بابا جی مطب سے فارغ ہو کر سیدھے شرق پور شریف میں آ گئے۔ حضور قبلہ ثانی صاحب سے ملے ۔ عرض کیا حضور! اب تو لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے مویشیوں کا علاج بھی کریں۔ میں ایک بندے سے کل کے لئے وعدہ کر آیا ہوں۔

حضور میاں صاحب نے بابا جلال الدین کو لنگر کھانے کو دیا۔ لنگر کے کچھ ٹکڑے بچ گئے۔ فرمایا جلال الدین یہی ٹکڑے اس بھینس کو کھلا دو۔

بابا جلال الدین یہ ٹکڑے لے کر چلا گیا۔ وعدہ کے مطابق وہ شخص آیا۔ عرض کیا۔ حضور! میری بھینس کو بڑی تکلیف ہے۔ اگر آج آپ نے دوائی نہ دی تو بیچاری مر جائے گی۔ میں غریب آدمی ہوں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ دودھ کا چھنا پی لیتے ہیں۔ میں توکل کا ڈرا ہوا ہوں۔

بابا جی نے آستانہ عالیہ شرق پور شریف کے لنگر کا ایک ٹکڑا دیا۔ فرمایا جاؤ اسے کھلاؤ۔ اور ظہر کے بعد آ کر مجھ سے ضرور ملنا۔

عصر کے قریب وہ شخص آیا تو بڑا خوش تھا۔ کہنے لگا۔ اس کی بھینس بالکل ٹھیک ہے۔

ولی کامل کے لنگر کا ٹکڑا بھینس کا درست ہو جانا ایک خاص وقت کی کرامت کی بات تھی۔ مگر بابا جلال الدین نے مویشیوں کے مرض کے لئے علاج حضرت میاں صاحب کے لنگر کے ٹکڑوں کو سمجھا۔ وہ جب بھی شرق پور شریف میں آتا لنگر کے بچے کھچے ٹکڑوں سے تھیلا بھر کے لے آتا۔ اور حاجت مندوں کو دے دیتا۔ دو طرفہ یقین کی بات تھی ہر بھینس ' گائے' گھوڑی' گھوڑے' بکری' بکرے کو لنگر کے ٹکڑے کھانے سے صحت ہو جاتی۔

کیا یہ تاثیر لنگر کے ٹکڑوں سے اب ختم ہو گئی ہے؟ نہیں حضرت قبلہ ثانی صاحب اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ بابا جلال الدین وفات پا گیا۔ اس کی حکمت ختم ہو گئی۔ اس کا مطب بند ہو گیا مگر لنگر کے ٹکڑوں میں یہ تاثیر اب بھی موجود ہے۔ اب بھی اس گھر میں یہ ٹکڑے تھیلوں میں بھر بھر کے جا

رہے ہیں اور لوگ ان سے فیض پا رہے ہیں۔

انہیں بابا جلال الدین سے متعلق ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے، کہ جن عورتوں کے ہاں بچے پیدا نہیں ہوتے تھے۔ وہ بھی آنے لگیں۔ تو بابا جی نے انہیں بھی تسلی کی خاطر دوائی دینی شروع کر دی۔ مگر ایسی عورتوں کو فائدہ نہ ہوا۔ وہ بچوں سے محروم رہیں ان کی گودیں خالی رہیں۔ بابا جی بڑے متفکر ہوئے۔

بارگاہ خداوندی میں گڑگڑاتے رہتے۔ عرض کرتے بار الٰہا! بابا جلال الدین کے دروازے سے ایسی عورتوں کو کیوں محرومی ہوتی ہے؟

آخر ایک دن یہ تمنا بھی لے کر بابا جی حضرت قبلہ ثانی صاحب کے ہاں حاضر ہوئے چہرے پر سے بشاشت غائب تھی۔ آنکھوں میں انکساری تھی۔ زبان پر التجائیں جلوہ گر تھیں۔ اور دل میں نہ جانے کون کون سی تمنائیں بات بن جانے کو بے قرار تھیں۔

حضور ثانی صاحب نے فرمایا۔ جلال الدین اب آپ کا مطب کیسے چل رہا ہے۔؟

الحمد للہ آپ کی دعاؤں سے ٹھیک طرح چل رہا ہے۔

اب تو مریضوں کو مایوسی نہیں ہوتی۔

نہیں حضور آپ کا فیض جاری ہے۔

میرا فیض جاری ہے! وہ کیسے؟ کام تو آپ کرتے ہیں۔ فیض آپ دیتے ہیں۔ مریض آپ دیکھتے ہیں۔ دوائی آپ دیتے ہیں۔ ناموری اور شہرت آپ کی ہوتی ہے لوگ تو آپ کے فیض کو تسلیم کر رہے ہیں۔

حضور! وہ ان کی بات ہے مگر میری بات یہ ہے کہ سارا فیض آپ کا

ہے۔

ثانی صاحب قبلہ مسکرا دیئے۔ فرمایا جیسا بھی ہے، اسے جاری رکھو۔

حضرت ثانی صاحب نے انہیں ایک پھول دیا اور فرمانے لگے۔ جلال الدین دیکھا یہ پھول۔ یہ پھول ریاض مدینہ کا پھول ہے۔ رحمت للعالمین کے شہر کا پھول ہے۔ اس پھول کا نام کچھ لوگ گل مریم لیتے ہیں یہ لے جاؤ۔ اسے اپنے کام میں لاؤ پانی جس میں ہم نے پھول رکھا ہے۔ اس پھول کی بند پتیوں کو کھولنے میں مدد دی ہے۔ پھول نے اس کے بدلے میں اس پانی میں وہ تاثیر دی ہے جو عورت اسے پی لے گی، اس کی گودی میں پھولوں جیسے بچے اللہ تعالی دے گا۔ واقعتاً" اس پھول نے اسی طرح اپنی تاثیر دکھائی جیسے حضرت قبلہ ثانی صاحب نے فرمایا تھا۔

راوی : بابا عبدالغفور ابن حکیم بابا جلال الدین عرف "اباجی"

ماہ نامہ نورِ اسلام

شرق پور شریف جنوری ۱۹۹۵ء

بہار و خزاں

☆ صاحب علم و فن کی قدر صاحب علم و فن ہی کرتا ہے۔

☆ مرد حق دنیوی رعب و جلال سے مرعوب نہیں ہوتا۔

☆ شراب خوری کا نتیجہ۔

☆ ولی کامل کی بارگاہ میں گستاخی کا انجام۔

سلطان ناصر الدین محمود بڑا نیک دل بادشاہ ہوا ہے۔ قرآن مجید کی کتابت کر کے اپنے ذاتی اخراجات پورے کیا کرتا تھا۔ ناصر الدین نے اپنے باپ سلطان التمش کے غلام غیاث الدین بلبن کو اپنا وزیر مقرر کیا پھر ایک دن تنہائی میں غیاث الدین بلبن کو بلایا اور کہا کہ میں تمہیں اپنا نائب مقرر کرتا ہوں، اور خدا کی مخلوق پر حکمران بناتا ہوں۔ تم کبھی کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے مجھے خداوند تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہونا پڑے۔

بلبن نے نیابت کے کچھ ایسے مضبوط سخت اور مستحکم اصول و قوانین بنائے کہ اصل اقتدار اس کے ہاتھ میں آگیا۔ امراء اور ارکان حکومت میں اتنی قدرت نہ رہی کہ وہ اس کے کاموں میں دخل دیتے۔

اب بلبن چاہتا تھا کہ ملک کے مختلف مفتوحہ حصوں کے حکمران اس کے اپنے عزیز ہوں۔ چنانچہ ۶۴۵ھ میں ناصر الدین نے بلبن کے مشورے سے ملتان پر حملہ کیا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بلبن نے اس علاقے کو خوب جی بھر کے تباہ و برباد کیا اور لوٹا۔ نیز ان باغیوں کو قتل کر دیا، جنہوں نے پچھلے سال مغلوں کی رہنمائی کی تھی ان کی بیویوں کو قید کر کے دہلی بھیج دیا۔ اسی طرح دوسری فتوحات کے سبب سے بھی بلبن کا وقار بادشاہ کی نظر میں روز بروز بڑھتا گیا اور یوں جب ناصر الدین نے ۶۶۴ھ میں وفات پائی تو بلبن بغیر کسی رکاوٹ کے بادشاہ بن گیا۔

بلبن کا محبوب ترین بڑا بیٹا شہزادہ محمد سلطان خان شہید جو قان ملک بھی کہلاتا تھا ملتان کا حاکم مقرر کیا گیا وہ تمام عمدہ صفات اور پسندیدہ عادات جو ایک شہزادے میں ہونی چاہئیں، شہزادہ محمد سلطان میں تھی۔ یہ شہزادہ عقل و خرد اور ہنرپروری میں بلاشبہ اپنے زمانے کا بہترین آدمی تھا اس کی محفل میں نامی گرامی علماء فضلاء اور بڑے بڑے شاعر شرکت کرتے تھے۔ اور اپنے ہمدردوں اور بہی خواہوں سے ہمیشہ لطف و کرم سے پیش آتا تھا۔ یہ شہزادہ اس قدر مہذب اور سلیقہ مند تھا کہ اگر تمام شب و روز کسی محفل میں بیٹھتا تو تب بھی اپنا زانو اونچا نہ کرتا تھا اور قسم کھاتے وقت ہمیشہ اس کی زبان پر لفظ حقا رہتا تھا

لکھنوتی کی کامیاب مہم کے بعد جب بلبن دہلی میں آیا اور شہزادہ اطلاع یاب ہو کر اپنے باپ سے ملاقات کرنے کے لئے ملتان سے دہلی آیا تو شہزادہ بہت گراں بہا اور اعلیٰ درجے کے تحائف بلبن کو پیش کرنے کے لئے لایا۔ بلبن اپنے بیٹے کی آمد اور سعادت مندی پر بہت خوش ہوا اور اسے شفقت پدرانہ سے مسرور و محظوظ کیا۔

ایک دن سلطان محمد خان دہلی کی ایک مجلس شعر و سخن میں بیٹھا تھا وہاں اتفاق سے حضرت امیر خسرو بھی تشریف لائے ہوئے تھے، امیر خسرو نے کلام سنایا تو ہر ایک شعر پر داد پائی شہزادہ نے امیر خسرو کی جولانی طبع، افکار آبدار، دقیقہ رسی، عظمت فکر، لطافت بیان، نغمگی، کلام میں گہرائی اور گیرائی، تازہ گوئی معنی آفرینی، تمثیل و تجسیم، خیالات و اعتقادات دیکھے تو دل و جان سے فریفتہ ہوگیا۔

امیر خسرو ایک بہترین شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ کے فدائی و شیدا تھے۔ آپ پر اپنے مرشد کی خاص نظر کرم تھی۔ بڑے خوش اخلاق اور خوش مزاج تھے آپ نے زندگی کا اکثر حصہ قیام و صیام اور تعبد و قرآن خوانی میں گزارا وہ مستقیم الحال صوفی بھی تھے۔

شہزادہ اس نابغہ روزگار اور وحید العصر پر دل و جان سے فدا تھا آگے بڑھا اور امیر خسرو کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ عرض کی۔ خسرو بابا میں چاہتا ہوں کہ آپ کو اپنے ہمراہ ملتان میں لے جاؤں اور آپ کی جودت بیانی سے لطف اٹھاؤں آپ سے روحانی فیض حاصل کروں۔

میں نے آپ کو روحانی فیض کیا دینا ہے؟ آپ کا تو شہر ہی روحانیت کا منبع ہے۔ حضرت صدرالدین عارف کے فیض کے چشمے وہاں سے پھوٹ رہے ہیں۔ ہاں میں بھی ان سے فیض یاب ہونے کو ضرور کبھی جاؤں گا۔

مگر کب؟ شہزادے نے پوچھا۔

جب وہاں کا آب و دانہ کشش کرے گا' امیر خسرو نے کہا۔

آپ کا آب و دانہ میں آج ہی ملتان بھیج رہا ہوں' بار خاطر نہ ہو تو میرے ساتھ ملتان چلے چلیں۔ وہاں کی علمی ادبی فضا یقیناً آپ کو پسند آئے گی۔

مگر ملتان بھی مجھے کس حیثیت سے جانا ہوگا؟

آپ جس حیثیت سے جانا چاہیں مجھے منظور ہوگا۔ آپ کے بغیر اب ملتان کی زندگی مجھے سونی سونی لگے گی ---- آپ میرا دل نہ توڑیں ---- فی الحال آپ مصحف دار اور دواتدار کی حیثیت سے میرے ساتھ جائیں گے۔ اس کے بعد جو عہدہ طلب کریں گے پیش کروں گا۔

شہزادے کا انکسار و اصرار اس قدر غالب آگیا کہ امیر خسرو آپ کے ساتھ چل دیئے اس طرح امیر خسرو ۱۲۷۹ء سے ۱۲۸۴ء تک ملتان میں رہے۔

ایسے ہی ایک بار ملتان میں معروف عالم دین اور عارف کامل حضرت شیخ عثمان ترمذی تشریف لائے ملتان کے اس حاکم کو پتہ چلا تو فوراً اس کی تعظیم اور خاطر تواضع کی غرض سے ان کی قیام گاہ پر پہنچا۔ نذرانے اور ہدیئے پیش کئے اور بڑی عاجزی سے

ملتان میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے لئے عرض گزار ہوا۔ اور یہ بھی کہا کہ اگر میری یہ گزارش قبول ہو جائے تو میں حکومت کے خرچ سے ایک خانقاہ تعمیر کرا دوں گا (تاریخ بتاتی ہے کہ یہ بزرگ مستقل طور پر یہاں نہیں ٹھہرے) آپ نے اس قیام کے دوران زیادہ وقت حضرت بہاؤالدین ذکریا رحمتہ اللہ علیہ کے صاحبزادے حضرت صدرالدین عارف کے ہاں گزارا۔ شیخ عثمان ترمذی' امیر خسرو' خواجہ حسن سنجری اور صدرالدین عارف کے اکٹھے ہونے سے اکثر راتوں کو محفل وجد و حال کا انعقاد ہوتا تھا۔ محفل کے سرور و کیف کے تذکرے جب شہزادہ محمد سلطان حاکم ملتان کے ہاں پہنچے تو وہ بھی شاہانہ کروفر کو چھوڑ کر بالکل ایک عام شہری کی حیثیت سے ان کی محفلوں میں پہنچ جاتا اسے جہاں جگہ ملتی وہیں بیٹھ جاتا اور علم و ادب کی اس محفل سے خوب لطف اٹھاتا عربی اور فارسی اشعار پر ان بزرگوں پر وجد طاری ہوجاتا تو شہزادہ بھی اہل محفل کا ساتھ دیتا اور دست بستہ کھڑا ہوجاتا۔ اضطرابی کیفیت طاری ہوجاتی اور آنکھوں میں آنسوؤں کی بارش ہونے لگتی۔

شہزادے کی بیوی سلطان رکن الدین ابراہیم کی حسین و جمیل بیٹی تھی، جو بڑی متقی اور پرہیز گار تھی۔ نماز و روزے کی پابند اور باحیا خاتون تھی۔

شہزادہ خوش طبع اور لطیف مزاج تو تھا ہی شراب کا رسیا بھی تھا اس کی شراب خوری کی عادت نے اسے تنگ مزاج اور زود رنج بنادیا تھا' شہزادے کی یہ عادت بیوی کو ہرگز پسند نہ تھی، وہ اکثر اسے اس عادت کو ترک کر دینے کی تلقین کرتی تھی۔ شہزادہ نشہ کی حالت میں جانے اسے کیا کیا کچھ کہہ جاتا تھا مگر وہ بڑے صبرو تحمل کے ساتھ سب کچھ برداشت کرتی رہی تھی۔

آخر ایک دن کیا ہوا۔ شہزادہ شراب چھوڑ دینے کی طرف راغب ہوچکا تھا مگر آج بیوی کا اصرار کچھ زیادہ ہی بڑھ رہا تھا' دونوں ایک دوسرے کے ارادوں سے غافل تھے

بات بڑھتی گئی اور غصہ کی حالت میں بیگم کی ساری محبتیں' اس کی خوبیاں' حسن و رعنائی کے جلوے' یکسر بھول گیا اور اس نے اس عفت شعار بیوی کو طلاق دے دی۔

بیوی نے جونہی طلاق کی آواز سنی سکتہ میں رہ گئی ایک حسرت بھری نگاہ سے اس نے اپنے میاں کو دیکھا اور گویا ہوئی میرے سرتاج آج آپ کو کیا ہوگیا ہے مگر دوسرے ہی لمحے دوسری طلاق کی آواز اس کے کانوں سے جا ٹکرائی اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگنے لگیں۔ جلدی سے خاوند کے قدموں پر جا گری۔

بس کریں اب انتہا نہ کریں۔ بیوی نے کہا۔ مگر وہ زبردست ہاتھوں نے اسے اٹھا کر پرے پھینک دیا۔ شہزادی منہ کے بل گری اور تیسری طلاق کی چھری اس کے کانوں میں جا لگی۔

اب کیا تھا دونوں میاں بیوی میں علیحدگی ہوگئی۔ بیوی اپنے باپ سلطان رکن الدین ابراہیم کے گھر چلی گئی اور شہزادے کے سر کا بھوت خوب قہقہے لگا کر ہنسا۔

یہ خبر پورے ملتان میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی پھر چند دنوں کے بعد دہلی میں اس کے باپ غیاث الدین بلبن کو بھی اس طلاق کا پتہ چل گیا۔ بلبن کا ایلچی ابھی وجہ نزاع پوچھنے ملتان میں نہیں آیا تھا کہ شہزادے کا غصہ کافور ہوگیا۔ وہ اپنے کئے پر پچھتانے لگا بیوی کی ایک ایک خوبی اسے یاد آنے لگی۔ اس کی محبت بھری ادائیں اسے تڑپانے لگیں۔ اس کے گھر کی بہاریں خزاں میں بدلتی ہوئی اسے نظر آنے لگیں۔ اسے اپنی ذات سے نفرت ہونے لگی۔ اب اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس کی بیوی پھر سے اس کے گھر میں بہار بن کے آجائے،

مگر ایسا ہونا اب ناممکن تھا۔ یہ اسلام کی حدوں کے خلاف تھا اسلام کے دائرے میں رہ کر اس کی حدوں کو پھلانگا نہیں جا سکتا وہ اپنی حرکت پر نادم تھا وہ اپنی بیگم سے معافی مانگنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے سسر سلطان رکن الدین ابراہیم کے قدموں پر سر رکھ کر

خوب رونا چاہتا تھا۔ وہ بیگم کے میکوں کے دروازے پر ایک مجنوں کی حیثیت سے بقیہ زندگی گزارنے کا آرزو مند تھا۔ ان خواہشات میں کس قدر صدق و خلوص تھا؟ وہ اس کا دل جانتا تھا۔ اگر وہ مخلص و صادق بھی ہے تو اسلام کے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کا پانا ایک قانون ہے جس کے بغیر مطلقہ بیوی دوبارہ مباح نہیں ہو سکتی۔

اگلی صبح شہزادہ اکیلا قاضی وقت اثیرالدین خوارزی کے دروازے پر کھڑا تھا شہزادہ بالکل اکیلا تھا۔ اس نے کسی امیر کو اپنے ساتھ نہیں لیا۔ کوئی حاجب تک اس کے ہمراہ نہیں تھا۔

قاضی نے شہزادے کو اس حالت میں دیکھا تو متعجب ہوا' یہ اسے علم تھا کہ اس نے اپنی بیگم کو طلاق دے دی ہے' مگر اس کے آنے کے مقصد سے بالکل ناآشنا تھا۔

قاضی نے سلطان کو اندر آنے کو کہا اور پوچھا میرے سلطان! آپ اس حالت میں خیریت تو ہے؟

اثیرالدین! شاید آپ نے سن لیا ہو کہ میں نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی ہے یہ طلاق غصہ کی حالت میں دی ہے کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ وہ پھر سے میری بیگم بن جائے؟ میں شراب کے نشہ میں دھت تھا۔ میں نے اس کی ساری خوبیوں کو یکسر فراموش کر دیا' میں نے اس کھلے ہوئے گلاب کی رنگین اور خوشبودار پتیوں کی قدر نہ کی۔

میرے سلطان! طلاق واقع ہوگئی ہے۔ آپ کی بیوی صرف ایک ہی طریقے سے آپ کی زندگی میں داخل ہو سکتی ہے کہ وہ عدت گزارنے کے بعد کسی دوسرے مرد سے شادی کرے' اس کی خلوت میں شب باشی کرے پھر وہ اپنی مرضی سے اسے طلاق دے' اس طرح دوبارہ عدت گزارنے کے بعد وہ تم سے نکاح کر سکتی ہے۔

مگر ایسا کون شخص ہو سکتا ہے' جو میری اس مشکل کو حل کر سکے؟

یہ آپ سوچیں' میں اس معاملے میں اپ کو کیا مشورہ دے سکتا ہوں؟

نہیں نہیں اثیرالدین! ایسا نہ کریں۔ میں ذہنی دباؤ میں ہوں' مجھے بیوی کی محبتیں پاگل کئے جا رہی ہیں' میری سوچ اور میری عقل بالکل میرا ساتھ نہیں دے رہی' آپ میری ضرور مدد کریں۔

میرے سلطان! حضرت صدرالدین عارف کو آپ جانتے ہیں ان کے پاس جائیں وہ یقیناً آپ کی مدد کریں گے۔

حضرت صدرالدین عارف' ولی کامل' مرد حق' قطب عالم کو کون نہیں جانتا؟ میں نے تو ان کی محبت سے بارہا فیض پایا ہے' ان کے اخلاق سے میں بے حد متاثر ہوں۔ میں ضرور ان کی بارگاہ میں جاؤں گا۔

مگر ایسے نہیں پہلے سسرال والوں کو قائل کرو کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح ان سے کرنے پر آمادہ ہوں۔

سلطان نے سارے معاملات طے کر لئے اور پھر اس کی مطلقہ بیوی کا نکاح صدرالدین عارف سے ہوگیا۔ حضرت صدرالدین عارف کی اس نئی بیوی نے آپ سے عرض کیا۔

حضور! خدا نے مجھ پر کمال کرم کیا ہے' اس نے آپ کی خدمت کرنے کے لئے میری ذات کو منتخب کیا ہے' میں آپ کی باندی بن کر رہنا چاہتی ہوں' آپ کے مہمانوں کا لنگر پکانا چاہتی ہوں' قبول کرلیا ہے تو اپنے سے جدا نہ کرنا۔ محمد سلطان ایک شرابی ہے' شراب کے نشے میں وہ مجھ پر ظلم کرتا ہے' اس ظالم کے پنجوں میں مجھے دوبارہ نہ دینا۔

تو کوئی فکر نہ کر تو اسی گھر کی عزت بن کر رہے گی۔ حضرت صاحب نے فرمایا۔

اس شادی کو ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ سلطان حضرت صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اس کی سابقہ بیوی کو طلاق دے کر فارغ کردیں تاکہ میں اس

سے نکاح کر سکوں۔

حضرت صاحب نے فرمایا وہ اب ہماری بیگم ہے ہم اپنی بیگم کو طلاق کس بنا پر دیں؟ اس سے تو کوئی قصور سرزد نہیں ہوا۔ وہ ایک عفت شعار بیوی اپنی عصمت کی حفاظت کرنے والی ہے،میری تابع فرمان ہے، گھر کی عزت ہے، میں اسے قطعاً طلاق نہیں دے سکتا۔

حضرت صاحب! آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں میری بیوی پر قابض ہوگئے ہیں۔

نہیں آپ غلط کہتے ہیں،آپ نے تو اپنی بیوی کو طلاق دے کر آزاد کر دیا تھا اس کی زندگی کو داغدار بنا دیا تھا اسے معاشرہ میں ذلیل و رسوا کردیا تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے دوبارہ عزت کا مقام دیا ہے تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ اس سے یہ مقام چھیننے کی کوشش کرو۔

حضرت صاحب! میرے دل میں آپ کا بڑا احترام ہے اسے دشمنی میں نہ بدلیں۔

میرا احترام تم خوب کر رہے ہو، میرے حرم میں ڈاکہ ڈالنا چاہتے ہو اور احترام کا دعوی بھی کرتے ہو،میں آپ کی کوشش کسی حال میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔

صدرالدین! اگر ایسا ہے تو میری سپاہ سے مقابلہ کرنے کو تیار ہوجاؤ۔

میں نے کیا تیار ہونا ہے تم زیادتی کرو گے تو اس زیادتی کا بدلہ میرے رب سے تمہیں مل کر رہے گا۔

سلطان یہ دھمکی دے کر چلاگیا اور حضرت صدرالدین عارف، اللہ کی عبادت میں مشغول ہوگئے۔

اس دن خبر ملی کہ تیمور خان اپنے بیس ہزار مغلوں کے زبردست لشکر کے ساتھ لاہور اور دیپالپور میں لوٹ مار کرتا ہوا ملتان کی جانب بڑھتا چلا آرہا ہے۔ محمد سلطان

خان شہید اگلے دن صبح سویرے اپنی فوجوں کو لے کر ملتان سے نکل کھڑا ہوا تاکہ تیمور خان کے ٹڈی دل لشکر کو راستے میں ہی تتر بتر کردے۔

ملتان کے قریب دریائے راوی کے کنارے دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا گھمسان کا رن پڑا، امیر تیمور کی فوجوں کے قدم اکھڑ گئے۔ سپاہی بدحواسی کے عالم میں پیچھے بھاگنے لگے خان شہید کے سپاہی لوٹ مار میں مشغول ہوگئے کہ ایک مغل شہزادے نے ایک جان گداز تیر اس چابکدستی سے مارا کہ خان شہید کے جسم کو چیرتا ہوا گزر گیا۔ خان شہید خون میں لت پت ہو کر زمین پر تڑپنے لگا۔ اس کے سپاہی بھاگ کر اس کے قریب آئے مگر اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ خان شہید کی فوجوں کو لینے کے دینے پڑ گئے۔ آزمودہ کار سپاہی مغلوں کے ہتھے چڑھ گئے وہ انہیں گرفتار کرکے اپنے ساتھ لے گئے۔

خان شہید جس نے ایک ولی اللہ کے دروازے پر جاکر گستاخی کی اسے جان سے مار دینے کی دھمکی دی۔ وہ خود موت کی آغوش میں چلا گیا۔

خان شہید کی وفات غیاث الدین بلبن کے لئے بڑی جانکاہ ثابت ہوئی وہ صاحب فراش ہوگیا۔ اور اسی غم میں اس کی موت واقع ہوگئی۔

حوالہ کے لیے

تاریخ ادبیات پاکستان و ہندوستان، تیسری جلد
پنجاب یونیورسٹی لاہور
تاریخ فرشتہ، از محمد قاسم فرشتہ
ماہنامہ نور اسلام، ستمبر ۱۹۹۲ء

عطائے تاج دکن

☆ ولی کامل ماہ و سال کے دبیز پردوں سے پرے تک دیکھ لیتا ہے۔

☆ تقدیر کا لکھا تلوار اور طاقت سے مٹایا نہیں جا سکتا۔

☆ ناامیدیوں کی تاریک راتوں میں ولی اللہ نے امید کی کرن روشن کردی۔

محمد تغلق بادشاہ بہت ہی بلند ہمت بادشاہ تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ ساری دنیا کے باشندے اس کے زر خرید غلام بن جائیں اور اس کے احکام کی تعمیل کریں۔ جیسے اسے سلطنت ورثہ میں ملی تھی ویسے ہی اسے مذہب اسلام ورثہ میں ملا تھا ـــــ اسلام کے ساتھ اس کا گہرا لگاؤ تھا اگر یہ لگاؤ اور تعلق نہ ہوتا تو عین ممکن تھا کہ وہ اپنے وسیع تر اختیارات کی وجہ سے فرعون بن جاتا اور خدائی کا دعوٰی کر دیتا اور پھر خدا ہونے کا بول بالا کرتا۔ وہ سخی بھی تھا اور سخاوت کے معاملہ میں حاتم طائی سے آگے بڑھ جانا چاہتا تھا۔ بزرگان دین کے ہاں آنا جانا رہتا تھا۔ وقت کے مشہور و معروف بزرگ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ سے اسے خاص عقیدت تھی۔ وہ آپ کی بارگاہ میں اکثر جایا کرتا تھا۔

اس دور میں ایک بڑا ہی معروف شخص گنگو برہمن تھا۔ اسے علم نجوم پر اس قدر عبور حاصل تھا کہ اس کی اکثر پیش گوئیاں سچ ثابت ہوا کرتی تھیں۔ اس کی اس شہرت کے باعث وہ بادشاہ محمد تغلق کے قریبی حلقوں میں داخل ہوا اور پھر خصوصی قرب حاصل ہوگیا' بادشاہ دن کے اوقات میں اسے اپنے پاس بلاتا اور ملکی معاملات کے اکثر فیصلے اس سے پوچھ کر کیا کرتا۔ بادشاہ اپنی عادت کے باعث بھی اور گنگو منجم کے اخلاص کے سبب بھی اپنی عنایات کی بارش اس پر کرتا رہتا اس وجہ سے اس کے پاس کافی مال و دولت جمع ہوگیا۔ اس کی دولت اور خوشحالی کی وجہ سے اسے نجی کاموں کے لئے ملازم

رکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ ایسے ملازمین میں ایک حسن نامی ملازم بھی شامل تھا۔ حسن کی زندگی کے آسمان پر غربت اور افلاس کے سیاہ بادل مستقل چھائے ہوئے تھے۔ وہ ملازم ہو کر بھی خوشحالی کی بارش کے قطروں کو ترستا رہا۔ ایک دن وہ اس قدر پریشان حال تھا کہ اپنی فکر معاش کا تذکرہ اپنے آقا گنگو منجم سے کیا۔

میرے آقا! میرے ہاتھوں کی لکیروں کا رخ کب تک مجھ سے روٹھا رہے گا؟ میرے بچوں کے ننگے پاؤں کو جوتے کب نصیب ہوں گے؟ عذرا بیٹی کے سر کو دوپٹہ کب ملے گا؟ اور میری بیوی کے گھریلو اخراجات کے شکووں میں کب کمی واقع ہوگی؟

یہ کہتے ہوئے حسن نے اپنا ہاتھ گنگو منجم کے آگے رکھ دیا۔

گنگو نے حسن کا ہاتھ دیکھا تو مسکرا دیا۔ کہا۔

حسن! تمہارے ہاتھ بڑے گندے ہیں لکیروں میں مٹی کی تہیں جمی ہوئی ہیں' خواجہ نظام الدین اولیاء کے ہاں جاؤ ان کے کنویں کے پانی سے ہاتھ دھو کر آؤ پھر تیرے ہاتھ کی لکیریں واضح ہوں گی اور کچھ حساب لگ سکے گا۔

زمانے کے حالات کا ستایا ہوا حسن حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی بارگاہ کی جانب چل دیا۔ اس کے پاؤں میں جوتا تک نہیں تھا۔ گلے کا پیوند لگا کرتا بھی جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اور سر کی پگڑی میلی کچیلی تھی۔

حسن بارگاہ کے قریب پہنچا تو لوگوں کا ایک ہجوم دیکھا۔ ہٹو ہٹو کی آوازیں آرہی تھیں چوبدار بڑے چوکس کھڑے تھے ـــــ پوچھنے پر اسے معلوم ہوا کہ بادشاہ محمد تغلق آقا حضور کے ہاں آیا ہوا ہے۔ وہ ایک عرصے سے خواجہ صاحب کے ہاں دعوت کھانے کا متمنی تھا۔ آج اس دعوت میں مدعو ہے۔

حسن یہ سوچتے ہوئے واپس جانے کو تھا کہ اس ہجوم بیکراں میں اس کی باری نہیں آسکتی کہ ایک شخص سے اس نے پوچھا کہ کیا خواجہ صاحب کی درگاہ میں ایسے ہی ہجوم ہر روز رہتا ہے؟ ـــــ اس نے کہا جی ہاں! مگر تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ ـــــ

تم کھانا کھانے کے لئے اندر کیوں نہیں گئے؟

میں؟ حسن نے کہا۔

ہاں! میں نے آپ سے ہی پوچھا ہے۔

میں تو ایک غریب آدمی ہوں۔ مجھے کون پوچھے گا؟

نہیں نہیں میاں! یہ حضرت خواجہ صاحب کی بارگاہ ہے یہاں بڑے چھوٹے سب برابر ہیں، امیر غریب میں کوئی امتیاز نہیں۔ امیر لوگ جوتیوں میں بیٹھنے کے خواہش مند ہوتے ہیں جبکہ غریبوں کو حضرت صاحب اپنے پاس جگہ دیتے ہیں۔ اور لطف کی بات یہ کہ ایک ہی دستر خوان پر سب کو ایک ساتھ کھانا ملتا ہے۔ لوگوں میں محبت بڑھانے کے لئے ایک ہی برتن میں کئی آدمی لقمے بھگو بھگو کر کھاتے ہیں۔ ایک ہی پیالے میں پانی پیتے جاتے ہیں۔ جوٹھے کھانے سے کوئی نفرت نہیں کرتا۔ میلے کپڑوں والوں سے دوری پسند نہیں کی جاتی۔ بس ہر شخص کی یہی آرزو ہوتی ہے کہ حضرت کے دستر خوان سے چند ٹکڑے نصیب ہو جائیں۔

حسن یہ باتیں سنتا رہا اس کی حیرانی میں اضافہ ہوتا گیا، مگر یقین اس سے دور رہا کہ اتنی شاہانہ دعوتیں غریبوں کی شرکت کیسے ہو سکتی ہے؟ وہ ابھی اس ادھیڑپن میں تھا کہ مہمان کھانا کھا کر جانے لگے۔ بادشاہ محمد تغلق بھی عام لوگوں کے لباس میں نکلا۔ اس کے چہرے پر شوخی نہیں، سنجیدگی جلوہ گر تھی۔ گردن کا اکڑاؤ ڈھیلا تھا، لبوں کے قہقہے مفقود تھے، سانسوں میں محبت کی خوشبو تھی، مگر حاشیہ برداروں میں گھرا ہوا تھا۔ اس ہجوم کا ایک ایسا دھکا حسن کو لگا کہ کئی گز پیچھے تک چلا گیا۔ پھر ایک دوسرے بھاگنے والے آدمی سے ٹکرا گیا اور گر پڑا۔ ایسی چوٹ آئی کہ ماتھے سے خون کا فوارہ بہہ نکلا، وہ زخم پر ہاتھ رکھ کے ہجوم سے الگ ہو کر کھڑا ہو گیا کہ اچانک ایک آدمی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔

کیا آپ کا نام حسن ہے؟

یہ آدمی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا ایک خادم تھا۔ حضرت نے اس خادم سے فرمایا کہ جاؤ باہر ایک شخص کھڑا ہے جو نہایت شریف باطن ہے اس کی شکل و صورت سے شرافت ٹپکتی ہے گویا کہ بالکل نیکی کی تصویر ہے اسے بلا لاؤ۔ خادم اسے پہلے بھی دیکھ کر واپس چلا گیا تھا، کیونکہ اسے اس کے ایسے کپڑوں میں دیکھ کر یقین نہیں آیا تھا کہ حضرت نے اسے طلب کیا ہے اور جا کر یہ عرض کیا تھا کہ دروازے پر کوئی بھی ایسا آدمی نہیں ہے۔ ہاں ایک مفلوک الحال اور پریشان صورت شخص البتہ کھڑا ہے۔ اس پر حضرت صاحب نے فرمایا تھا کہ ہاں وہی شخص ہے جو بظاہر فقیر معلوم ہو رہا ہے مگر اللہ کو بے حد پسند ہے۔

خادم نے حسن سے عرض کیا آپ کو حضرت صاحب بلاتے ہیں۔ حسن کے چہرے پر خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس کے جسم کا رو نگٹا رو نگٹا محو رقص ہو گیا۔ وہ تو محض حضرت صاحب کے کنویں پر سے ہاتھوں کو دھونے کے لئے آیا تھا، مگر حضرت صاحب کی بارگاہ میں حاضری کی طلب گاری اس کے لئے یقیناً خوشی کا باعث تھی۔

حسن آپ کی خدمت میں آیا، شرف ملاقات حاصل ہوا، حضرت صاحب نے اس پر بہت مہربانی کی اور اس سے پرسش احوال کی اور فرمایا حسن تم باہر کیوں کھڑے رہے سب لوگ کھانا کھا کر گئے مگر تم یہاں نہیں آئے؟ میرا تو روزہ ہے افطار کے لئے یہ ایک روٹی رکھی ہے اس سے میں آدھی آپ کو دے دیتا ہوں۔ آپ نے روٹی کے دو ٹکڑے کئے ایک کو افطاری کے لئے رکھ لیا اور دوسرا انگلی پر رکھ کر حسن کو دے دیا۔ فرمایا۔ حسن! دیکھنے کو یہ روٹی کا ایک ٹکڑا ہے مگر حقیقت میں دکن کی حکمرانی کا تاج ہے تیری عادتیں مجھے پسند آئی ہیں قوت برداشت، استقامت، ایمانداری، مخلوق خدا سے محبت اور عدل و انصاف پسندی وہ صفات ہیں جو ایک حکمران میں ہونی چاہیں مجھے ان سب کی جھلک بڑی واضح طور پر تجھ میں نظر آ رہی ہے۔ ان صفات کا انعام یہی ہے کہ دکن کی حکمرانی تجھے سونپ دی جائے۔ جاؤ اطمینان رکھو۔ محنت اور کشمکش کے بعد

دکن کا تاج ضرور تیرے سر پر رکھا جائے گا۔

حسن واپس آگیا وہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے کنویں پر سے ہاتھوں کو دھو کر کیا آیا؟ ہاتھوں میں فرائض حکمرانی لے کر آیا۔ گنگو منجم کا نوکر اپنی نوکری کی خدمت میں مصروف ہو گیا اور گاہے گاہے حضرت کی بارگاہ میں بھی جاتا رہا۔ ایک دن گنگو منجم نے حسن سے کہا۔

دیکھو بھئی! میری کچھ بنجر سی زمین نواح دہلی میں ہے اس کو تم کاشت کرو۔ یہ ایک جوڑی بیلوں کی بھی لے جاؤ۔ زمین کا سینہ چیرو اور اس کے اندر کے مدفون خزانے فصلوں کی صورت میں حاصل کرو تاکہ تمہاری یہ مفلوک الحالی تونگری میں بدل سکے۔

حسن خوش ہو گیا ---- وہ کھیتوں میں ہل چلانے گیا کہ اچانک اس کے ہل کا پھالا زمین کے اندر پھنس گیا۔ بیل رک گئے حسن نے لاٹھی مار مار کر انہیں ہانکا بیلوں کے زور لگانے کے باوجود وہ آگے نہ بڑھ سکے۔ حسن نے جب غور سے دیکھا تو ہل کا پھالا زمین میں مدفون ایک زنجیر سے اٹکا ہوا تھا۔ حسن نے کسی لے کر زمین کو کھودنا شروع کیا پھر اچانک ایک بڑا برتن اسے دکھائی دیا جس میں طلائی عہد کے سونے کے سکے اور اشرفیاں تھیں۔

یہ زر و مال کا خزانہ دیکھ کر حسن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ حسن کی آنکھوں کو یہ توفیق کیسے مل گئی کہ اتنی زیادہ دولت دیکھ سکیں؟ اس کی آنکھیں تو ہر صبح بس غربت دیکھنے کی عادی تھیں۔ آج یہ دولت واقعتاً اسے حیران کرنے والی تھی، اس قدر زیادہ دولت اس کی زندگی میں انقلاب پیدا کر سکتی ہے اب وہ یقیناً زندگی کی ساری سہولتیں حاصل کر سکتا ہے ایک اچھا مکان، اچھا فرنیچر، بیوی بچوں کے لئے اچھے اچھے کپڑے بنا سکتا ہے۔

مگر دوسرے ہی لمحے اسے خیال آیا کہ یہ دولت میری نہیں ہو سکتی یہ دولت اس کی ہے جس کی زمین ہے۔ زمین میری نہیں ہے۔ میں نے تو اسے صرف کاشت کرنا

ہے اس کی اوپر کی تہہ کی صلاحیتوں سے پیداوار حاصل کرنی ہے یہ رقم لینے کا حق میرا نہیں ہو سکتا اگر میں یہ دولت اپنے پاس رکھ لوں تو آقا کی دی ہوئی زمین کے مال میں خیانت ہے۔ پس حسن نے ساری دولت جوں کی توں گنگو کے مکان پر پہنچا دی۔ اور سارا ماجرا بھی بیان کیا۔

گنگو، حسن کی اس ایمانداری پر بہت خوش ہوا چنانچہ دوسرے دن جب وہ دربار شاہی میں محمد تغلق کے ہاں گیا تو اس نے اس واقعہ کو لفظ بلفظ بیان کیا۔ محمد تغلق کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اسے حسن کی ایمانداری، سچائی اور دیانت پر بہت حیرت ہوئی۔ اس نے گنگو سے کہا کہ وہ اس دیانت دار نوجوان کو میرے ہاں ضرور لائے، گنگو نے کہا۔ میرے بادشاہ! حسن بڑا غریب ہے۔ غربت کے پیوندوں نے اسے بالکل شرمیلا بنا دیا ہے۔ وہ احساس محرومی اور احساس کمتری کا شکار ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو چند دنوں کی تربیت کے بعد اسے آپ حضور کی خدمت میں پیش کروں۔

نہیں! تربیت کاہے کی؟ بادشاہ نے کہا۔ تم اس کی تربیت کیا کرو گے؟ اس کے تو ایمان نے اس کی تربیت خوب کر رکھی ہے۔

گنگو چاہتا تھا کہ چونکہ حسن کو اس نے متعارف کروایا ہے اس لئے وہ اسے صاف ستھرے لباس میں بھی لائے، تاکہ اس کا ظاہر بھی اس کے باطن کی طرح دلکش اور پسندیدہ بن جائے۔

گنگو نے اسے نہلوایا۔ اسے ایک بہترین لباس بنوا کر پہنوایا۔ اس کے بالوں میں کنگھی کی۔ اب تو گنگو حسن کو اس حال میں دیکھ کر خود بڑا خوش ہو گیا۔ حسن تو آج کسی بھی لحاظ سے شہزادوں سے کم نہ تھا۔ اس کا حسن جو گرد و غبار کی موٹی تہوں میں دبا ہوا تھا، آج نکھر کے پہلی بار گنگو کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ سچ مچ اسے شہزادہ کہنے کو جی چاہتا تھا۔ اور ایسے لگتا تھا کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے انعام نے اپنا اظہار کرنا شروع کر دیا ہے۔

وہ ایک مفلوک الحال حسن سے شہزادہ بن کر تخت دکن کی طرف گامزن ہوگیا تھا' محمد تغلق نے شہزادہ حسن کو دیکھا تو اس کا رنگ ڈھنگ اسے بے حد پسند آیا اور اسے ایک صدی امیروں کے زمرہ میں شامل کرلیا۔

ایک دن گنگو اور شہزادہ حسن بیٹھے تھے۔ گنگو حسن کے چہرے کو دیکھے جا رہا تھا۔ تابع فرمان حسن شہزادہ کے دل میں گنگو کا احترام اس طرح تھا۔ اس نے مرکز نگاہ بن جانے کا سبب پوچھا' گنگو مسکرا دیا اور مزید کہا۔

حسن! تم ایک بار ہاتھوں کی لکیروں کے بارے میں دریافت کیا تھا' آؤ آج آپ کے ہاتھوں کی لکیروں کا رخ دیکھیں۔

حسن نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

حسن! مبارک ہو۔ آپ کی قسمت کی لکیریں رفعت اور بلندی کی طرف بڑھتی ہوئی لگتی ہیں۔ تم ایک دن بڑے باعزت بنو گے' خدا کے کرم سے کسی اونچے عہدے تک پہنچ جاؤ گے۔ آج میں آپ سے دو وعدے لینا چاہتا ہوں کہ۔

۱۔ جب تم باعزت اور باکمال عہدے پر پہنچو تو میرے نام کو اپنے نام کا ایک حصہ بنا لینا

۲۔ خزانچی کے عہدہ پر مجھے اور میری اولاد کے سوا کسی اور کو نہ رکھنا۔

حسن نے اپنے محسن کے دونوں وعدوں پر مہر صداقت ثبت کی اور بغیر کوئی بلند عہدہ ملے اس نے اپنا نام حسن گنگو بہمنی لکھنا شروع کردیا۔

محمد تغلق نے جب دکن فتح کیا تو دیوگری شہر کو دولت آباد کا نام دیا۔ پھر اس کا انتظام سنبھالنے کے لئے اپنے استاد تغلق خان کو اس کا فرمانروا بنا دیا اور یہ حکم عام کر دیا کہ جس کا دل چاہے خواہ وہ منصب دار ہو خواہ نہ وہ تغلق خان کے ہمراہ دولت آباد میں قیام کر سکتا ہے۔ حسن گنگو کے لئے یہ موقع بڑا غنیمت تھا وہ ایک صدی امراء کے ہمراہ دولت آباد میں جا کر رہنے لگا۔

حسن گنگو کو جاگیر کے طور پر کونجی کا شہر اور رائے باغ کے کچھ حصے ملے۔ اب وہ دکن کی سرزمین پر جا بسنے کے بعد حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی بشارت بالکل سچ ہوتے نظر آنے لگی۔

بڑی قلیل مدت کے بعد دولت آباد کے ایک صدی امراء کے خلاف احمد لاچین نے غلط قسم کے الزامات لگا کر محمد تغلق تک پہنچا دیئے' ان الزامات کے باعث بادشاہ کا طیش میں آنا یقینی تھا۔ اور یہ بھی ممکن تھا کہ بادشاہ بغیر سوچے سمجھے بے گناہ لوگوں کو مروا دے۔ اس طرح تو ایک بھولی بھالی بکری کو چھری پکڑے قصاب کے حوالے کرنے والی بات ہوگی۔ انہوں نے احمد لاچین کو قتل کر دیا۔ دکن میں سرکشی اور بغاوت پھیل گئی۔ عمادالملک جو اب تغلق خان کے بجائے دولت آباد کا حکمران تھا' کو گرفتار کر لیا گیا اور دکن کی حکومت جو بادشاہ محمد تغلق نے ایک طویل محنت شاقہ سے حاصل کی تھی' تین ماہ کے اندر اندر مملکت دہلی سے باہر نکل گئی اور پورے دکن میں ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو محمد تغلق کا فرمانبردار کہلا سکے۔

دکن محمد تغلق کے ہاتھوں سے باہر ہوگیا مگر اب یہ سوال پیدا ہوا کہ دکن کا حاکم کون بنے۔ ظاہر ہے اس کے لئے ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو بغاوت کو فرو بھی کرے' سلطنت کے سارے کام بھی چلائے اور حکومت کو مستحکم بھی کرے۔ اس طرح طول طویل بحث کے بعد اسماعیل فتح خان کے ہاتھ میں دکن کی سلطنت کی باگ ڈور دے دی گئی۔ حسن گنگو کو ظفر خان کا خطاب ملا۔ گلبرگہ' رائے باغ' میرچل' کلیر اور پکری کے پرگنے اس کے قبضے میں آگئے۔

دکن کی حکومت دہلی کی سلطنت سے نکلی تو محمد تغلق کو بڑا قلق ہوا۔ وہ اپنی سپاہ کو لے کر دولت آباد کی جانب چل کھڑا ہوا۔ ناصر الدین شاہ تیس ہزار کے لشکر کے ساتھ شاہی فوجوں کے مقابل آیا۔ وہ ہر قیمت پر دولت آباد کے قلعہ کی حفاظت کرنا چاہتا تھا ادھر گلبرگہ کے قلعہ کی حفاظت کرنے کے لئے حسن گنگو بارہ ہزار کی مسلح فوج

کے ہمراہ آیا۔

ابتداء اگرچہ محمد تغلق کو کچھ بہت سی فوجی نوعیت کی کامیابیاں ہوئیں مگر آخر کار شاہی لشکر کے پاؤں اکھڑ گئے اور دریائے نربدا کے کنارے پر محمد تغلق کے آگے پیچھے کے لشکر پر حملہ کر کے تمام مال و متاع چھین لیا۔ اور وہ ہاتھی بھی روک لئے جو سونے اور اشرفیوں سے بھرے ہوئے تھے۔ حسن گنگو کو پتہ چلا تو اس غیبی امداد پر باغ باغ ہو گیا۔

اب حسن گنگو کا مقابلہ عمادالملک سے تھا۔ عماد الملک بڑا آزمودہ کار اور بہادر سپاہی تھا۔ جنگ کی ساری حکمت عملیوں کو خوب جانتا تھا۔ حسن گنگو نے عمادالملک کی فوجوں کے درمیان خندق کھودنی شروع کردی۔ عماد الملک کی فوجوں نے بھی ایسی ہی خندق کھودنے کے کام میں اپنے آپ کو مصروف کر لیا۔ اس طرح بیس دن تک خندقیں بنتی رہیں' اس دوران ناصرالدین شاہ اپنی پانچ ہزار سپاہ کے ساتھ حسن گنگو کی مدد کو آگیا جنگ ہوئی فریقین کے بہادر اور آزمودہ جنگجو اس معرکہ میں کام آئے۔ آخر تیروں کی بوچھاڑ اور تلواروں کی باڑ اس وقت دھیمی ہوئی جب یہ خبر بڑی سرعت کے ساتھ ہر ایک کان میں پڑی کہ عماد الملک مارا گیا ہے' شاہی فوج کو شکست ہوئی اور ساری فوج تتر بتر ہو کر ادھر ادھر منتشر ہو گئی۔

حسن گنگو اپنے کامیاب لشکر کے ہمراہ جب دولت آباد میں آیا تو سارے امراء نے پرتپاک خیر مقدم کیا۔ ناصرالدین شاہ آگے بڑھا اور عرض گزار ہوا کہ میں تو ایک گوشہ میں آرام و سکون کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں' صرف عوام کو خوش کرنے کے لئے یہ عہدہ میں نے قبول کیا تھا۔ اب اس سے سبکدوش ہوتا ہوں دکن کا تخت آپ کو مبارک ہو۔

اس طرح سلطان قطب الدین کی مسجد میں چار ربیع الثانی ۷۴۷ھ بروز جمعہ حسن گنگو بہمنی کے سر پر دکن کی سلطنت کا تاج رکھا گیا۔ دکن کی مملکت میں حسن گنگو

کے نام کا خطبہ پڑھا گیا۔ اس کے نام کا سکہ جاری ہوا۔

یہ حسن جو ایک مفلوک الحال شخص کی حیثیت سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی بارگاہ میں بڑا ہی عاجز ہو کر آیا تھا آج علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی کے نام سے حضرت صاحب کی بشارت کے مطابق دکن کا حکمران بن گیا۔ مگر اب حضرت نظام الدین اولیاء اس وقت نہ تھے۔ ان کا وصال ہو چکا تھا۔

مورخین کے بیان کے مطابق جونہی علاؤ الدین حسن گنگو بہمنی نے دکن کی سلطنت سنبھالی تو سب سے پہلے یہ حکم دیا کہ پانچ من سونا اور دس من چاندی شیخ برہان الدین دولت آبادی کے ذریعے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کی روح کو ایصال ثواب کے لئے غریبوں' یتیموں اور مسکینوں کو دے دی جائے۔

حوالہ کے لئے
تاریخ فرشتہ از محمد قاسم فرشتہ
تاریخ ادبیات پاکستان و ہندوستان' پنجاب یونیورسٹی

امدادی کتب
اخبارالاخیار از حضرت عبدالحق محدث دہلوی
جامع اللغات از عبدالمجید
ماہنامہ نور اسلام' جولائی ۱۹۹۲ء

دکان

☆ ولی اللہ کی بیعت کرنے سے یقین کی دنیا آباد ہوتی ہے۔
☆ تارک الدنیا ہونا اللہ کو پسند نہیں ہے۔
☆ حق حلال کی کمائی سے بنائی گئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔
☆ عقیدت کی جیت ہوئی تو عقل نے ہار مان لی۔
☆ ولی اللہ تصرفات کی ایک انوکھی داستان

تجارت اور کاروبار کرنے والے اکثر لوگوں کی مالی حالت دوسرے لوگوں یعنی ملازمت پیشہ اور زراعت کرنے والوں کی نسبت ہمیشہ بہتر رہی ہے۔ اور کاروبار کرنے کے میدان میں ہندو اور شیخ زیادہ رہے ہیں۔ ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی ابتدائی زندگی میں تجارت ہی کی ہے۔ آج لوگ کہتے ہیں کہ کاروبار اور تجارت میں جھوٹ اور فریب شامل کئے بغیر پیسہ نہیں کمایا جاسکتا، مگر ہمارے نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت کردیا کہ دیانت داری والا کاروبار ہمیشہ نفع بخش ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا مال تجارت لے کر شام میں گئے تو دیانت داری کی بنا پر ہی آپ ﷺ دگنا نفع لے کر واپس تشریف لائے۔

لاہور کے ایک شیخ حسن الدین نے بھی دسویں صدی ہجری میں جب اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تو اپنے آبائی پیشے کو اپنایا' غلہ فروشی کا پیشہ آپ نے اپنایا۔ دیانت داری کے اصول کو اپنے کاروبار میں شامل کیا۔ صحیح تول اور صحیح بول آپ کا بنیادی وصف تھا۔

اس کا اثر یہ ہوا کہ آپ بڑے مال دار تاجر بن گئے اور پرانے تجار سے کہیں آگے نکل گئے۔ یہاں تک کہ آپ نے غلہ تولنے کے لئے ترازو اور باٹ بھی سونے کے بنالئے۔ آپ اگر کسی اہم ضرورت کے باعث اپنی دکان سے اٹھ کر کہیں چلے

جاتے تو آپ کے سونے کے باٹ اور ترازو وہیں پڑے رہتے' آپ کی کوئی بھی شے کبھی گم نہیں ہوئی۔ اور نہ آپ کی چوری ہوئی ہے۔

ایک رات جو سوئے تو خیال آیا جس خدا نے مجھے اتنا کچھ دیا ہے اور پھر جو میری تجارت اور دکان کی حفاظت کرتا ہے، میں اس کے لئے کیا کرتا ہوں؟ یہ ٹوٹی پھوٹی نمازیں اور شکستہ روزے کیا خبر میرے منہ پر مار دیئے جائیں مجھے اس کی اطاعت کے بھی کچھ کام کرنے چاہییں۔ اس کے نبی کی اطاعت اسی کی اطاعت ہوگی۔

چونکہ شیخ حسن الدین پڑھا لکھا نہ تھا' علماء کی مجالس میں جانا شروع کردیا اور دین کی باتیں سمجھنے اور سیکھنے لگا۔ عبادات پر انعامات کی باتیں ہوتی تو دن رات اسی کام میں لگ جانے کو جی چاہتا۔ وعیدوں اور سزاؤں کی باتیں ہوتیں تو اس کی ہوش گم ہوجاتے۔

وہ ایک عجیب کشمکش کے عالم میں گرفتار ہوگیا کہ کیا کرے؟ کاروبار اور بیوی بچوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں نکل جائے۔ کسی درخت کی کھوہ یا پہاڑ کی غار میں جا بیٹھے فقیر بن جائے۔ جوگی بن جائے یا سادھو بن جائے۔ وہ اس فریب کی دنیا سے بہرحال نکل جائے۔

اس نے لوگوں کی زندگیوں میں جو جھانک جھانک کر دیکھا تو ظاہر و باطن میں بے پناہ تضاد نظر آیا۔ ظاہرداری اور دکھاوے بڑے حسین تھے مگر باطن بڑے گھناؤنے۔

آج شیخ حسن الدین نے دکان نہیں کھولی۔ اس نے ارادہ کرلیا کہ وہ راوی کے کنارے ایک جھونپڑی بنالے گا' وہیں چڑھتے اور غروب ہونے والے سورج کو دیکھے گا' رات بھر چاند ستاروں کی جمی محفلیں دیکھے گا' دریا کی موجوں کو باہم الجھتے ہوئے دیکھے گا اور پھر جس خدا نے اسے یہ مظاہر قدرت دیکھنے کی قوتیں دی ہیں اس کو ڈھونڈنے کی فکر کرے گا' وہ رات بھر روتا رہے گا۔ گڑگڑاتا رہے گا۔ قیام اور سجود میں ساری راتیں بسر کردے گا۔

اس نے دکان کو لات مار دی۔ ایک کھیس اپنے کندھے پر رکھا اور چل دیا۔ پھر یکدم رک گیا اور سوچنے لگا کیا اس کا طرز عمل خدا کو پسند آئے گا' اس کے کمسن اور شیر خوار بچے کس کے سہارے زندگی بسر کریں گے' اس کی بے بس بیوی کیسے زندہ رہے گی۔ جو لوگ اس کی دکان پر سے غلہ لینے آ رہے ہوں گے وہ غلہ کہاں سے لیں گے؟ نہ جانے کس کس خاندان کے افراد رات کو بھوکے سو جائیں اسے واپس لوٹ جانا چاہئے پھر خیال آیا جب حسن الدین زندہ نہ رہے گا اس وقت بھی تو لوگ بہرحال زندہ رہیں گے۔ مجھے اپنی منزل کا راستہ ناپتے رہنا چاہئے۔

وہ چلا اور چلتے چلتے پھر رک گیا۔ نہیں میں نے جس کاروبار حیات کو اپنا رکھا ہے' وہ بھی میری ایک ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داری میرے خدا نے مجھے سونپی ہے' اسے پوری نہ کرنا بھی تو خدا کی نافرمانی ہے۔ خدا کی نافرمانی کرنے والا شخص دریا کے کنارے کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔

ہزاروں لاکھوں میں کھیلنے والے تاجر پر یہ گھڑیاں بڑی بے بسی کی گھڑیاں تھیں اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ اور کیا نہ کرے۔ وہ کبھی آگے قدم بڑھاتا کبھی پیچھے ہٹنے لگتا۔ کہ اچانک اس کا ایک دوست سامنے سے آ گیا۔ دونوں گلے مل گئے۔

شیخ حسن الدین نے اس دوست سے پوچھا۔ پیارے دوست! کیا بات ہے؟ میں آپ کے چہرے کو زیادہ خوش گوار نہیں دیکھ رہا ہوں۔ کیا کوئی پریشانی ہے؟

نہیں کوئی ایسی بات تو نہیں ہے' بس دنیا کی بے ثباتی کا خیال آیا تو دنیا سے الگ ہو جانے کو جی چاہا ہے۔

نہیں دوست دنیا کے اندر رہ کر ہی کامیابی کے رستے کو طے کرنا بہتر ہے۔ دنیا سے الگ ہو جانا کوئی بہادری نہیں۔

نہیں۔ میرے دل کو سکون اور اطمینان حاصل نہیں ہو رہا ہے۔ دنیا میں بس جھگڑے ہی جھگڑے ہیں۔ عاقبت خراب کرنے والے ماحول سے الگ ہو جانا چاہتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں آپ کو محض سکون کی ضرورت ہے۔ اگر یہ بات سچ ہے تو آؤ میرے ہمراہ۔ ہم اس شخص کے پاس جاتے ہیں جس کی محفل میں سکون ہی سکون ہے۔

وہ کون ہے؟

میں جس بزرگ کی محفل کا ذکر کر رہا ہوں وہ حضرت سید شاہ جمال قادری سہروردی قدس سرہ کی ذات اقدس ہے۔ آپ صاحب حال و قال اور صاحب تصرف بزرگ ہیں۔ ان کی بارگاہ میں جو جاتا ہے خالی ہاتھ نہیں آتا۔ ان کے ہاں دنیا کی زندگی میں تقوٰی اور احتیاط پیدا ہوتی ہے۔ اور آخرت کی زندگی سنورتی ہے۔

شیخ حسن الدین کو اپنے دوست کی باتیں پسند آئیں اور اس کے ساتھ چل دیا۔ حضرت سید شاہ جمال کی بارگاہ میں پہنچے تو انہوں نے واقعی بڑا پر سکون ماحول پایا۔ آپ کے حلقہ میں جتنے لوگ بیٹھے تھے' سب دوزانو ہو کر بیٹھے ہوئے تھے' ان کے سر جھکے ہوئے تھے' سانس کی آواز تک نہ آ رہی تھی۔ پھر وہ باری باری اپنی اپنی احتیاجات کا ذکر کرنے لگے' اور آپ ان کے حق میں بارگاہ خداوندی میں بار بار ہاتھ اٹھا کر دعائیں کرنے لگے۔ بعض لوگ حلقہ ارادت میں شامل ہوئے۔ سب سے آخر میں شیخ حسن الدین آپ کے قریب ہوا' آپ نے فرمایا حسن الدین! تارک الدنیا لوگ خدا کو ناپسند ہیں۔ دنیا سے الگ ہو جانا کوئی اچھا فیصلہ نہیں ہے۔

شیخ حسن الدین حیران رہ گیا۔ کہ انہیں میرے ان فیصلوں کا پتہ کیسے چل گیا؟ تاہم کہنے لگے۔ قبلہ شاہ صاحب! میں غلہ فروشی کا کام کرتا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ میری دکان میں میرا غلہ پڑے پڑے غیر معیاری ہو جاتا ہے۔ میں اس کے وہی دام لئے جاتا ہوں جو معیاری غلے کے ہوتے ہیں' یا میرے باٹ روزبروز گھس گھس کر

اپنا اصل وزن کم کر رہے ہیں۔ میں انہی باتوں سے غلہ تولے جاتا ہوں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ترازو کا صحیح تول مجھ سے بے خبری میں نہیں تولا جاتا ہے۔ اس طرح یقینی بات ہے کہ حقوق العباد میں میری طرف سے خیانت ہو جاتی ہے، جو میری عاقبت برباد کرنے کے لئے کافی ہے۔ اگر میں کوئی کام نہ کروں تو پھر شاید میں محفوظ رہ سکوں۔

حسن الدین! اللہ تعالیٰ حقوق العباد اور حقوق اللہ کے بارے میں بڑی تلقین فرماتا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ حقوق اللہ تو معاف ہو جائیں لیکن حقوق العباد معاف نہیں ہوں گے۔ میں اس لئے دنیا سے الگ ہونا چاہتا ہوں۔ تاکہ حقوق العباد کا بوجھ اٹھانے سے بچا رہوں۔

حسن الدین! اس طرح تم اس ذمہ داری کے بوجھ کو اٹھانے سے انکاری ہو گے جس کو آسمانوں، زمین اور پہاڑوں نے نہ اٹھایا مگر انسان نے اٹھا لینے کی ذمہ داری سے فرار اختیار کرو گے تو انسانوں کے زمرے سے نکل جاؤ گے۔ یاد رکھو جس قدر ذمہ داری قبول کرلی۔ اب اگر ہمارا اس ذمہ داری کو نبھانا مشکل ہے اسی قدر اس کا اجر و ثواب زیادہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کے بیٹے کو انسان اسی لئے کہا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ پیار رکھے۔ انسان انس سے بنا ہے اور انس کے معنیٰ پیار کے ہیں۔ انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ مل کر ہی اچھی زندگی گزار سکتا ہے۔

تم دنیا سے کیا الگ ہو گے۔ انسانوں سے ہی الگ ہو جاؤ گے۔ جن لوگوں کی ذمہ داریاں آپ کے سپرد ہیں وہ تم پر بوجھ بنی رہیں گی۔

شیخ حسن الدین کی سمجھ میں شاہ صاحب کی باتیں آ گئیں۔ اور اس نے تارک الدنیا ہونے کا خیال دل سے نکال دیا۔ اس نے شاہ صاحب کے سامنے سر کو جھکا دیا اور ہاتھ باندھ دیئے۔ عرض کیا۔ حضور! مجھے بیعت فرما کر اپنے خدام میں شامل کریں۔

حسن الدین! ابھی آپ کے خیالوں میں پختگی نہیں پاتا۔ بیعت ہونے کے بعد بھی آپ اس خیال سے مغلوب ہو سکتے ہیں کہ تارک الدنیا ہونا بہتر ہے۔ یہ بات ہمارے عقیدے کے خلاف ہے۔ اور جو ہمارا بیعت ہو جائے اور اگر ایسے خیال سے مغلوب ہوتا ہے تو ہماری بدنامی ہے۔

جاؤ تم پہلے کاروبار کرو، اپنے غلہ فروشی کے کام کو سنبھالو، اور گاہے گاہے یہاں آتے رہو۔ جب تمہیں مستحکم پاؤں گا تب بیعت کروں گا۔ اور ہاں اپنے غلہ فروشی کے کام میں ایک کام کرو۔ تم اپنی دکان پر محض بیٹھے رہو، درود پاک پڑھتے رہو، جو گاہک آئے اسے غلہ خود تول کے نہ دو اسے کہو کہ وہ خود ہی تول لے اور دوسری بات یہ کہ اسے پیسے بتا دو مگر اس سے گن کر نہ لو، وہ جتنے پیسے کہتا ہے اس کا یقین کر لو۔

یہ بات حسن الدین کی سمجھ میں نہیں آنے والی تھی۔ وہ خوب سمجھتا تھا کہ اس طرح تو لوگ زیادہ غلہ تول کے لے جائیں گے۔ اور پیسے بھی گنتی میں کم دینے کی کوشش کریں گے۔ میری دکان تو چند دنوں میں ختم ہو جائے گی۔

شاہ صاحب نے فرمایا حسن الدین یاد رکھو ہمیں فریب اس لئے دیا جاتا ہے کہ ہم دوسروں کے ساتھ فریب کرنے والے ہوتے ہیں۔ اگر ہم دوسروں کو داؤ نہیں لگائیں گے تو ہم بھی دوسروں کے داؤ میں نہیں آئیں گے۔

شیخ حسن الدین چلا گیا۔ دوسرے دن اس کی دکان پر غلہ فروشی کا طریقہ بدل گیا۔ وہ ایک کونے میں درود پاک کا وظیفہ کر رہا ہے۔ لوگ خود چاول، دال، آٹا تولتے ہیں اور پیسے دے کر چلے جاتے ہیں اور وہ پیسوں کو گنے بغیر اپنی صندوقچی میں ڈال لیتا ہے۔

شام کو جب اس نے اپنی بکری اور بیچے گئے مال کا حساب لگایا تو اسے کوئی فرق محسوس نہ ہوا پہلے وہ دزدیدہ نگاہوں سے غلہ تولنے والے کو دیکھ لیتا تھا اور پیسے گننے پر

نگاہ رکھتا تھا۔ اب اسنے یہ احتیاط بھی ترک کر دی۔ اس طرح حسن الدین نے محسوس کیا کہ گاہک پہلے کی نسبت زیادہ آنے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ جب فصلوں کے پکنے اور تیار ہونے کے موسم آتے تو زمیندار اور کاشتکار خود ہی اس کے پاس آکر سودے کر جاتے۔ اور اپنی جنس اس کے پاس بھیج دیتے۔

حسن الدین مال دیکھتا اور بھاؤ طے کرتا اور کہتا کہ اپنے مال کی رقم تم خود ہی گن لو۔

دکان کا یہ انوکھا رنگ ڈھنگ دیکھ کر بد طینت لوگ اپنی خوئے بد کا اظہار کرنے لگے۔ وہ غلہ زیادہ تول لیتے اور پیسوں کی ادائیگی میں بھی کمی کر لیتے۔ اور بعض اوقات کھوٹے سکے حسن الدین کے غلے میں ڈال دیتے۔

شیخ حسن الدین نے یہ شکایت حضرت شاہ جمال سے کی۔

آپ نے فرمایا اس بات پر دل میلا نہ کرنا۔ جو شخص آپ کا غلہ تولنے میں خیانت کرے گا وہ خود گھاٹے میں رہے گا۔ جو زیادہ تول کر لے جائے گا اس کا غلہ اصل میں کم ہوگا اور جو پورا لے جائے گا حقیقت میں اس کا غلہ زیادہ ہوگا۔ اسی طرح غلہ کی قیمت میں جو کم رقم دے گا اس کا اس سے بڑھ کر نقصان ہوگا۔ اور یہ کھوٹے سکے جو تیرے پاس آتے ہیں انہیں دریا میں پھینک دو تاکہ زیادہ مسلمان دھوکا نہ کھائیں۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو لوگ زیادہ غلہ تول کرلے جاتے گھر جا کر ان کا غلہ کم ہو جاتا اور جو پورا پورا لے کر جاتے ان کا غلہ بڑھ جاتا۔ ایسے ہی جو کم رقم دینے کی کوشش کرتے ان کا نقصان اس سے زیادہ رقم کا ہو جاتا۔ اور کھوٹے سکے بھی آنے کم ہوگئے۔

شیخ حسن الدین مال دار تو تھا ہی اب اس کے مال میں اور اضافہ ہوگیا۔ اب پھر اس نے حضرت صاحبؒ سے بیعت ہونے کی خواہش کا اظہار کیا۔

آپ نے فرمایا حسن الدین! ابھی نہیں۔ ابھی تم میں بات ماننے اور یقین کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی۔

عرض کیا میرے یقین میں بڑی پختگی آگئی ہے۔ اب میں جان گیا ہوں کہ آپ کی بات مان لینے میں کوئی شخص گھاٹے میں نہیں رہ سکتا۔ میں آپ کی ہر بات ماننے کو تیار ہوں۔ آپ حکم دیں تو اپنی جان بھی قربان کر دوں۔

آپ نے فرمایا۔ حسن الدین! آپ کے نزدیک مال زیادہ قیمتی ہے یا جان؟

حضور! جان زیادہ قیمتی ہے۔

اور دیکھو! آپ نے ابھی ابھی کہا ہے کہ میں آپ پر جان بھی قربان کر سکتا ہوں تم اپنی جان مجھ پر قربان نہ کرو۔ مال جو اس سے کم قیمت کا ہے وہ مجھ پر قربان کر دو۔

حسن الدین کانپ گیا۔ نہ جانے شاہ صاحب کتنے مال کا تقاضا کریں' وہ تو بیچارہ چپ ہی ہو گیا۔

آپ نے فرمایا۔ بس حسن الدین! لگ گئی نہ' مہر آپ کی زبان پر۔ اسی لئے میں آپ کو ابھی بیعت نہیں کرنا چاہتا۔ یاد رکھو بیعت ہونے کے بعد مکمل سپردگی مرشد کے حضور کرنی ہوتی ہے۔ آپ تو جان قربان کرنے کا کہہ رہے تھے۔ اب مال کی قربانی بھی آپ کے لئے آزمائش بن گئی ہے۔ بیعت صرف نسبت بتانے کے لئے نہیں ہوا جاتا۔ بات مان جانے کے لئے بیعت ہوا جاتا ہے۔

حسن الدین کے سامنے اور اس کی موجودگی میں کئی لوگ شاہ صاحب کے بیعت ہوئے مگر کسی سے آپ نے یہ کچھ نہیں فرمایا جو حسن الدین کو فرمایا جا رہا ہے۔

پھر ایک دفعہ حسن الدین کے اندر کا انسان بیدار ہوا۔ اسے جان قربان کر دینے والی بات پر غیرت آئی۔ بولا۔ حضور فرمائیں کتنے مال کا آپ تقاضا کرتے ہیں؟ میں فدا کرنے کو تیار ہوں۔

جو کچھ آپ کے پاس ہے سب کچھ لینا چاہتا ہوں۔

کیا کچھ بیوی بچوں کے لئے رکھ سکتا ہوں؟

نہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سنت پر عمل کرنا ہوگا۔

حسن الدین کی آنکھ کھل گئی۔ خیال آیا اگر گھر کا سارا مال دے کر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر فاقے نہیں آئے تو حسن الدین بھی فاقوں سے بچا رہے گا۔

عرض کیا! جی حضور! سارا مال دینے کو تیار ہوں۔ اپنی قمیض کے بٹن تک بھی اتار کر دے دوں گا۔

شاہ صاحب مسکرا دیئے۔ فرمایا۔ یہ جو آپ سونے کے باٹ اور ترازو اپنے غلہ فروشی کے کام میں استعمال کر رہے ہیں انکا کل وزن کس قدر ہے۔

حسن الدین نے عرض کیا۔ حضور! میرے یہ باٹ اور ترازو کا کل وزن ۲۴ سیر ہے۔ مالیت کیا ہوگی؟

حضور! یہ ۹۸۰ تولے بنتے ہیں۔ اور سونے کا بھاؤ اس وقت ۲۵ روپے تولہ ہے۔ اس حساب سے کوئی ساڑھے چودہ ہزار روپے کے قریب بنتی ہے۔ (موجودہ نرخ سے اس قدر سونے کی مالیت ستاون لاکھ کے قریب ہوگی)۔

میں یہ باٹ اور ترازو ہی آپ سے لینا چاہتا ہوں۔ بتاؤ اس قدر سونا دینے کا حوصلہ رکھتے ہو؟

جی آپ اجازت دیں تو ابھی آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں۔

نہیں۔ مجھے اس سونے کی ضرورت نہیں۔ مگر میں جہاں کہتا ہوں وہاں دینا ہوگا۔

ٹھیک ہے، دے دوں گا جسے آپ فرمائیں گے اس کے گھر میں پہنچا کے آؤں گا۔

تو سنو! اتنا آج رات کے اندھیرے میں اپنے سارے باٹ اور ترازو ایک بوری میں بند کر کے دریائے راوی کی موجوں کے سپرد کر دینا۔

مگر حضور! اتنا زیادہ سونا دریا میں بہا دوں؟ اگر غرباء میں بانٹ دوں تو یہ اس سے بہتر ہوگا۔

بہتر کیا ہے؟ اور بہتر کیا نہیں ہے۔ اسے میں جانتا ہوں آپ کا کام حکم ماننا ہے۔

بتاؤ ایسا کر سکتے ہو؟

جب آپ کا حکم ہے تو یہ بھی کرنے کو تیار ہوں۔

بس آپ جائیں آج رات کو یہ باٹ اور ترازو دریا کے حوالے کر کے مجھے کل بتانا کہ آپ نے یہ کام کر دیا ہے؟

شیخ حسن الدین چلا گیا۔ مگر رستے میں ہر ہر قدم پر سوچتا رہا کہ شاہ صاحب نے یہ سونا دریا میں پھینک دینے کو کیوں کہا؟ کہیں ان کا عقیدہ پانی کی پوجا کرنے والوں کا تو نہیں ہے؟ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سونے کے اس طرح میرے استعمال کو ناپسند کرتے ہوں اور بطور تنبیہہ مجھے اس سونے سے محروم کر دینا چاہتے ہوں۔ یہ بھی خیال آیا کہ رات کے اندھیرے میں مجھے سوائے اللہ کے کون دیکھنے والا ہوگا؟ اگر میں یہ سونا دریا میں نہ پھینکوں اور مستحقین کو دیدوں تو وہ یقیناً کئی دنوں کے فاقوں سے بچ سکتے ہیں۔ اور پھر شاہ صاحب سے کہہ دوں کہ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کر دی ہے تو یقیناً میری بات سچ تسلیم کر لیں گے۔ اور پھر یہ بھی خیال آیا کہ نہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے۔ جھوٹ بول کر مرشد کو دھوکا دینا درست بات نہیں ہے۔

وہ اسی ادھیڑپن میں جا رہا تھا۔ کبھی دل قابو میں آتا اور کبھی بے قابو ہو جاتا۔ گھر پہنچا تو چپ نے زبان کو زنجیر ڈالے رکھی' شاہ صاحب کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آنے والی تھی اور نہ سمجھ میں آرہی تھی۔

سورج نے اپنا سفر جاری رکھا اور دن کے اجالے کو دامن میں ڈال کر مغرب کے افق کے پیچھے چھپ گیا۔

شیخ حسن الدین اٹھا‘ اس نے بوری میں ترازو اور باٹ ڈالے‘ اس کے منہ کو باندھا اور سر پر اٹھائے دریا راوی کی جانب چل دیا۔ اب بھی اس کی یہی کیفیت رہی اور وہ بار بار سوچتا کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔

لوگ تو دولت کے حصول میں دعائیں مانگتے ہیں اور میں اللہ کی دی ہوئی دولت کو ایک بندے کو خوش کرنے کے لئے دریا میں پھینکنے جا رہا ہوں۔

آخر وہ سرکنڈوں کے بیلے میں سے گزر کر دریا کے کنارے تک پہنچ گیا وہ پھر خیالوں کی دنیا میں کھو گیا۔ عقل نے بار بار اس سے کہا کہ وہ اپنے فیصلے پر ایک بار پھر نظر ثانی کرے۔ مگر عقیدت نے کہا عقل کا دامن چھوڑ دے‘ یہ تو رکاوٹ پیدا کرنے والی ہے۔ پھر دوسرے لمحے دھڑام سے کوئی چیز دریا میں گری۔ دریا کے موجوں میں ہل چل سی مچ گئی۔ اور یہ اس وقت ہوا جب حسن الدین نے اپنے سر پر کی بوری کو دریا میں پھینک دیا تھا۔ اس کا سر چودہ سیر سونے کے وزن سے ہلکا ہو گیا۔ اس کی عقیدت جیت گئی اور اس کی عقل نے شکست تسلیم کر لی تھی۔

پھر الٹے قدم حسن الدین شیخ واپس گھر آ گیا۔ نماز پڑھی اور سو گیا ایسے سویا جیسے اس کے ہاتھوں سے کوئی انوکھا کام ہوا ہی نہیں۔

نیند آجائے تو رات بڑی جلدی سے گزر جاتی ہے۔ آج گہری نیند اور پر سکون نیند کی وجہ سے رات بہت جلد ختم ہو گئی۔ حسن الدین شیخ جب اٹھا تو اسے محسوس ہوا کہ وہ ابھی سویا تھا اور ابھی صبح ہو گئی۔

آج حسن الدین بڑا خوش تھا۔ اگرچہ اس نے وہ کام کیا تھا جو عقل اور فکر کے بالکل خلاف تھا۔ مگر اس شخص کی اطاعت میں کیا جسے لوگ ولی اللہ کہتے ہیں۔ اب وہ چاہتا تھا کہ صبح کی نماز ادا کرنے کے بعد حضرت شاہ جمال کی بارگاہ میں جائے اور یہ بتانے میں فرحت حاصل کرے کہ اس نے ان کا حکم بجالانے میں کوئی خیانت نہیں کی

اس نے ایسا ہی کیا نماز سے فارغ ہونے کے بعد جلدی سے مسجد سے نکل گیا۔ اور تیز قدموں کے ساتھ حضرت سید شاہ جمال کی خدمت اقدس میں حاضر ہو گیا مگر اس کے جانے سے پہلے کئی اور لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہو چکے تھے۔ چونکہ وہ ایک بہت بڑا کام کر کے آیا تھا‘ اس لئے وہ ذرا نمایاں ہو کے بیٹھنا چاہتا تھا تاکہ حضرت صاحب اسے جونہی دیکھیں اپنے پاس بلا لیں اور اس کام کے بارے میں پوچھیں جو آپ نے میرے سپرد کیا تھا مگر اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی۔ وہ جہاں بیٹھا وہ جگہ حضرت صاحب سے کافی دور تھی۔ اس لئے وہ لوگوں کے پیچھے چھپ سا گیا۔ اگر وہ اپنا سر ذرا بلند کرنے کی کوشش کرتا تو اس کے پیچھے بیٹھا ہوا شخص اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر نیچے ہو جانے کو کہتا۔

حضرت صاحب کی اس بے توجہی پر حسن الدین کی کشت دل میں پھر عجیب طرح بیج بوئے جانے لگے۔ میں ہزاروں روپے کی جائیداد شاہ جمال کے کہنے پر دریا میں بہا آیا ہوں مگر وہ ہیں کہ ایک نظر مجھے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے‘ کوئی شاباش نہیں دی جا رہی ہے۔ کسی کے آگے میرے اس کام کا ذکر نہیں کیا جا رہا ہے۔ پھر اچانک اس کی توقع کے خلاف ایک آواز اس کے کان سے ٹکرائی‘ کہ یہاں کہیں شیخ حسن الدین بیٹھا ہے اسے اس کی دکان پر جلدی بھیج دیں۔ اس سے ملنے والا کوئی شخص اس کی دکان پر انتظار کر رہا ہے۔

شیخ حسن الدین کھڑا ہو گیا۔ وہ آگے بڑھ کر شاہ صاحب کی دست بوسی کرنا چاہتا تھا۔ مگر آپ نے لوگوں پر سے پھلانگ کر آنے سے اسے روک دیا۔ فرمایا جلدی کرو۔ اپنی دکان پر جاؤ۔ کوئی بندہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔

حسن الدین کو تو پچھتاوا سا لگ گیا۔ ایسے لگتا ہے شاہ صاحب نے مجھے جس بہت

بڑے کام سے متعلق کہا تھا وہ تو آپ کو یاد بھی نہیں ہے۔ نہ جانے اس وقت کس خیال میں بیٹھے تھے؟ کہ مجھے سونا برباد کر دینے کا حکم فرما دیا۔ اور میں بھی کتنا بے وقوف ہوں کہ بغیر سوچے سمجھے اتنی بڑی مائع، مائع میں بہا دی۔

اب فرما رہے ہیں۔ اپنی دکان پر جاؤ۔ کوئی شخص آپ کا منتظر ہے۔ کون ہو گا میرا انتظار کرنے والا؟ یہی کوئی دال آٹا لینے والا ہو گا اور کس نے ہونا ہے؟ پہلے مجھے کون سا تختہ لگ گیا ہے جواب نہ لگ جائے گا۔

اسے اتنا صدمہ چودہ سیر سونا دریا میں پھینک دینے سے نہ ہوا تھا جتنا اسے اس کے بارے میں پوچھے بغیر محفل میں سے اٹھا دیا جانے سے ہوا ہے۔

بہرحال جب وہ اپنی دکان پر آیا تو وہاں واقعتاً ایک سادہ اور گنوار سا آدمی دکان کے تھڑے پر بیٹھا تھا۔ اور اس کے پاس ایک ایسی بوری رکھی ہوئی تھی جس میں کوئی چیز تھی۔ اور وہ بوری بھیگی ہوئی تھی۔

جونہی شیخ حسن الدین کو اس شخص نے دیکھا کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے سر کو جھکا دیا۔ عرض کرنے لگا۔

حضور! میں ایک مچھیرا ہوں۔ مچھلیاں پکڑنا میرا کام ہے۔ آج صبح سویرے جب میں نے مچھلیاں پکڑنے کے لئے دریا میں جال ڈالا اور آگے بڑھا تو یہ بوری میرے پاؤں سے لگی میں نے اسے پکڑ کے باہر نکال لیا۔ اس کا منہ کھولا تو باٹ اور ترازو دیکھے جو سونے کے ہیں۔ میں فوراً سمجھ گیا کہ یہ وہ سونے کے باٹ ہیں جو آپ اپنی دکان پر غلہ فروخت کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔ میں انہیں اٹھا کر سیدھا آپ کے پاس چلا آیا ہوں۔

یہ اپنا مال سنبھالیں اور مجھے جانے کی اجازت بخشیں۔ شیخ حسن الدین کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ ترازو اور باٹ وہی تھے جو اس نے رات کے اندھیروں میں دریا

کی موجوں کے سپرد کئے تھے۔ اس نے بوری کو کھول کر جو دیکھا تو کسی بھی بڑے تا چھوٹے باٹ کی کمی نہ تھی۔ شیخ حسن الدین حیرانی کی تصویر بن گیا۔ سوچنے لگا ایسے بھی دیانت دار لوگ ابھی موجود ہیں، جو غربت کے باوجود دوسروں کے مال پر نظر نہیں رکھتے اور نہ ہی اپنے تصرف میں لاتے ہیں۔

شیخ حسن الدین نے اس مچھیرے کو کچھ کھانے پینے کی دعوت دی مگر اس نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا۔ ایسا کرنے سے اس کا مزید وقت بیت جائے گا۔ کہا کہ میں ایک مزدور آدمی ہوں، کچھ مچھلیاں ہاتھ لگ گئیں تو بال بچوں کی دال چپاتی چل جائے گی۔ میرا جال وہیں پڑا ہے کوئی جانور اسے خراب نہ کر دے۔ بس جانے کی اجازت فرمائیں۔

اور وہ مچھیرا چلا گیا۔

شیخ حسن الدین نے اس بوری کو دکان میں پھینکا اور پھر حضرت شاہ جمال کی بارگاہ میں چلا گیا۔ آج وہ اپنے یقین کی دولت سے مالا مال تھا۔ یہ خانقاہ میں پہنچا تو دروازے میں پڑی ہوئی جوتیوں میں بیٹھ گیا۔ لوگوں نے اسے آگے جانے کے لئے جگہ بنا دی۔ مگر اس کی آنکھوں میں آنسو ہی آنسو تھے۔ کہنے لگا۔

میں تو یہاں بھی بیٹھنے کے لائق نہیں ہوں۔ اس جوتوں والی جگہ میں بٹھا لیا جاؤں تو میرے لئے سعادت ہے کہ اچانک اس کے کانوں میں حضرت شاہ صاحب کی آواز آئی۔ شیخ حسن الدین کو آگے آنے دو۔

شاہ صاحب نے شیخ حسن الدین کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ حسن الدین شیخ روئے جا رہا تھا۔

آپ نے فرمایا حسن الدین کیا بات ہے؟ یہ رو رو کر اپنا حال کیوں خراب کر رہے ہو۔

عرض کیا حضور! میں آپ کے مقام سے آگاہ نہیں تھا میں عقل کے پندھار میں

تھا۔ میری عقل نے ہر بار میری غلط رہنمائی کی ہے۔

نہیں، حسن الدین عقل اچھی ہے، عقل والے حق و باطل میں تمیز کرتے ہیں اپنے خالق کو پہچان لیتے ہیں، خالق کی باتوں کا انہیں یقین ہو جاتا ہے۔

کچھ بتاؤ تو سہی آخر اتنی جلدی تم واپس کیوں چلے آئے۔

حضورا آپ نے فرمایا اپنی ترازو اور باٹ جو کہ سونے کے ہیں، کو دریا میں پھینک دو۔

میں نے اس پر عمل کیا۔ مگر جب آپ نے مجھے دکان پر واپس بھیجا تو وہ میری ترازو اور باٹ لئے ایک شخص کھڑا تھا۔ یہ سب کچھ کیا ہے؟ اس میں کیا راز پنہاں ہے؟

دیکھو حسن الدین آپ کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ حق حلال کی کمائی ضائع نہیں ہوتی اور مجھے آپ کی درستی کا امتحان لینا تھا۔

اب اگر آپ دکان کھولے رکھیں آپ ہوں یا نہ ہوں، آپ کی دکان چلتی رہے گی۔ آپ کی کسی چیز کو چور لے نہیں جائیں گے۔

اس کے بعد شیخ حسن الدین نے حضرت شاہ جمال کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ آپ نے غلہ فروشی کے کاروبار کو جاری رکھا آپ کی دکان کھلی ہے۔ لوگ آتے ہیں۔ خود ہی وزن کر کے چیز لے جاتے ہیں۔ اور اس کے پیسے ان کے غلے میں ڈال دیتے ہیں۔ آپ ہوں یا نہ ہوں آپ کی دکان چلتی رہتی ہے۔

اب آپ اکثر عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے ہیں اور سلوک کی منزلیں طے کرتے چلے جا رہے ہیں۔ پھر آپ نے اپنے مرشد سے خلافت پائی۔ اور حضرت شیخ حسن کنجدی لاہور کے نام سے شہرت پائی۔ آپ کا وصال ۱۰۱۲ھ میں ہوا اور آپ کا مزار لاہور میں زیارت گاہ خاص و عام ہے۔

مضمون کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے مدد لی گئی۔

۱۔ سیارہ ڈائجسٹ اولیاء کرام نمبر

اولیائے برصغیر پاک و ہند، از مرزا محمد اختر دہلوی

ماہنامہ نور اسلام، شرقپور شریف، دسمبر ۱۹۹۷ء

پیکر خودداری

☆ فقر اختیار کرنے والوں کی پہلی سیڑھی ترک دنیا ہے۔
☆ حکمرانوں کا مقام ولی اللہ کی نگاہ میں
☆ مرد کامل امراء کے درباروں میں جانا اپنی توہین سمجھتا ہے۔
☆ مرشد کامل کے عمل کی تقلید اللہ والوں کو بڑی پسند ہے۔

یہ عباسی خلیفہ المنصور کے اقتدار کا ابتدائی دور تھا' شہر بغداد کی ابھی بنیاد نہیں پڑی تھی۔ حکومت کا پایہ تخت اس وقت ہاشمیہ تھا' جو کوفہ کے قریب چند میل کے فاصلے پر تھا' ہاشمیہ میں ایک گویا آیا جو فن موسیقی سے پوری طرح آگاہ تھا' وہ گویا ہاشمیہ کے ایک بازار میں غزل گانے لگا' لوگ اس کے گرد جمع ہوگئے۔ اور اسے ہر شعر پر خوب داد ملنے لگی۔ وہ جھوم جھوم کر گا رہا تھا اور لوگ جھوم جھوم کر سن رہے تھے۔
گویئے نے جب یہ شعر پڑھا جس کا مفہوم یہ تھا کون سا چہرہ خاک میں نہیں ملا ہے

اور کون سی آنکھ زمین پر نہیں بہی ہے۔

تو بے شمار لوگوں کی توجہ کا مرکز نہ بن سکا اور نہ ہی کھل کے داد مل سکی۔ مگر ایک نوجوان اس شعر پر پھڑک اٹھا' اس کی واہ' واہ' واہ کی بجائے گریہ و زاری تھی' اس نے اپنے ہوش و حواس گویئے کی نذر کر دیئے۔ وہ گر گیا۔ اس کی حالت غیر ہوگئی' لوگوں میں ہلچل مچ گئی' اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے گئے' کافی دیر کے بعد اسے ہوش آیا۔ وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ چل بھی نہیں سکتا تھا۔

لوگوں نے اس سے پوچھا تم کون ہو؟ اور کہاں رہتے ہو؟

اس نوجوان نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ میرا نام داؤد ہے۔ اور قبیلہ طے سے تعلق رکھتا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا تمہیں کہاں جانا ہے؟

نوجوان نے کہا۔ کیا تم لوگ حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے نام سے واقف ہو؟

لوگوں نے کہا۔ ہاں ہاں انہیں کون نہیں جانتا۔

نوجوان نے کہا۔ بس مجھے ان کے پاس لے چلو۔

اس طرح یہ نوجوان حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ کے پاس پہنچ گیا۔

امام ابو حنیفہ نے پوچھا۔ نوجوان! میں نے آپ کو پہچانا نہیں ہے؟

نوجوان نے کہا۔ ہاں آپ یقیناً مجھے نہیں پہچانتے' مگر میں آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔

امام صاحب نے پوچھا مجھ سے کوئی کام؟

نوجوان نے عرض کیا۔ ابھی ابھی بازار میں میں نے ایک گویئے سے یہ شعر سُنا

کون سا چہرہ خاک میں نہیں ملا۔
اور کون سی آنکھ زمین پر نہیں بہی ہے۔

اس شعر نے میری حالت غیر کر دی' میں بے ہوش ہوگیا تھا۔ لیکن اب مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میں اپنے ہوش میں آچکا ہوں۔

امام صاحب نے پوچھا۔ گویا اب تجھے عرفان ذات حاصل ہو رہا ہے؟

نوجوان نے جواب دیا شائد!

امام صاحب نے پوچھا۔ تو میرے پاس کیوں آیا ہے؟

نوجوان نے عرض کیا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اب مجھے کیا کرنا ہے۔

امام صاحب نے فرمایا۔ گوشہ نشینی اختیار کر لو۔ فقر کی پہلی سیڑھی ترک دنیا ہے۔

اس نوجوان نے دنیا چھوڑ دی۔ اور گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ اور بیس سال تک

حضرت امام ابو حنیفہ کا شاگرد رہا۔ اور پھر حضرت امام صاحب کے ارشاد پر ہی اس نوجوان نے وقت کے مشہور صوفی حضرت حبیب رائی سے بیعت کی۔ اور روحانیت کی دنیا میں حضرت داؤد طائی کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کا یہ حال تھا کہ لوگوں کی سن تو ضرور لیتے تھے لیکن خود بہت کم بولتے تھے' آپ کو ورثے میں صرف بیس دینار ملے تھے' آپ نے وہ زندگی بھر کے لیے محفوظ کر لیے۔

ایک دن آپ روٹی کھانے لگے۔ تو رونے لگے' وقت کے صوفی حضرت ابوبکر عیاش رحمتہ اللہ علیہ کے پوچھنے پر فرمایا۔ اگر روٹی کھانے کا مسئلہ نہ ہوتا تو یہ وقت بھی عبادت میں ہی صرف ہوتا۔ مجھے یہ سوچ سوچ کر دکھ ہو رہا ہے کہ اے کاش میرے اور خدا کے درمیان پیٹ حائل ہوتا۔ آپ پر اکثر جذب اور مدہوشی طاری رہتی تھی۔ آپ کے پاس صرف ایک چادر تھی۔ آپ اس چادر کو اوڑھ کر باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔ بغداد کے لوگ آپ کو بعض وجہ سے ناپسند کرتے تھے۔ انہیں آپ کے توکل اور نامانوس باتوں سے بڑی الجھن ہوتی تھی۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمتہ اللہ علیہ فقہ حنفی کے امام ہیں۔ وہ ایسے امام ہیں کہ جو ان کا مقلد بن گیا' اسے بھی ایک معزز مقام مل گیا۔ ایسے ہی اگر آپ کے شاگردوں کا ذکر کیا جائے تو وہ بھی بذات خود وقت کے امام مانے گئے۔ آپ کے دو ممتاز شاگرد حضرت امام ابو یوسف اور حضرت امام محمد فقہی مسائل کے حل میں ایک گہری نظر رکھتے تھے۔ زمانہ آج تک ان کا احترام کرتا چلا آرہا ہے' ایک دن خلیفہ ہارون الرشید نے وقت کے امام کے ان دونوں شاگردوں کو اپنے دربار میں بلایا اور قاضی القضاۃ کا منصب پیش کیا۔ یہ منصب ان سے پہلے خلیفہ المنصور نے حضرت امام ابو حنیفہ کی خدمت میں بھی پیش کیا' جسے قبول کرنے سے آپ نے انکار کر دیا تھا۔ اور اس انکار کی پاداش میں قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کی تھیں۔ ان حالات سے دونوں شاگرد واقف تھے۔

حضرت امام محمد نے اپنے استاد حضرت امام ابو حنیفہ کی پیروی میں یہ منصب قبول نہیں کیا' لیکن امام ابو یوسف نے یہ منصب نہ جانے کس مصلحت کے تحت قبول فرمالیا۔ حضرت ابو داؤد طائی کو جب اس بات کا علم ہوا تو ان کے دل میں امام محمد کی عقیدت زیادہ بڑھ گئی۔ مگر حضرت امام ابو یوسف کی قدرومنزلت بالکل نکل گئی۔ ان دونوں کا حضرت داؤد طائی کے ہاں آنا جانا تھا۔ امام ابو یوسف نے محسوس کرلیا کہ حضرت صاحب (داؤد طائی) کے دل میں میرا وہ مقام نہیں ہے' جو کبھی تھا۔ مگر امام محمد کو آپ اسی محبت کے ساتھ چاہتے ہیں۔ آنکھوں میں آنسو بھرلائے۔ اور ایک دن آپ سے عرض کرنے لگے حضرت میں نے محسوس کیا ہے کہ آپ حضرت امام محمد کو مجھ پر ترجیح دیتے ہیں؟

آپ نے فرمایا۔ ہاں! آپ نے درست محسوس کیا۔

اس کی وجہ ؟ مجھ سے کیا قصور سرزد ہوگیا۔ اگر آپ نے مجھ کو ناپسند کرنا شروع کردیا تو مجھے دوسرا کون پسند کرے گا؟

آپ نے فرمایا۔ صرف اس لیے کہ آپ نے اپنے استاد کی تقلید نہیں کی۔

وہ کیسے میرے ماں باپ آپ پر قربان جائیں۔

آپ کو علم ہے کہ قاضی القضاۃ کا عہدہ آپ کے استاد کو بھی پیش کیا گیا تھا مگر جانتے ہو آپ کے استاد نے کیا کہا تھا؟ اس نے اس عہدے کو ٹھکرا دیا تھا اور اس انکار کی سزا بھی اسے ملی تھی۔

ہاں میرے آقا میں جانتا ہوں۔ ابو یوسف نے عرض کیا۔

پھر تم نے سب کچھ جانتے ہوئے وہی عہدہ قبول کرلیا جسے اپ کے استاد نے قبول نہیں کیا تھا۔ پھر بھی تم مجھ سے پوچھتے ہو کہ میرے دل میں آپ کی عزت و توقیر پہلے والی نہیں ہے؟ تم خود ہی بتاؤ میں امام کے ایسے شاگرد کو کس خوشی کے ساتھ پسند

کروں؟ امام محمد مجھے آپ سے زیادہ اس لیے پسند ہیں کہ انہوں نے استاد کی پیروی کرنے کو پسند کیا ہے اور اس منصب کو ٹھکرا دیا ہے' جسے اس کے استاد نے ٹھکرا دیا تھا۔

امام ابو یوسف نے سر جھکا لیا اور دھیمی آواز سے عرض کیا کہ حضور میں یہ منصب اس لیے قبول کیا ہے لوگوں کی خدمت کر سکوں' لوگوں کو انصاف دے سکوں' ظالم کو اس کے ظلم کا بدلہ ملے اور مظلوم کی مدد ہو۔

داؤد طائی نے طنزاً فرمایا۔ ہاں ٹھیک ہے۔ ایک طرف خلیفہ ہارون الرشید لوگوں کی خدمت کرنیکا دعویدار ہے۔ دوسری طرف تم خدمت کرنے کا دم بھر رہے ہو۔ مجھے بھی تو کچھ علم ہو کہ تم دونوں لوگوں کی کون سی خدمت انجام دے رہے ہو؟

اب امام ابو یوسف بالکل خاموش ہو گئے۔ ان کی زبان سے کوئی بات نہیں نکل رہی تھی۔ دیر تک سوچتے رہے کہ آخر اس منصب کے لائق کون ہے؟ کیا یہ اتنی ہی بھاری ذمہ داری ہے کہ کوئی شخص بھی اس کے اہل نہیں ہے؟ اسی سوچ میں ڈوبے ہوئے آپ تشریف لے گئے۔

آپ نے اس منصب کو چھوڑا نہیں مگر اس منصب کے تقاضوں کو پورا کیا۔ نہ بے انصافی کی اور نہ ہی سفارش یا دھمکی کو انصاف کی راہ میں حائل ہونے دیا۔

ایک دن حضرت امام ابو یوسف حضرت داؤد طائی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ خلیفہ ہارون الرشید آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے آپ جب مناسب فرمائیں میں اسے لیکر آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں۔

حضرت داؤد طائی نے صاف انکار کر دیا۔ نہ' اسے میرے پاس ہرگز نہ لانا' وہ میرے پاس کیوں آنا چاہتا ہے؟ میں اس سے ہرگز نہیں ملنا چاہتا' ہرگز نہیں ملوں گا اس سے۔

امام ابو یوسف نے عرض کیا۔ حضرت جی! میں نے امیرالمومنین سے وعدہ کر لیا ہے کہ میں آپ سے ان کی ملاقات ضرور کراؤں گا۔ اگر آپ اس سے نہیں ملیں گے تو مجھ سے ایفائے عہد نہ ہو سکے گا۔ میں آپ کی بارگاہ میں ہاتھ باندھ کر التجا کرتا ہوں کہ مجھ سے یہ وعدہ خلافی نہ ہونے دیں۔

آپ نے جواب دیا۔ مجھ سے ملے بغیر تو نے ہارون الرشید سے وعدہ کیوں کر لیا؟

امام ابو یوسف نے کہا۔ اس لیے کہ میرا گمان ہے کہ آپ ایک خوش اخلاق انسان ہیں' میری بات مان لیں گے اور میرا بھرم رکھیں گے۔

حضرت داؤد طائی نے فرمایا بیٹا! تو نے بڑی سخت غلطی کی ہے۔ میں دنیا دار ظالموں سے سخت نفرت کرتا ہوں۔ اور ہارون الرشید بھی ایسے ہی ظالموں میں سے ایک ہے۔ اس لیے میں اس سے نہیں ملنا چاہتا۔

امام ابو یوسف مایوس ہو کر چلے گئے۔

ہارون الرشید کو جب پتہ چلا کہ حضرت داؤد طائی نے مجھ سے ملنے سے انکار کر دیا ہے تو وہ بڑا سٹ پٹایا۔ بولا اب کیا ہوگا؟ میں تو آپ سے ہر قیمت پر ملنا چاہتا ہوں۔

ہارون الرشید کے مشیروں نے عرض کیا اے امیرالمومنین! آپ اپنی ماں خیزراں کو حضرت صاحب کے پاس بھیجیں وہ یقیناً خوشامد کرکے آپ کو رضامند کر لیں گی۔

خیزران کوئی معمولی عورت نہیں تھی' وہ آئی اور حضرت داؤد طائی سے محو گفتگو ہوئی۔

خیزراں نے کہا۔ اگر خلیفہ وقت' وقت کے ولی اللہ سے ملنا چاہے تو وقت کے ولی اللہ کو خوش ہونا چاہیے۔ خلیفہ ہارون الرشید کسی ذاتی منفعت کی غرض سے نہیں آرہا ہے' لوگوں کی بھلائی کے لیے آپ سے کچھ مشورہ کرنا چاہتا ہے۔ آپ کے مشورہ کے بغیر اگر وہ کوئی غلط کام کر جائے تو جس سے نہ صرف اس کی اپنی عاقبت برباد ہو' بلکہ

لوگوں کے حقوق کا اتلاف بھی ہو سکتا ہے وہ آپ سے کچھ نصیحتیں حاصل کرنا چاہتا ہے۔

غرضیکہ خیزراں نے آپ کو ہارون الرشید سے ملاقات پر آمادہ کرلیا۔

حضرت داؤد طائی نے بطور شکائت کہا۔ خیزراں! ہارون الرشید تیرا بیٹا ہے کیا تو آخرت کی طرف سے فکرمند نہیں ہے؟

آپ نے فرمایا۔ اچھا اپنے بیٹے کے پاس جاؤ اور اسے اس شرط پر میرے پاس بھیج دو کہ وہ مجھے کچھ دینے کی کوشش ہرگز نہ کرے۔ کیونکہ میں بادشاہوں کو ظالم اور جابر سمجھتا ہوں اور اسی لیے میں بادشاہ سے کچھ لینا بالکل پسند نہیں کرتا۔

خیزران بڑی خوش تھی، کہ اس کی بات مان لی گئی ہے۔ وہ خوشی کے ساتھ گھر گئی اور ہارون الرشید کو اپنی کامیابی کی خوش خبری سنائی۔ ہارون بھی خوش ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہارون الرشید خیزراں اور امام ابو یوسف حضرت داؤد طائی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ہارون الرشید بڑے احترام کے ساتھ پیش آیا۔ خلافت کے جاہ و وقار وہ قطعاً ساتھ نہیں لایا تھا۔ اس کی گردن میں تکبر اور غرور کا کوئی سر نہیں لگا ہوا تھا، وہ سراپا نیاز نہ بنا ہوا تھا، انکساری اور عاجزی کا دامن تھامے ہوئے آیا۔

حضرت داؤد طائی نے فرمایا۔ اے ہارون تیرے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ پھر وہ کیا چیز تھی جو تجھے میرے پاس لائی؟

ہارون الرشید نے جواب دیا۔ آپ کی بے نیازی، آپ کی استغناء واللہ میں جو چاہوں خرید لوں۔ جسے چاہوں ملازم رکھ لوں۔ لیکن آپ کے سامنے میری کوئی حیثیت ہی نہیں اور اس وقت مجھے اپنی کمزوری اور بے ضاعتی کا بہت زیادہ احساس ہوا جب میں نے آپ کی خدمت میں حضرت امام ابو یوسف کو بھیجا اور آپ نے انہیں یہ کہہ کر واپس کر دیا، کہ آپ مجھ سے نہیں مل سکتے؟ آپ نے جواب دیا۔ ہارون میں

بادشاہوں اور حکمرانوں کو جابر اور ظالم سمجھتا ہوں، تم لوگ عوام کی امانت کو اپنے آپ پر خرچ کرتے ہو، اپنی خواہشات میں عدل و انصاف سے کام نہیں لیتے ہو۔ چنانچہ روز قیامت جتنا بڑا محاسبہ تم لوگوں سے ہوگا کسی اور کا عشر عشیر بھی نہیں ہوگا۔

ہارون الرشید حضرت داؤد طائی کی باتیں بڑی توجہ سے سنتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

حضرت مجھے کچھ نصیحت کیجئے۔

آپ نے فرمایا۔ میں تجھے نصیحت نہیں، تجھ سے خواہش کروں گا۔

ہارون نے پوچھا وہ کیا؟

اب آئندہ تو مجھ یا میرے جیسے کسی اور فقیر کو ملاقات کی زحمت سے محفوظ رکھے گا۔

ہارون الرشید کہنے لگا۔ میرے دل میں یہ خواہش تھی کہ میں آپ کی خدمت میں کچھ پیش کروں۔

آپ نے فرمایا۔ خواہش کو مار، نفس کشی کر، کیونکہ یہ وہ موذی ہیں، جو انسان کو زندگی بھر سانپ کی طرح ڈستے رہتے ہیں۔

ہارون کے ہاتھ میں ایک دینار تھا، اسے آپ کی طرف بڑھاتا ہوا بولا۔ آپ زیادہ نہیں تو یہ ایک دینار ہی قبول فرمالیں۔

خیزراں پاس ہی کھڑی تھی، حضرت داؤد طائی نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ خیزراں! یہ سب کچھ کیا ہے؟ میں نے آپ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں بادشاہ سے ملاقات اس شرط پر کروں گا کہ بادشاہ مجھے کچھ نہ دے۔ اور نہ کچھ دینے پر مجبور کرے اور نہ ہی میں کچھ قبول کروں گا۔

خیزراں مسکرا دی، کہنے لگی، بے شک ملاقات کا وعدہ کرتے ہوئے آپ نے یہ شرط رکھی تھی۔ مگر میرے بیٹے کی اگر معمولی سی خواہش پوری کر دیتے ہیں تو آپ کی

بڑی مہربانی ہوگی۔

آپ غصے میں آگئے۔ فرمایا خیزراں میرے پاس اپنے خرچ کے لیے جائز رقم موجود ہے' اس لئے بادشاہ سے کچھ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہارون نے پھر عرض کیا آپ یہ دینار رکھ لیں۔ کیونکہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے جب آپ کی اپنی رقم ختم ہو جائے گی' اس وقت یہ میرا دینار آپ کے کام آئے گا۔

آپ نے جواب دیا۔ اول تو یہ کہ میرے پاس جتنی رقم موجود ہے وہ زندگی بھر کیلئے کافی ہے لیکن اگر یہ رقم ناکافی ہوگی' تو میں خدا سے دعا کروں گا کہ میری اس دن موت واقع ہوجائے۔ ادھر امام ابو یوسف خاموش کھڑے تھے وہ ہارون کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا آپ داؤد کو مجبور نہ کیجئے۔ انہوں نے اگر ایک بار کچھ لینے سے منع کر دیا ہے تو یہ ہمارے لاکھ اصرار اور خوشامد کے باوجود بھی نہ لیں گے

مجبوراً ہارون الرشید کو یوں ہی واپس آجانا پڑا۔

حوالہ کے لیے

اللہ والے

از ڈاکٹر ظہورالحسن شارب

ماھنامہ نوراسلام' شرقپور شریف ستمبر ۱۹۹۰ء

فنِ تصوف کا عظیم شاہکار

چشمۂ فیضِ شیرِ ربانی

حالات و تعلیمات

تالیف:

محمد یسین قصوری نقشبندی

ناشر:

ادارہ علم و ادب، والٹن، لاہور

ملنے کا پتہ:

ضیاء القرآن پبلیکیشنز گنج بخش روڈ، لاہور

بذریعہ ڈاک منگوانے کا پتہ:

مکتبہ فاروقیہ رضویہ

پنج پیر گھوڑے شاہ روڈ

باغبانپورہ لاہور نمبر ۱۰ ۳۳۲۷

ہمارے ادارہ کی دیگر دینی مطبوعات

۱۔ چشمۂ فیض شیر ربانی
(از محمد یٰسین قصوری نقشبندی)
(حالات و تعلیمات
حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ)

۲۔ ضیاء الفقراء
مرتب : محمد یٰسین قصوری نقشبندی
(آستانۂ عالیہ شرقپور شریف سے متعلق اسرار بردرفقراء کا انتخاب)

۳۔ تذکرہ خلفاء شیر ربانی
زیر ترتیب : محمد یٰسین قصوری نقشبندی
(حالات و تعلیمات
خلفاء حضرت میاں شیر محمد شرقپوری رحمۃ اللہ علیہ)

۴۔ اسرار بردرفقراء
کاوش ترتیب
(علامہ محمد انور قمر شرقپوری محمد یٰسین قصوری
(اولیاء کبار کے فیوض و برکات کے حسین انداز میں انقلابی باتیں)

۵۔ اسرار بردر اولیاء
کاوش مرتب
علامہ محمد انور قمر شرقپوری محمد یٰسین قصوری نقشبندی
اولیاء اللہ کے فیوض و برکات پر مشتمل پیاری پیاری اور انقلابی باتیں

۶۔ والدین مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم
حالات و ایمان والدین مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم
از محمد یٰسین قصوری نقشبندی

۷۔ مقام مصطفیٰ صلے اللہ علیہ وسلم
از علامہ ارشد القادری
حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کے معجزات، فضائل، خصائص، کمالات اور مقامات پر مشتمل بہترین کتاب جو پاکستان میں پہلی بار شائع ہوئی۔

۸۔ بے مثل بشر صلے اللہ علیہ وسلم
(حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کے بے مثل ہونے کی احادیث) موطا امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کی روشنی میں تحقیق۔ از محمد یٰسین قصوری نقشبندی

۹۔ طب روحانی
روح کی بیماریوں اور ان کے علاج کے متعلق جامع اور نہایت مفید رسالہ
از محمد زاہد لطیف

۱۰۔ فضائل و مسائل قربانی
تالیف: محمد یاسین قصوری نقشبندی

۱۱۔ ریاضی اور مقام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم
کاوش: علامہ محمد انور قمر شرقپوری

ناشر:
ادارہ علم و ادب، والٹن، لاہور

بذریعہ ڈاک منگوانے کا پتہ:

مکتبہ فاروقیہ رضویہ
پنج پیر گھوڑے شاہ روڈ
باغبانپورہ لاہور نمبر ۱۰-۳۳۲